اسلام اور مشرق و مغرب کی

تہذیبی کشمکش

علی عزت بیگووچ
صدر جمہوریہ بوسنیا

مترجم: محمد ایوب منیر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب ....

- عام قاری کے مطالعے کے لیے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد آپ لوڈ (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کی خاطر ڈاؤن لوڈ، پرنٹ، فوٹو کاپی اور الیکٹرانک ذرائع سے محض مندرجات نشر واشاعت کی مکمل اجازت ہے۔

☆ تنبیہ ☆

- کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی ممانعت ہے۔
- ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

﴿اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں﴾

- نشر واشاعت، کتب کی خرید وفروخت اور کتب کے استعمال سے متعلقہ کسی بھی قسم کی معلومات کے لیے رابطہ فرمائیں۔

kitabosunnat@gmail.com
www.KitaboSunnat.com

مصنف

علی عزت بیگووچ

صدر جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگووینا

مترجم

محمد ایوب منیر

ادارۂ معارف اسلامی منصورہ۔ لاہور پاکستان

پنجاب کے جملہ سکولوں کالجوں اور پبلک کتب خانوں کے لیے منظور شدہ بمطابق
حکومت پنجاب، سرکلر نمبر S.O(SA-iv)4-27/95 مورخہ 24-11-96

نام کتاب : Islam Between East and West
اردو میں : اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش
مصنف : علی عزت بیگووچ۔ صدر جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگووینا
مترجم : پروفیسر محمد ایوب منیر
باہتمام : ادارہ معارف اسلامی، منصورہ، لاہور
مطبع : میٹرو پرنٹرز، لاہور
باراول : مارچ ۱۹۹۴ء (۱۰۰۰)
باردوم : جون ۱۹۹۷ء (۱۰۰۰)
بارسوم : مئی ۲۰۰۴ء (۱۰۰۰)
قیمت : ۲۱۰ روپے

تقسیم کنندہ:

مکتبہ معارف اسلامی

منصورہ، ملتان روڈ، لاہور-54570

فون: 5432419 - 5432476 - 5419520-4

گرچہ از مشرق بر آید آفتاب
با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوز دروں
تا ز قید شرق و غرب آید بروں
بر دمد از مشرق خود جلوہ مست
تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق خود جلوہ مست
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است

علامہ اقبالؒ

فہرست مضامین

باب سوم

باب دوم — تہذیب اور تمدن — 92

سخنے چند

زیر نظر کتاب کے مصنف علی عزت بیگووچ اب کسی تعارف کے محتاج نہیں رہے۔ وہ گو نصف صدی سے میدان جہاد میں اترے ہوئے ہیں مگر دنیا کی نظر میں وہ اس وقت آئے ہیں جب سابقہ یوگوسلاویہ شکست وریخت سے دوچار ہوگیا اور اس کے اندر پائی جانے والی جمہوریتوں نے اپنی آزادی اور استقلال کا اعلان کردیا۔ ان میں جمہوریہ بوسنیا و ہرزیگووینا بھی ہے جس کے صدر علی عزت بیگووچ ہیں اور جو آج ایک طرف اسلام کے علمبرداروں اور دوسری طرف جمہوریت و انسانی حقوق کے دعویداروں کے لئے عرصہ آزمائش میں تبدیل ہو چکی ہے۔ علی عزت بیگووچ تین پہلوؤں سے ہمارے سامنے آتے ہیں :

* وہ نصف صدی سے "سابقہ یوگوسلاویہ" کے اندر کمیونسٹ اقتدار کے دور میں اسلام کو بچانے اور مسلمانوں کے تشخص کو بحال رکھنے کے لئے مصروف جہاد رہے ہیں۔ اس غرض کے لئے انہوں نے اپنے چند ساتھیوں سے مل کر جن میں علامہ قاسم دوبراچا خاص طور پر قابل ذکر ہیں نوجوانوں کی تنظیم قائم کی۔ اور ان کی اسلامی تربیت شروع کردی اور ساتھ ہی ان کے اندر آزادی کی روح پھونکی۔ کمیونسٹ اقتدار کے تحت یہ کام کرنا آسان نہ تھا۔ چنانچہ موصوف کو دوبار بغاوت کے الزام میں حوالہ زنداں کیا گیا۔ اور موصوف طویل عرصہ تک آہنی سلاخوں کے اندر بند رہے۔ یہ آزمائش ان کے عزم کو کمزور کرنے کے بجائے مزید مستحکم کرنے کا موجب بنی۔ اور انہوں نے کسی

بھی موقع پر ساتھیوں کو مایوسی کا شکار نہیں ہونے دیا۔

* عملی سرگرمیوں کے ساتھ ان کا علمی و فکری پہلو بھی بڑا روشن نظر آتا ہے۔ یورپ کی تہذیبی یلغار 'ادلتے بدلتے نظریات اور مادہ پرستانہ نظام کے اندر رہتے ہوئے انہوں نے اسلامی فکر کو پوری قوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی تحریریں یورپ کو خطاب کرتی ہیں ۔ اور یورپ کی الجھی ہوئی ذہنیت کا علاج کرتی ہیں۔ موصوف کئی موضوعات پر پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ اور پھر اسلام کے مختلف گوشوں پر انہوں نے بڑی خود اعتمادی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ اب تک ان کی متعدد کتابیں منصۂ ظہور میں آچکی ہیں۔ ان میں سے دو کتابوں نے خصوصی شہرت حاصل کی ہے۔ ایک "اسلام ان دی ایسٹ اینڈ ویسٹ" (اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش) جس کا ہم اردو ترجمہ نذر قارئین کر رہے ہیں۔ اور دوسری اسلامی منشور 'اسے بھی ہم انشاء اللہ شائع کریں گے۔

* ان کی شخصیت کا تیسرا پہلو ان کے موجودہ منصب میں آفتاب نصف النہار کی طرح چمکتا نظر آتا ہے۔ موصوف اس وقت ایک جمہوریہ کے صدر ہیں جس پر تین پڑوسی جمہوریتوں نے مل کر حملہ کر رکھا ہے : جمہوریہ سربیا (آرتھوڈکس) جمہوریہ ماؤنٹی نیگرو (آرتھوڈکس) اور جمہوریہ کروشیا (کیتھولک)۔ یہ تو براہ راست حملہ آور ہیں جبکہ یورپ کے تمام ممالک صلیبی تعصب میں اندھے ہو کر اپنی ڈپلومیسی اور درپردہ سازشوں کے ذریعے بوسنیا کو تختہ زمین سے محو کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔مزید برآں یہ کہ اقوام متحدہ نے بوسنیا کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ تاکہ اسے کہیں باہر سے اسلحہ نہ پہنچ جائے۔ اس بے چارگی کے عالم میں علی عزت بیگووچ اپنے ملک کی صدارت کر رہا ہے۔ اس مرد قلندر نے اپنی حکمت و جرأت کا سکہ یورپ پر بٹھادیا ہے۔ اس کے لاکھوں افراد شہید اور بے گھر ہو چکے ہیں۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں سے کیمپ بھرے ہوئے ہیں۔ ضروریات زندگی دستیاب نہیں ہیں۔ مگر علی عزت بیگووچ اپنے مومن سپاہیوں اور خود اپنی قوت ایمانی کے بل بوتے پر ان حالات کا ثابت قدمی سے سامنا کر رہا ہے۔ پھر جس طرح اسے ورغلانے اور اس سے من مانا فیصلہ اگلوانے کی کوششیں کی گئی ہیں اور بین

الاقوامی ثالثی کے گورکھ دھندوں میں اسے پھنسانے کے لئے زور ڈالا گیا ہے' کوئی اور لیڈر ہوتا (اور ایسے لیڈروں کی دنیا میں کمی نہیں ہے) تو ہتھیار ڈال چکا ہوتا اور بعض فلسطینی لیڈروں کی طرح قوم و وطن کو بیچ کر آرام سے کہیں جا بیٹھتا۔ مگر اس شخص نے اسلام اور مسلمانوں کی آبرو کی حفاظت کی ہے۔

زیر نظر کتاب کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ضرور پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ اس شخص کی تصنیف ہے جو کمیونزم کی فضا میں رہتا رہا ہے۔ جو یورپ کی تہذیبی چکاچوند کے عین قعر میں پلا بڑھا ہے' اس لئے ہو سکتا ہے کہ اپنی تحریروں میں کسی جگہ وہ اسلام کا پورا معیار قائم نہ رکھ سکا ہو۔ مگر یہ واضح ہے کہ اس کے دل میں اسلام اور اسلامی نظام کا درد ہے اور وہ اسی راستے کا مسافر ہے جس پر عہد حاضر کے مصلحین امت چلے ہیں یا چل رہے ہیں۔

ہم عزت بیگووچ کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اردو میں اس کی اشاعت کے ہمیں حقوق دے دیئے ہیں - نیز ایّوب منیر کے بھی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے فرمائش قبول کرتے ہوئے اس کتاب کو انگریزی سے اردو میں منتقل کر دیا ہے اللہ تعالیٰ ان حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

۸ - فروری ۱۹۹۴ء

خاکسار

خلیل احمد حامدی

ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی منصورہ لاہور

عرض ناشر

دین حق کے خلاف گزشتہ کئی صدیوں سے باطل قوتیں طرح طرح کی سازشوں میں مصروف ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام کا دفاع کرنے والے حضرات اور رجال کار بھی ہر دور میں موجود رہے ہیں' امام ربانی' ابن قیمؒ سے لے کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تک کئی مشاہیر اسلام نے باطل نظریات کا نہ صرف بھرپور توڑ کیا بلکہ غیر اسلامی افکار و نظریات پر بھرپور تنقید کی اور عقلی دلائل سے ثابت کیا کہ وہ ناقص' بودے' کھوکھلے اور انسانیت کے لئے زہر قاتل ہیں۔ مزید برآں انہوں نے اسلام کی حقانیت کو دلائل و براہین سے روز روشن کی طرح واضح کر دیا۔ فجزاہم اللہ و احسن الجزاء

بیسویں صدی کے آخر میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر سیموئیل پی ہنٹنگٹن نے تہذیبی تصادم' اور پروفیسر فوکویاما نے' خاتمہ تاریخ کا نظریہ پیش کر کے اسلام کی حقانیت کو وقتی' عارضی اور فانی قرار دیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آنے والی صدیوں میں مشرق اور مغرب کی تہذیبیں ٹکرائیں گی' گویا کہ اس طرح مادہ پرستی کا بول بالا ہو گا۔ مذکورہ دونوں نظریات پر علمی حلقوں میں شدید بحث ہوئی کیونکہ پچھلے قریباً ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ یہ ثابت کر چکی ہے کہ مسلمان اپنے اعمال و کردار میں کمزور اور کوتاہ تو ہو سکتے ہیں لیکن ایمان باللہ' حب رسول ﷺ اور ذاتی و خاندانی طہارت کا تصور ان سے کبھی بھی جدا نہیں ہوا۔ مغرب کی تہذیب نے مسلم خاندان' مسلم روایات' مسلم معاشرت اور مسلم ثقافت کو نشانہ بنایا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں احیائے اسلام کی تحریکیں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جڑ پکڑ رہی ہیں اور نوجوان بہت بڑی تعداد میں اس کا دست و بازو بن رہے ہیں

بقول علامہ اقبال

شب گریزاں ہو گی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

اہل مغرب جس انسان دوستی' انسانی حقوق' اور امن و انصاف کی بات کرتے ہیں اس کا ایک عملی مظاہرہ تو وہ یورپ کی قلب کے اندر ابھرنے والی بوسنیا' ہرزی گوینا کی مسلم اکثریتی ریاست کے ساتھ کر چکے ہیں جس کو اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لئے دو لاکھ سے زائد جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا' نصف آبادی ہجرت پر مجبور کر دی گئی اور سرب درندوں نے مسلمان مردوں' عورتوں اور بچوں پر جو بے تحاشا اور ناقابل بیان ظلم ڈھائے ان نے ہلاکو اور چنگیز خان کے مظالم کو مات کر دیا۔ متعصب عیسائی سربوں کے سیاسی غلبے اور مغربی تہذیب کے فکری حملے کی اس یلغار کو روکنے میں بوسنیا ہرزی گوینا کے مفکر صدر' علی عزت بیگوچ نے انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہوں نے اپنے طویل اور شاندار تعلیمی' تصنیفی' قانونی اور سیاسی تجربے کو بروئے کار لا کر اپنی قوم کو نہ صرف مضبوط و متحد رکھا بلکہ بوسنیا ہرزی گوویناکی نوزائیدہ اسلامی ریاست کو بھی بچانے مین کامیاب ہو گئے۔ تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

علی عزت بیگووچ نہ صرف ایک کامیاب سیاسی رہنما اور قلب یورپ کے اندر ابھرنے والی ایک نوزائیدہ مسلم ریاست کے منتخب سربراہ ہیں بلکہ اسلام کے ایک بہت بڑے دانشور' قانون دان' سکالر اور مبلغ بھی ہیں' کئی سال قبل "اسلام میان مشرق و مغرب" (Islam Between East and West) کے نام سے انہوں نے ایک معرکہ آراء اور اہم کتاب تحریر کی تھی۔ بہترین دلائل' تفہیم کے انداز اور منطقی (rational) لیکن عام فہم اسلوب کے سبب اس کو مغربی دنیا میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کتاب میں تہذیب و تمدن' اسلامی افکار' سائنس' عمرانیات' مسخ مذاہب کی ناکامی اور دور جدید کے ناقص تصورات کا تفصیلی جائزہ موجود ہے اور ساتھ ساتھ وہ تمام حقائق اکٹھے کر دیے گئے ہیں جو اسلام کی سچائی کے ثبوت کے طور پر پیش کیے جا

سکتے ہیں۔ ادارہ معارف اسلامی کے سابق ڈائریکٹر مولانا خلیل احمد الحامدی مرحوم و مغفور نے نوجوان قلمکار پروفیسر محمد ایوب منیر کو اس کے اردو ترجمے کی ذمہ داری سونپی اور ان کی محنت شاقہ کے بعد جب یہ کتاب "اسلام اور مشرق و مغرب کی تہذیبی کشمکش" کے نام سے ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آئی تو نہ صرف علماء' وکلا' جج صاحبان' اساتذہ کرام اور دوسرے پڑھے لکھے حلقوں میں اس کا زبردست خیر مقدم کیا گیا بلکہ عوام الناس میں بھی اس کی بے انتہا پذیرائی ہوئی۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ چند ماہ ہی میں اسکا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا' جب ادارہ معارف اسلامی کے انتظامات میرے سپرد کیے گئے تو میری خواہش تھی کہ اولین فرصت میں اس کی طبع ثانی کا بندوبست کیا جائے۔ محدود وسائل' کاغذ کی آسمان کو چھوتی ہوئی قیمتیں اور طباعت و اشاعت کے گراں بار اخراجات ہمیں طبع ثانی سے روکتے رہے۔ اس دوران مختلف مکتبوں' اہل علم' قانون دان حضرات اور یونیورسٹی اساتذہ اس کتاب کا مسلسل مطالبہ کرتے رہے الحمد للہ اب ہم اسی کتاب کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن' نئے دیدہ زیب ٹائیٹل اور معیاری طباعت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ اہل علم کی جانب سے چند ایک تجاویز متن اور طباعت کے حوالے سے موصول ہوئی تھیں۔ اس حوالے سے بھی ضروری اصلاح کر لی گئی ہے۔ اب یہ کتاب ظاہری و باطنی محاسن سے مزین ہے اور اردو دان طبقہ کی خدمت میں بطور خصوصی تحفہ پیش کی جا رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کتاب کے فاضل مصنف' نوجوان اور قابل مترجم' پبلشر اور مختلف مراحل میں مدد فراہم کرنے والے تمام احباب کو اجر جزیل سے نوازے۔ آمین!

محمد اسلم سلیمی

ڈائریکٹر ادارہ معارف اسلامی' منصورہ' لاہور

۲۸ محرم الحرام ۱۴۱۸ھ' جون ۱۹۹۷ء

سقوط بغداد ۱۲۵۳ء مسلمانوں کے زوال اور مغرب کی نشاۃ الثانیہ کے آغاز کا سنگ میل ہے۔ مغرب نشاۃ الثانیہ کے عمل سے دو صد سال تک (۱۳۵۰ء ـ ۱۵۵۰) گزرتا رہا۔ مسلمانوں کا زوال اور مغرب کا عروج دو متوازی خطوط کی طرح آگے بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ جنگ عظیم دوم تک ایک دو مسلم ممالک کے سوا تمام مسلم ریاستیں برطانیہ' فرانس' جرمنی' اٹلی' ہالینڈ اور دیگر یورپی ممالک کے زیر تسلط آچکی تھیں۔ لیکن اس جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی استعماریوں کی بالادستی ختم ہوئی اور مسلمانوں کے سنبھالا لینے کا عمل شروع ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں دنیا کی سب سے بڑی مسلم ریاست پاکستان وجود میں آئی اور مسلم ریاستوں کی غلامی کی زنجیروں کے ٹوٹنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب تک چھپن ممالک اقوام متحدہ کی فہرست میں اپنے آپ کو مسلم ممالک کے طور پر رجسٹرڈ کروا کر رکنیت حاصل کرچکے ہیں۔ دنیا کے اندر مسلمانوں کی آبادی ایک ارب بیس کروڑ ہے۔ اسی کروڑ مسلمان آزاد ممالک کے باشندے ہیں جبکہ چالیس کروڑ سو ممالک کے اندر بطور اقلیت زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سیاسی غلامی کا طوق تو کٹ چکا ہے' لیکن فکری غلامی کے پانچ سو پچاس سال کے اثرات مسلمانوں کے فکر و عمل' اجتہاد' تحقیق اور قیادت کو مسموم اور فالج زدہ کیے ہوئے ہیں۔ اور یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ فکری آزادی کے بغیر سیاسی آزادی ناکمل رہتی ہے۔ مسلمان اس سے غافل نہ تھے۔ چنانچہ عثمان دان فودیو' سعید نورسی اور شاہ ولی اللہ نے انیسویں صدی اور سید حسن البناءؒ علامہ اقبالؒ' سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ' سید قطب ؒ نجم الدین اربکان اور قاضی حسین احمد نے بیسویں صدی میں نظام باطل پر پے درپے ضربیں لگائیں۔ باطل نظام کفر کو للکارا' حکمران مغرب کے خلاف بغاوت کے علم بلند کروائے اور خواب خرگوش میں مست امت مسلمہ کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر میدان کارزار کی طرف دھکیلا۔ مسلمانوں کو باور کرایا کہ مغرب کی کافرانہ تہذیب اور جاہلانہ ثقافت ان کی ترقی کا زینہ نہیں' رسوائی کا داغ اور غلاظت کا ڈھیر ہے۔ جب تک اس داغ کو مٹایا نہ جائے گا' نشاۃ الثانیۂ اسلام خواب ہی رہے گی۔ خصوصاً سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے امت مسلمہ کو بتایا کہ آج کے دور میں اصل چیلنج علم کا چیلنج ہے۔ اگر مسلمان علمی سرفرازی اور ترقی حاصل نہ کر سکے تو سیاسی بالادستی کا خواب' خواب پریشاں ہی رہے گا۔ سید مودودی کی پکار پر دنیا بھر میں احیائے اسلام کی تحریکیں مزید نشو و نما پانے لگیں' یوگوسلادیہ کے علی جاہ علی عزت بیگووچ انہی شاہین صفت دیوانوں' مستانوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنے شب و روز' اپنی صلاحیت اور اپنی جدوجہد کو احیائے اسلام کی شمع پر نثار کر دیا ہے۔

یوگوسلادیہ میں بسنے والی سلاف (Slav) قوم پچھلے پانچ سو سال سے اسلام کی پیروکار ہے۔ ۱۹۹۱ء میں یوگوسلادیہ کا شیرازہ منتشر ہونے کے بعد مختلف صوبوں نے آزاد مملکتوں کے قیام کا اعلان کردیا اور اپریل ۱۹۹۲ء میں مسلم اکثریتی صوبہ بوسنیا ہرزیگووینا کی اسمبلی نے آزاد مسلم مملکت کے قیام کا اعلان کیا' لیکن ان کے ہمسایہ سربیاومونٹی نیگرو کے آرتھوڈوکس عیسائیوں نے "عظیم تر سرب مادر وطن" کے قیام کے لیے بوسنیا ہرزیگووینا

پر حملہ کر دیا۔ سرب نسل کے آرتھوڈوکس عیسائیوں نے ظلم 'بربریت' بہیمیت اور درندگی کے جو مظاہرے بوسنیا کی آزادی کو ختم کرنے کے لئے کیے ہیں' مہذب دنیا کا ہر فرد' بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس پر شرمندہ و نوحہ کناں رہیں گی۔ تادم تحریر دو لاکھ انسان قتل کیے جاچکے ہیں۔ ایک لاکھ تعذیب' ایذا خانوں اور تفتیشی مراکز میں ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ پچاس ہزار عورتوں کی آبروریزی کی جاچکی ہے اور پندرہ لاکھ ہجرت پر مجبور کر دیئے گئے ہیں۔ بوسنیا کے نوے فیصد علاقے پر سربیا کا قبضہ ہے۔ اقوام متحدہ' یورپی برادری اور شمالی اوقیانوس کی تنظیم کے رکن ممالک کے علاوہ امریکہ' روس اور حتیٰ کہ مسلم ممالک بھی سربیا کو جارحیت سے روکنے کے لئے کوئی اقدام نہ کرسکے۔ حال ہی میں بوسنیا کے صدر نے دنیا بھر سے مایوس ہونے کے بعد بین الاقوامی مصالحت کنندگان سائرس وانس اور لارڈ اوون کے پیش کردہ فارمولے پر دستخط کر دیئے ہیں جس کے مطابق بوسنیا کو دس نیم خود مختار منطقوں میں تقسیم کرنے کے بعد چار منطقے مسلمانوں کے حوالے کیے جارہے ہیں اور دارالحکومت سرائیوو کو کھلا شہر قرار دیا جارہا ہے' لیکن ابھی تک جنگ بندی نہیں ہوسکی ہے۔

علمی قیادت' سیاسی فراست' دینی سیادت کے حامل جرأت' عزیمت' استقامت اور حوصلے کے پہاڑ علی عزت بیگوویچ بوسنیا ہرزیگووینا کے پہلے صدر ہیں۔ وہ سرائیوو شہر کے رہنے والے ہیں۔ ان کی بلند و بالا شخصیت کا اس بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کئی مضامین میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ انہیں ملک کا راست فکر اور باعمل دانشور تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۸۰ء میں سرائیوو کی عدالت نے جن بارہ اہل فکر ادیبوں' دانشوروں اور سیاستدانوں کو سخت سزائیں سنا کر زندان خانے میں بھجوا دیا تھا عزت ان میں شامل تھے۔ وہ ادیب' صحافی' دانشور' نقاد اور احیائے اسلام کے علمبردار ہیں' بلکہ مغربی نظام سے کھلی ٹکر لینے والے مجاہد ہیں۔ انہوں نے اس نظام کے خلاف "بغاوت" کا اعلان اس وقت کیا جبکہ یوگوسلاویہ کے ٹوٹنے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہ

سکتا تھا۔

علی عزت کی بہت سی کتابیں ہیں اور دنیا بھر میں ان کے تراجم ہو رہے ہیں۔

"Islam -- Between East and West" سب سے پہلے امریکن ٹرسٹ پبلی کیشنز نے امریکہ سے انگریزی میں شائع کی پھر اس کا سربو کروشیائی زبان میں ترجمہ ہوا' اور اس کے بعد دیگر زبانوں میں بھی اس کے تراجم شائع ہوئے۔ بلاشبہ اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب ہے جس میں حیاتیات' فزکس' عمرانیات' سیاسیات' تاریخ مذاہب' قانون' تمدن اور معاشیات کے مستند ترین حوالوں سے مغربی تہذیب' مغربی افکار' مغربی طرز زندگی' مغربی غلبہ و استیلاء اور مغربی فکر کی دھجیاں بکھیر دی گئی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام کے جامع کردار کو ثابت کیا گیا ہے' متفرق موضوعات پر جس شاندار انداز سے بحثیں کی گئی ہیں اپنی مثال آپ ہیں۔ مؤلف نے کوشش کی ہے کہ ایک سطر بھی بغیر حوالے کے نہ لکھی جائے اور کوئی بات بھی ثبوت کے بغیر نہ ہو۔ انہوں نے انگریزی' سربو کروشیائی' جرمن' ہسپانوی' عربی اور فرانسیسی کتابوں کے بکثرت حوالے نقل کیے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ مغربی ثقافت اپنی موت کے اسباب خود فراہم کر رہی ہے۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ ہر زمانے کی طرح اس زمانے میں بھی صرف اور صرف اسلام --- نظری اور خیالی نہیں --- حقیقی' علمی' اور سیاسی طور پر نافذالعمل اسلام ہی امن سلامتی اور سکون فراہم کر سکتا ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے قبل چند چیزوں کا سمجھ لینا مفید رہے گا۔ علی عزت استدلالی (Rational) انداز میں اپیل کرتے ہیں۔ اہل مشرق خصوصاً اردو دان طبقہ اس انداز سے زیادہ مانوس نہیں ہے۔ دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ علی عزت نے اپنی اس کتاب میں تہذیب انسانی سے عقیدہ اور نظریہ مراد لیا ہے اور ثقافت سے وہ شہری زندگی جس میں عمارتیں اور طرز تعمیر وغیرہ شامل ہیں' مراد لیتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ ان کے تبحر علمی' فن استدراک اور سائنسی استدلال کے باوجود کئی ایسی باتیں آگئی ہیں جو

اختلافی ہیں' اگرچہ یہ چند ہیں تاہم ہم نے اپنے محدود علم کی حد تک ان سے اختلاف کو حاشیے میں ظاہر کردیا ہے۔

داعی انقلاب اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کے قریبی دوست اور ساتھی' جماعت اسلامی پاکستان کے مرکزی راہنما اور معروف دانشور اور ادیب مولانا الشیخ خلیل احمد الحامدی کی شفقت اور محبت مجھے زمانہ طالبعلمی سے حاصل رہی ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے اردو ترجمے کی طرف میری توجہ دلائی۔ مجھے اپنی محدود صلاحیتوں کا علم تھا' لیکن مولانا کے بار بار کے اصرار اور حوصلہ افزائی نے مجھے کمر ہمت کس لینے پر مجبور کردیا۔ چودہ ماہ کی محنت شاقہ کے بعد یہ کتاب ترجمہ ہوئی۔ محترم خلیل احمد الحامدی صاحب نے قدم قدم پر میری راہنمائی کی۔ ترجمے کے بارے میں مفید مشورے دیئے اور کئی اہم مقامات کو سمجھنے اور اردو میں منتقل کرنے میں مدد فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی امداد و اعانت کے بغیر بات بن ہی نہ سکتی تھی۔ میں ان کا شکرگزار بھی ہوں اور دعاگو بھی۔ سید نظر زیدی صاحب نے اس مسودے کے مشکل مقامات کو آسان ترین زبان میں ڈھالنے میں بے انتہا محنت کی میں ان کا بھی تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک زبان کے خیالات اور تصورات کو ہو بہو دوسری زبان میں منتقل کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ نہ جانے کتنی مرتبہ اس کام کو ترک کرنے کا ارادہ کیا' لیکن محترم پروفیسر خورشید احمد صاحب اور محترم خرم مراد صاحب کی شبانہ روز مشقت و محنت کو مثال بنا کر میں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ محترم عبدالرحمٰن قریشی صاحب کے تعاون کے لئے میں ممنون ہوں۔ زبان پہ مجھے عبور حاصل نہیں ہے۔ نہ ترجمے کے فن میں کامل ہونے کا دعویٰ ہے۔ بس اللہ رب العزت کے حضور اس حقیر کاوش کو احیائے اسلام کی جدوجہد میں منکسرانہ ہدیے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ تمام عالم میں محمد عربی ﷺ کا علم بلند فرمائے اور ہمیں دین اسلام کی ترقی کے لئے بیش از بیش جدوجہد کرنے کی توفیق

عطا فرمائے۔ آمین۔

کتاب میں مؤلف علام کے خیالات کو حتی المقدور صحت کے ساتھ ہو بہو پیش کیا گیا ہے۔ ترجے کے اندر تمام ممکنہ فردگزاشتوں کو میں پیشگی قبول کرتا ہوں' جو حضرات اہم فردگزاشتوں سے مطلع فرمائیں گے ان کا شکرگزار ہوں گا۔ انشاء اللہ کتاب کی دوسری اشاعت میں وہ درست کردی جائیں گی۔

۴ر اپریل ۱۹۹۳ء ر --- ۱۱ر شوال ۱۴۱۲ھ

محمد ایوب منیر
گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور کینٹ

علی عزت بیگووچ — ایک تعارف

اس کتاب کے مصنف علی عزت بیگووچ پیشے کے لحاظ سے قانون داں ہیں۔ ان کا تعلق سلاف (SLAV) نسل سے ہے جو کہ پچھلی پانچ صدیوں سے دین اسلام کی پیروکار ہے۔ علی عزت اپنے ماحول کا جائزہ اسلامی نقطہ نظر سے لینے کے عادی ہیں' لیکن ان کا وصف یہ ہے کہ وہ دلیری کے ساتھ اپنا راستہ خود چننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ان کے سینے میں یہ شعلہ جوالہ فروزاں ہے کہ دنیا بھر کے مسلم نوجوانوں کو ان کے حقیقی مقصد زندگی سے روشناس کرایا جائے اور انہیں احیائے اسلام کی جدوجہد پر آمادہ کیا جائے۔ خدمت اسلام کے حوالے سے علی عزت نے بوسنیا ہرزیگووینا میں جو خدمات سرانجام دی ہیں ان کی بدولت تاریخ اسلام میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوچکا ہے۔ اگست ۱۹۸۳ء میں سرائیوو کی عدالت میں گیارہ دوسرے دانشوروں کے ہمراہ علی عزت بیگووچ اور ایک خاتون شاعرہ کو چودہ چودہ سال کی قید سخت کی سزا سنائی گئی تھی۔ ان لوگوں پر الزام تھا کہ وہ "بنیاد پرستی اور انحراف" کی دعوت دیتے ہیں۔ یوگوسلاویہ کے اس دور کے اشتراکی حکمران علی عزت کی تحریروں کو موجودہ نظام کے لئے "شدید خطرہ" سمجھتے تھے۔

انہوں نے اپنی جدوجہد کی غایت اور اپنا مافی الضمیر ان الفاظ میں ظاہر کیا :

"میں ایک بوسنی مسلمان ہوں اور عرصہ دراز سے ملحد معاشرے کے اندر اسلامی نظریے کی حفاظت میں مصروف و مشغول ہوں۔ یہ بڑا اچھا موقعہ ہے کہ میں بوسنیا کی مسلم نوجوان نسل کے دل و دماغ میں ایک نئے انداز سے اسلام کا حقیقی تصور اجاگر کردوں"۔

۱۹۸۳ء میں سرائیوو کی عدالت میں عزت بیگ سمیت جن اہل علم کے خلاف الزامات عائد کرکے سزائیں سنائی گئی تھیں ان میں سے کسی کے بھی سیاسی مقاصد نہیں تھے۔ ان میں سے کوئی بھی سیاست میں سرگرم عمل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ عدالت میں کہا گیا کہ یہ لوگ حکومت کے خلاف ہیں اور عوام کے خلاف ہیں۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ان کا جرم تو صرف یہ تھا کہ وہ اپنے دین اسلام کی اشاعت کر رہے تھے۔

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے سب سے پہلے ویانا سے "اسلام اور مغرب" کے نام سے شائع ہوئی تھی اور اس میں اہم علمی موضوعات پر چند اہل علم کے مضامین شائع کیے گئے تھے اور یہ بوسنیا کے مسلمانوں کی طرف سے آزاد دنیا کی طرف اولین تحفہ تھی اور ہے۔ انگریزی کے علاوہ اس کتاب کے تراجم جرمن' بوسنی اور سربو کروشیائی زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

جن خیالات کا اظہار آئندہ کیا جائے گا انہیں بناوٹ اور تصنع پر محمول نہ کیا جائے۔ الحاد کے پیروکار یورپ میں دینی بنیادوں کی طرف پلٹنے کے نعرے نے مسلم دنیا کو جھنجھوڑ اور ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس چیز کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ ہم اپنے اسلامی تہذیبی ورثے کا جائزہ لیں اور تاریخ کے نام پر جو کاٹھ کباڑ جمع ہوچکا ہے اس کو چھانٹ کر دریا برد کردیں۔ اگر آزاد روی اور حقیقت پسندی کے ساتھ یہ کام سرانجام دے دیا گیا تو امید ہے کہ اسلام کے بارے میں ناقص اور کمزور تصورات رواج نہ پاسکیں گے۔

اسلام تاریخ کے جبر کے آگے جھک جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو انسانی زندگی کے ہر نظام کو خدا کی اطاعت کے نظام میں ڈھال دینے کا نام ہے۔ اس چیز کی بھی ضرورت ہے

کہ اسلام کے بین الاقوامی کردار پر خصوصی توجہ مرکوز کی جائے۔ یہ اعزاز صرف اسلام کو حاصل ہے کہ یہ یہودیت اور عیسائیت کو دین اسلام کی اولیں شکلیں قرار دیتا ہے۔

قرآن اپنے زمانے کے عربوں کے اس چلن پر تنقید کرتا ہے کہ وہ قدیم ناقص تصورات اور لایعنی پرانے طریقوں سے چپٹے ہوئے ہیں اور آج کے دور میں بھی یہی صورت حال ہے کہ مشرق میں ہمارے بھائی ابھی تک پرانے فکری رویوں سے چپٹے ہوئے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہیں۔ یہی چیز حقیقی اسلامی عقائد اور جدید سائنس کی تعلیم کی تشکیل کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے' جبکہ سچی بات تو یہ ہے کہ خدا کو پہچاننے کے لئے سائنس ایک ضروری معاون کا کردار ادا کرتی ہے۔ مدت دراز سے تبدیلی ناگزیر ہوچکی ہے۔ ہمارے لیے نئی شاہراہیں اسی وقت آشکار ہوں گی جب ہم گزرے ہوئے لوگوں کے خیالات و تصورات کی اندھا دھند تقلید بند کردیں گے(۱)۔

یورپ کا لادین معاشرہ ہو یا کوئی اور معاشرہ' اسلام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ خدا کو "ماضی کا خدا" یا "تاریخ کا خدا" قرار دیا جائے۔ اسلام تو کہتا ہے کہ خدا معلوم تاریخ کا خدا ہی نہیں ماقبل تاریخ کا بھی خدا ہے اور مابعد تاریخ کا بھی خدا ہے اور مستقبل کا بھی خدا ہے۔ وہ تو ہر آنے والے زمانے کا خدا ہے۔ کیونکہ انسان کی سوچ محدود ہے اس لئے وہ خدا کا صحیح ادراک کرنے میں بالعموم ناکام رہی ہے اور کیونکہ خدا کو محض عقل سے سمجھا نہیں جاسکا اس لئے انسان کو بھی سمجھا نہیں جاسکا ہے۔ نتیجۃً انسانیت اپنی منزل سے دور ہوتی چلی جارہی ہے۔

ایک لادین معاشرے میں مسلمان کس طرح زندگی بسر کرے۔ اسلام نے اس بارے میں واضح ہدایات دی ہیں۔ مثال کے طور پر بپتسمہ' عشائے ربانی اور پادری جیسے ادارے

---

(۱) اس مرحلے پر بہت احتیاط کی ضرورت ہے ہر پرانی چیز نہ قبول کرنے کے قابل ہوتی ہے نہ رد کرنے کے۔ (مترجم)

اسلام میں موجود نہیں ہیں۔اسلام محض رسوم 'رواج اور صرف عبادات کے طریقوں کا مجموعہ نہیں ہے' بلکہ زندگی کی حقیقتوں اور تقاضوں کو تسلیم کرکے انسان کی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ مثلاً بتاتا ہے کہ شادی کی معاشرتی حیثیت کو سمجھا جائے ازدواج اور جنس کے بارے میں فطری رویہ اختیار کیا جائے۔ علم اور سائنسی تحقیق کے بارے میں مثبت ردعمل کا اظہار کیا جائے۔ قبیلوں اور نسلوں کے حصار توڑ کر باہم شادیاں کی جائیں۔ نیز خدا پر یقین نہ رکھنے والے مذاہب کے پیروکاروں سے مفاہمت نہ رکھی جائے اور ان سے مکالمہ علمی حدود کے اندر رہ کر کیا جائے وغیرہ۔

اخلاق اور ضابطوں سے محروم ترقی انسان کی شخصیت کو زوال کی طرف دھکیل رہی ہے۔ ایسی ترقی کے آثار تو ہمیں صرف یہودیوں میں ملتے ہیں۔ مارٹن ببر نے خبردار کیا ہے :

"اگر تم دوسرے لوگوں جیسے ہو جاؤ گے تو تمہارا وجود ختم ہو جائے گا"{۲}۔

الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اسلام تقدیر پرستی کی تعلیم دیتا ہے۔ دنیا کو ترقی دینے کے لئے اسلام کی جو تعلیمات ہیں ان کا جائزہ لیا جائے تو یہ خیال بے بنیاد ثابت ہو جائے گا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اسلام کے برعکس جدید نفسیات تقدیر پرستی کی قائل ہے اسی وجہ سے نفسیات دان یہ رائے رکھتے ہیں کہ ہر انسان حالات کا شکار بن کر رہتا ہے۔ ایک معروف دانشور کا کہنا ہے "تمام اعصابی و دماغی امراض کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص تقدیر کا پابند اور مجبور محض ہے"۔

نبی آخرالزمان حضرت محمد ﷺ کی روحانی زندگی کی بلندی اور ارتقاء کا اندازہ واقعہ معراج سے لگایا جاسکتا ہے۔ معراج کے موقعہ پر آپ نے دونوں جہانوں کی سیر کی

{۲} Martin Buber Gesammelte Werke ed.

Richard Beer Hofmann (Frankfurt am main : Fischer 1963)

اور قرآن نے اسے بیان کیا۔ معراج کا واقعہ انسان کی عظمت اور اوج و کمال کا مظہر ہے۔ یہ واقعہ رواج اور روایت سے بالکل ہٹ کر وقوع پذیر ہوا۔ اس عظیم الشان واقعے نے انسان کے لئے گویا راہ کا تعین کردیا کہ انسان کو اس راستے پر چلنا ہے۔

تیرہویں صدی ہجری تک اسلامی فلسفہ پھلتا پھولتا رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سائنس اور علوم وحی کے تابع تھے۔ ابن رشد (AVERROS) جس کا انتقال ۱۱۹۸ء میں ہوا اس نظریے کا شدت سے قائل تھا۔ اسلام کی تہذیبی تاریخ کا بنظر غائر مطالعہ کیجئے تو آپ جان جائیں گے کہ مذہب اور سائنس شانہ بہ شانہ چل سکتے ہیں۔

اس کتاب کے مصنف نے "اسلامی منشور" (ISLAMIC DECLARATION) نامی کتاب لکھی تو بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں اس کو شہرت حاصل ہوئی۔ لیکن چونکہ اس میں مادی فلسفہ زندگی پر تنقید کی گئی تھی اور اسلام کے مبنی برصداقت ہونے کو ثابت کیا گیا تھا اس لئے سرائیوو کی عدالت میں عزت بیگ کے خلاف جو سب سے بڑا ثبوت پیش کیا گیا تھا وہ یہی اعلان تھا۔ اس کتاب میں محترم عزت بیگ نے اسلام کو سرمایہ داری نظام کے متبادل نظام کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کی یہ کتاب اپنے موضوع کی ایک بلند پایہ تصنیف ہے۔

عزت بیگ کا کمال یہ ہے کہ وہ مسئلے کو اس کی جڑ بنیاد تک سمجھا دیتے ہیں اور اس کا صحیح ترین حل بھی تجویز کردیتے ہیں۔ یہی دو خوبیاں اس کتاب کے ہر ہر ورق پر آپ کو نظر آئیں گی۔

چونکہ عزت بیگ کو غیر متوقع طور پر گرفتار کرلیا گیا تھا اس لئے حوالہ جات اور کتابیات کی فہرست نامکمل ہے۔ ماٰخذ کتابوں اور مضامین کی فہرست بھی نامکمل ہے۔ کبھی کبھار شک پیدا ہوتا ہے کہ مؤلف اصل کتاب کا حوالہ دے رہا ہے یا صرف ترجمے کا ذکر کر رہا ہے۔ ایسی کتابوں کے لئے ہم نے "تاریخ اشاعت مرقوم نہیں" تحریر کردیا ہے۔

{۳} جن حالات میں یہ کتاب مرتب ہوئی ان کو مدنظر رکھتے ہوئے امید ہے کہ قارئین

ان ادنیٰ کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ کتاب کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوں گے اور دنیا بھر میں لوگ اس کتاب میں جاذبیت محسوس کریں گے۔

ڈاکٹر الیس بالک

انسٹی ٹیوٹ فار عربک اینڈ اسلامک سٹڈیز'

آندر جوہان وو لفگانگ گوئٹے یونیورسٹی' فرینکفرٹ

{۳} اردو ترجمہ کرتے ہوئے ہم نے مآخذ درج کرتے ہوئے حتی الامکان احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے کیونکہ یہ مآخذ سربو کروشیائی' فرانسیسی' جرمن' لاطینی' انگریزی اور عربی زبانوں میں ہیں (مترجم)۔

گزارش احوال

مذہبی علم کلام اس کتاب کا موضوع نہیں ہے۔ اس کتاب میں مختلف عقائد' اداروں اور تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے۔ گوناگوں افکار و نظریات مذاہب اور طرز ہائے زندگی کے درمیان اسلام کے صحیح مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہم نے اس کتاب میں اسلام کو دنیا کے سامنے ایک نظریے کے طور پر پیش کیا ہے۔ پہلا حصہ مذہب سے بحث کرتا ہے اور دوسرا حصہ اسلام کے دو پہلو کردار پر روشنی ڈالتا ہے۔

حصہ اول : تمہید میں الحاد اور مادہ پرستی کے بارے میں تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد آنے والے چھ ابواب میں انسان کی تخلیق' ارتقاء' اور دیگر مسائل کے بارے میں مذہب کے پیروکاروں اور دہریت کے علمبرداروں کی آراء کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ یہ جان لینا چاہیے کہ تمدن' ارتقاء' سائنس اور خیالی ریاست (Utopia) الحاد و مادہ پرستی کے متوازی سمجھے جاتے ہیں۔ نیز تہذیب' تخلیق' فنون اور اخلاق مذاہب کے متوازی قرار دیئے گئے ہیں۔

طویل عرصہ گزر چکا ہے' لیکن "نظریہ ارتقاء" (Theory of Evolution) "انسان" پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے' تاہم "ایک مکمل حیوان" اس نظریے کے تحت

سامنے آیا ہے۔ ہوسکتا ہے مستقبل کے معاشرے میں اس کی کوئی جگہ ہو۔ یہی دیکھ لیجیے کہ اشتراکیت مادہ پرستی کا مظہر بن کر ابھری ہے۔ اشتراکیت "انسان" سے بحث نہیں کرتی۔ یہ تو "سماجی حیوان" سے دلچسپی رکھتی ہے۔ لیکن انسان تو بنیادی طور پر زندہ و تابندہ روحانی حقیقت ہے کیونکہ انسان کو خدا نے تخلیق کیا ہے۔ انسان حیاتیاتی تسلسل' اور معاشرتی عمل' کا نام نہیں ہے جیساکہ مادہ پرست خیال کرتے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کا وجود نہ ہوتا تو انسان بھی وجود میں نہ آتے اور اگر انسان وجود میں نہ آتے تو انسانی تہذیب بھی وجود میں نہ آتی اور اگر تہذیب وجود میں نہ آتی تو تمام سرگرمیوں کا محور اسباب اور اشیائے ضرورت کی فراہمی تک محدود ہوتا۔ (حاجات اور فراہمی اسباب کے سلسلے کا نام ہی تمدن ہے) الحاد اور دہریت اگرچہ سائنس کے دلدادہ اور ترقی کے علمبردار ہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ انسان' انسانیت' آزادی اور انسانی حقوق کے انکار کے علمبردار بھی ہیں۔ تہذیب اور تمدن کے درمیان کشمکش دراصل دماغ اور ضمیر' فطرت اور انسان یا سائنس اور مذہب کے تصادم کا نام ہے۔

اس بات کو آغاز ہی میں سمجھ لینا بہتر ہے کہ بنیادی طور پر تہذیب مذہب سے اور تمدن الحاد سے تعلق رکھتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ سائنس انسانیت کی طرف راہنمائی کی اہل نہیں ہے اور تن تنہا مذہب انسانی ترقی کی طرف پیش قدمی نہیں کرسکتا۔ میں نے اس تجزیے (Thesis) کو پھیلایا ہے اور انسانیت کے دوگونہ کردار (Bipolarity) کی مثالوں کے ذریعے وضاحت کی ہے۔ میں نے جسم و روح' سائنس و مذہب اور تمدن و تہذیب کے ناقابل انکار اختلافات واضح کیے ہیں۔ عیسائیت اور اشتراکیت بھی ان اختلافات پر الگ الگ غور و فکر کرتے رہے ہیں' لیکن اصل خرابی کو جاننے میں ناکام رہے ہیں۔ مسیحی اقدار کے ساتھ نفی کی علامات لگادی جائیں تو یہی اشتراکیت بن جاتی ہے گویا کہ اشتراکیت مسیحیت کا چربہ ہے۔ مسیحیت میں جو مقام مذہب کو حاصل ہے' اشتراکیت میں سائنس کو وہی مقام حاصل ہے۔ مسیحیت میں جو مقام فرد کو

حاصل ہے اشتراکیت میں وہ مقام ترقی کو حاصل ہے۔ اسی طرح انسانی حقوق کی جگہ سماجی حقوق کو حاصل ہے۔ محبت کی جگہ تشدد' آزادی کی جگہ سماجی تحفظ' نشو و نما کی جگہ جبری ورزش (Drill) اور روح کی جگہ اشتراکیت میں جسم نے لے لی ہے۔ اس عظیم الشان تضاد اور اختلاف پر قابو کس طرح پایا جائے؟ دین اسلام ہی اس اختلاف کا حل تجویز کرتا ہے۔ آج انسانیت چلا چلا کر سوال کر رہی ہے کہ کیا انسان ان دونوں انتہاؤں کے درمیاں ہی پھنسا رہے گا؟ کیا زمین کے اوپر اور آسمان کے نیچے کوئی اور حل موجود نہیں ہے؟ کیا اس عذاب سے جان نہیں چھڑائی جاسکتی؟ کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے کہ مذہب و سائنس' دیانت و ترقی' انسانیت و صحت کی بیک وقت خدمت کی جاسکے؟ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ بے چہرہ اور بے شناخت لوگوں کی جگہ ایسے لوگ آگے آئیں جو اس کائنات میں "خالق کائنات کی بادشاہت اور اس کا نظام" قائم کریں؟

اس کتاب کے دوسرے حصے میں ہم نے اسی سوال پر بحث کی ہے' نیز دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان اختلافات اور تضادات پر صرف اور صرف اسلام ہی قابو پاسکتا ہے۔ جان لینا چاہیے کہ اسلام صرف ایک مذہب کا نام نہیں ہے' صرف ایک نظام زندگی کا نام نہیں ہے' بلکہ تمام کائنات میں اسلام ہی کارفرما ہے اور کائنات میں ہر ہر چیز کی تنظیم اسی اصول پر ہوئی ہے۔ اسلام تو اس وقت بھی موجود تھا جب انسان موجود نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کی تخلیق اسی اصول پر ہوئی ہے۔ سورہ "الروم" میں قرآن نے اس کی تائید کی ہے { **فاقم وجهك للدين حنيفا فطرت الله التي فطر الناس عليها - الروم آیت - ۳۰** } (پس اے نبیؐ اور نبیؐ کے پیروو، یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی سمت میں جمادو (قائم ہوجاؤ) اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے)۔

انسان اور اسلام میں فطری ہم آہنگی اسی وجہ سے ہے۔ ہم نے اپنی کتاب میں اسے اسلام کی "بشریت" قرار دیا ہے۔ جس طرح انسان جسم اور روح کا مجموعہ ہے' اسی طرح

اسلام مذہب اور معاشرت کا مجموعہ ہے۔ نماز ادا کرتے ہوئے روح اور جسم یک جان ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح معاشرتی نظام میں مذہب اور اخلاق یک جان ہوسکتے ہیں۔ نظام معاشرت اور مذہب کے درمیان پائی جانے والی ہم آہنگی سے نہ عیسائیت آگاہ ہے نہ ہی مادہ پرستی آگاہ ہے جبکہ اسلام کا اولین خاصہ ہی یہ ہے کہ اس نے دین اور دنیا کو یکجا کردیا ہے۔

مذہب' قانونی نیز سیاسی و تہذیبی ادوار کے منفرد پہلوؤں پر حصہ دوم میں بحث کی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت مسیح علیہ السلام اور آنحضرت محمد ﷺ کا ہم نے موازنہ پیش کیا ہے۔ ان تینوں عالی مرتبت ہستیوں کی تعلیمات کے ذریعے ہی انسانیت اور تاریخ کے باہمی ملاپ کی وضاحت ممکن ہے۔ عہد نامہ قدیم کی "حقائق پرستی" اور عہدنامہ جدید کی "مثال پرستی" کا جامع صرف اور صرف قرآن مجید ہے۔

باب ہشتم میں اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اس کے پانچ بنیادی ستونوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ نیز اسلام کے ہمہ گیر نظام میں نماز کی مرکزی حیثیت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نماز اسلام کے نظام کی بنیاد ہے' اس کا محور و مرکز ہے اور اس کی شناخت ہے۔ نماز میں دو ایسے اصول یکجا ہوجاتے ہیں جن کا اجتماع نہ مسیحیت میں ممکن ہے نہ مسیحیت کبھی اس کے بارے میں سوچ سکتی ہے۔ یہ دو اصول وضو اور نماز کا عمل ہیں۔ وضو جسمانی و ظاہری پاکیزگی عطا کرتا ہے' جبکہ نماز روحانی پاکیزگی اور بالیدگی عطا کرتی ہے۔ ظاہری اور روحانی پاکیزگی کے یہ دو اصول اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تصوف کے مسائل عقل' دلیل اور منطق کی نفی کرتے ہیں' جبکہ دلیل و منطق تصوف کو سمجھنے میں ناکام رہے ہیں۔ مسیحی شعور عقل کو تسلیم کرتا ہے یا تصوف کو' جبکہ ایک کو تسلیم کرنا اور دوسرے کی نفی کرنا اسلام کی بنیادوں کی نفی ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ اسلام انسان کی تہذیبی' ثقافتی' تمدنی' فنی اور تخلیقی اہلیت و اہمیت کو تسلیم کرتا ہے اور اس چیز کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔ { ولا تنس نصیبک من الدنیا ۔ القصص آیت ۔ ۷۷ } (اور اپنی دنیاوی

ذمہ داریوں کو فراموش نہ کرو)۔

اس کتاب کا خاتمہ ہم نے 'خدا کی اطاعت' والے مضمون سے کیا ہے۔

علی عزت بیگووچ

سرا یوو، یوگوسلاویہ {۱}

{۱} یوگوسلاویہ ٹوٹ چکا ہے اور علی عزت بیگووچ اسلامی ریاست بوسنیا ہرزیگووینا کے پہلے صدر ہیں۔ یہ زمانہ (۱۹۹۳) اس اسلامی ریاست کے لئے بہت ابتلاء کا زمانہ ہے۔ سرب، اشتراکی اور مسیحی ریاستوں کی مدد سے بوسنیا پر قبضہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں اور ہتھیاروں کی کمی اور ناکہ بندی کی وجہ سے مسلمانوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے (ادارہ)۔

موضوع پر ایک نظر

ایک شدید ترین نظریاتی بحران جدید دنیا کی نمایاں ترین علامت ہے۔ کبھی ہم اس بحران کا حصہ بن جاتے ہیں' کبھی اس کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس شدید کشمکش میں اسلام کا کیا مقام ہے؟ آیا کائنات کی ترتیب نو میں اسلام کا کوئی کردار ہوگا یا نہیں؟ اس کتاب میں اسی سوال کا جواب فراہم کیا گیا ہے۔

دنیا کے بارے میں جامع نظریات صرف تین ہیں : (ا) نظریہ مذہب (۲) نظریہ مادہ پرستی (۳) نظریہ اسلام۔ شعور' فطرت اور انسان ان کے نمائندے ہیں۔ ازمنہ قدیم سے آج تک جتنے افکار و نظریات اور فلسفے ظاہر ہوئے ہیں۔ ان کا شمار ان تینوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ضرور تسلیم کیا گیا ہے۔

اہل مذہب' روح کو نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں۔ مادہ پرست' مادے' کو نقطۂ آغاز مانتے ہیں' جبکہ اسلام' روح اور مادے کے بیک وقت ظہور کو نقطۂ آغاز قرار دیتا ہے۔ اگر مادے کے وجود کو ہی اصل تسلیم کرلیا جائے تو مادہ پرستی برحق محسوس ہوگی۔ اگر روح کو اصل تسلیم کرلیا جائے تو انسان کا وجود بے مقصد نظر آتا ہے۔ روح اور مادے کے اشتراک کا نام 'اسلام ہے اور اس سے بڑا مظہر انسان ہے۔ انسانی زندگی اسی وقت مکمل

ہوتی ہے جب روحانی اور جسمانی ضروریات دونوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

پرانے لوگ (ان میں ہمارے اجداد بھی شامل ہیں) کہا کرتے تھے کہ حقیقتیں صرف دو ہیں مادہ اور دماغ اور اسی بنیاد پر ان کے ہاں دو نظاموں اور دو دنیاؤں کا پتہ چلتا ہے۔ نہ تو ان کو مدغم کیا جاسکتا تھا نہ ان کو ایک دوسرے سے اخذ کیا جا سکتا تھا۔ دنیا کے عظیم مفکرین اور قائدین بھی اس دوئی کو ختم نہ کر سکے۔

دوسری دنیا کے بارے میں ہمارے پاس کوئی عقلی ثبوت تو موجود نہیں ہے' تاہم واضح طور پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان کو صرف اس لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے کہ وہ زندگی بھر خوردنوش میں مشغول رہے اور نسل پیدا کرے۔ وہ سائنس دان اور مفکرین جو حقیقت کی تلاش میں مگن رہتے ہیں صرف سوچ کی بنیاد پر دوسری دنیا کو نہیں پاسکتے' لیکن حقیقت کی تلاش انسانیت کی معراج ہے۔

انسانی تاریخ میں فکر کے ہمیشہ دو دھارے موجود رہے ہیں۔ یہ دھارے ایک دوسرے کے متوازی چلتے چلے آرہے ہیں۔ اس سلسلے کا آغاز افلاطون (PLATO) سے ہوتا ہے۔ بعد ازاں قرون وسطی کے مسیحی مفکرین' ان کے بعد امام غزالی (Al-Ghazali) ڈیکارٹ (DESCARTES) میلبرانخ (Malenbranche) لیبنٹز (Lelbnitz) برکلے (Berkeley) فِخ (Fitche)' کڈورتھ (Kudworth) کانٹ (Kant)' ہیگل (Hegel) اور ماکھ (Mach) آتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں یہ سلسلہ برگساں (Bergson) تک پہنچتا ہے۔ مادہ پرست فکر کے علمبرداروں میں تھیلز (Thales)' اناگزماندر (Anaximander) ہراکلیٹس (Heraclitus)' لکریٹس (Lucretius) ھابز (Hobbes)' گاسندائی (Gassendi) ہلویٹیس (Helvetius)' ہالباخ (Holbach)' دائدرٹ (Diderot)' سپنسر (Spencer)' اور مارکس کے نام علی الترتیب آتے ہیں۔

عملی زندگی میں لفظ "انسانیت" اور لفظ "ترقی" دو متضاد انتہاؤں کی طرف اشارہ

کرتے ہیں۔ اہل مغرب کی غلط فہمی یہ ہے کہ وہ مذہب کو ترقی کے مخالف اور ترقی کے راستے کی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ نہ تو کوئی مذہب سے الگ رہ سکتا ہے نہ سائنس ہی مذہب سے بیگانہ رہ سکتی ہے۔ کسی ایسے مذہب کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جس میں سائنس کے حوالے سے کوئی نہ کوئی ذکر نہ ہو۔ نہ ہی ایسی سائنس کا وجود ممکن ہے جس میں مذہب کے حوالے سے کوئی ذکر نہ ہو۔ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کی اس طرح تکمیل کرتے ہیں جس طرح پچی کاری (MOSAIC) میں پتھر جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

یہی حال انسانی تاریخ کا بھی ہے۔ کارلائل کا خیال ہے کہ تمام عظیم تاریخی واقعات کے پس پشت چند بڑے لوگ (Heroes) ہوتے ہیں۔ نیز دانا و فرزانہ لوگ ہی تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں۔

مادہ پرستوں کو اصرار ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو نہیں دہراتی"[1] لیکن ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان دونوں آراء کی نفی کرتے ہیں۔ اس طرح نظریے (Thesis) اور متضاد نظریے (Anti-Thesis) کو پرکھنے کے بعد ہم حقیقت کے بہت قریب پہنچ جاتے ہیں۔

مادہ پرستی مسیحیت کی ضد ہے۔ تخلیق کا نظریہ ارتقاء کے نظریے کی ضد ہے۔ آزادی، ہم رنگی کی ضد ہے۔ شخصیت معاشرے کی ضد ہے۔ مذہب کا تقاضا تھا کہ "خواہشات کو محدود کردیا جائے"۔ مادہ پرستی نے اصرار کیا "نئی نئی خواہشات کو بار بار جنم دیا جائے"۔ ان متضاد مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہب اور مادہ پرستی کے نظریات آغاز ہی سے متوازی چلے آرہے ہیں۔ ان میں سے نہ تو ایک دوسرے پر غالب آسکتا ہے

---

(1) Karl Marx, The Karl Marx Library.
Translation Saul K. Pedower (New York Mc Graw Hill 1972)

نہ دوسرا پہلے کو ختم کرسکتا ہے۔ قرآن نے بہت خوبصورت الفاظ میں ان کی نشاندہی کی ہے [مرج البحرین یلتقیان بینهما برزخ لا یبغیان۔ سورہ رحمٰن' آیت نمبر ۲۰-۱۹]
(یہ دو سمندر ہیں' ایک دوسرے پر غلبہ نہیں پاسکتا)

مسیحیت نے نجات کی تعلیم پیش کی' لیکن اس سے مراد روحانی نجات لی اور اشتراکیت نے مادی اور دنیاوی فلاح کا فلسفہ پیش کیا۔ لیکن یہ دونوں متضاد نظریات انسانوں' زندگی اور حقیقت کو ٹکریوں میں بانٹ دیتے ہیں جبکہ ان دونوں کے درمیان فطری تناسب کی تلاش کے بغیر مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔

کچھ ایسے حقائق ہیں جن کا انکار نہیں کیا جاسکتا اور ہر شخص کی زندگی ان سے متاثر ہوتی ہے۔ چاہے فرد کسی بھی نظریے پر کاربند ہو یہ حقائق اس کی زندگی پر کچھ نہ کچھ اثرات ضرور ڈالتے ہیں۔ اہل خاندان' تلاش معاش' خوشی و غم' آزادی' صحت' تعلیم' نفع 'نقصان' حق پرستی' راست بازی' اور ذمہ داری وغیرہ انسانی زندگی پر شدید اثرات مرتب کرتے ہیں۔ حقائق ایک محور کے گرد منظم انداز میں گھومتے محسوس ہوتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام حقائق ہماری راہنمائی اسلام کی طرف کررہے ہیں۔

زندگی ایک عجیب و غریب چیز کا نام ہے۔ کل ایک چیز کے خلاف جنگ لڑی جاتی رہی۔ آج وہ پسندیدہ ترین بن جاتی ہے۔ کل تک کچھ نظریات بڑے پسندیدہ رہے' آج وہ "ماضی کا قصہ" کے سوا کچھ بھی نہیں۔ مارکس کی تعلیمات نے خاندان اور ریاست کا انکار کیا۔ لیکن یہ دونوں ادارے عملاً برقرار رہے۔ اس نے سماجی انصاف اور پرسکون دنیا کا نقشہ پیش کیا اور کوئی بھی نظریہ ان دونوں باتوں کی نفی نہیں کرتا' لیکن خود اشتراکی ممالک ایسے نہ بنے۔ بلکہ ان میں تو تشدد و بے انصافی کے ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ دراصل کسی بھی ادھورے فلسفے کی مدد سے زندگی گزاری نہیں جاسکتی۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ان پر پیچ اور گنجلک انتہاؤں کے درمیان ایک راستہ بنالیا جائے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ دونوں نظاموں سے اچھی باتیں مستعار لے لی جائیں اور درمیانی

شاہراہ پر کاروان زندگی کو رواں کردیا جائے۔

مسیحیت جو کہ آج صرف کلیسا تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اس نے صحت' تعلیم' روزگار' ازدواج اور سماجی انصاف کے تصورات متعارف کرائے جبکہ اشتراکیت نے انسان پروری' فنون لطیفہ' تخلیق و تعمیر اور سماجی فلاح کے نظریات کو متعارف کرایا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں ادھورے محسوس ہوتے ہیں۔ اس کا اظہار عملی طور پر ہوتا ہے۔ نظری طور پر تو کہا جاسکتا ہے کہ ایک شخص عیسائی ہے یا مادہ پرست ہے' لیکن عملی طور پر جائزہ لیا جائے تو نہ کہیں پورا عیسائی دستیاب ہوگا اور نہ ہی مکمل مادہ پرست۔

چین' کوریا اور ویت نام ایسے ممالک ہیں جہاں کی حکومتیں یہ سمجھتی ہیں کہ انہوں نے مارکس کی تعلیمات کو من و عن نافذ کردیا ہے' لیکن عجیب و غریب صورت حال کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اشتراکی ریاستوں میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں کے لئے نقد انعامات کی بجائے تعریف و توصیف اور اخلاقی تھپکیوں سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ انسانیت انصاف' مساوات' آزادی اور انسانی حقوق کے بارے میں ایسی ہی جذباتی اپیلیں کی جاتی ہیں جس طرح مذاہب میں ہر کام اپیل کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس طرح مادیت نے مذہب اور مذہب نے مادیت کو بہرحال سمونے کی کوشش کی ہے اور اوپر کی مثالیں ہماری بات کو اچھی طرح واضح کر رہی ہیں۔

اس کے برعکس اسلام ہے جو یہ دعوت دیتا ہے کہ دنیا کی دوہری حیثیت اور دوگانہ کردار کو سمجھا جائے۔ اگر یہ دونوں رخ سمجھ میں آگئے تو اسلام کو سمجھنا آسان ہوجائے گا۔ ہم نے اس کتاب میں جہاں کہیں "اسلامی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے اندر اسلام کے تمام احکامات اور تمام تشریحات شامل ہیں' چاہے مروج ہوں یا نہ ہوں۔ اسلام ریاضی کے بنے بنائے فارمولے کا نام نہیں' بلکہ متضاد' متحارب اور متصادم اصولوں کو جوڑ کر عدل کی شاہراہ کی تعمیر کا نام ہے۔ اسلام انسان کو بار بار یہ یاد دلاتا ہے کہ اس کی تخلیق کس طرح کی گئی۔ قانون فطرت کی پابندی ایک چیز ہے اور آزادی کردار و عمل ایک

دوسری چیز ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں وضو اور نماز میں اکٹھی ہوگئی ہیں۔ صرف نماز کے عمل سے ہی اسلام کی پوری عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے اور اس تعمیر کی حقیقت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

تاریخی طور پر دیکھا جائے تو اہل یورپ "وسطی راہ" تلاش کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے ہیں' لیکن اہل انگلستان اس سے مستثنیٰ ہیں۔ جب اہل یورپ وسطی راہ تلاش کرہی نہ سکے تو ان کی اصطلاحات کے ذریعے اسلام کی وضاحت کس طرح ممکن ہے۔ اسلامی اصطلاحات مثلاً صلوٰۃ' زکوۃ' جماعت' وضو اور خلیفہ وغیرہ کے لئے دعا (Pray) ٹیکس (Tax)' برادری (Group)' صفائی (Washing) اور حکمران (Ruler) کے الفاظ موزوں ترین نہیں ہیں۔ بالکل اسی طرح اسلام کو مذہب اور مادیت کی درمیانی راہ قرار دینا بھی سراسر ناانصافی ہے اور یہ کہنا تو سراسر ظلم ہے کہ اشتراکیت اور مسیحیت کے درمیان کا راستہ اسلام ہے۔ ان تصورات کو جزوی طور پر تو درست کہا جاسکتا ہے مگر یہ صورت حال کی اصلی اور سچی نمائندگی اور عکاسی نہیں ہے۔ ریاضی کی اصطلاح میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اشتراکیت + مسیحیت = اسلام یا یہ کہ اشتراکیت + مسیحیت = اسلام۔ اسلام تو دین کا بھی مظہر ہے اور دنیا کا بھی۔ روح کا بھی نمائندہ ہے اور جسم کا بھی۔ اس زندگی کا بھی قائد ہے اور آنے والی زندگی کا بھی راہنما ہے۔ اس صورت میں ریاضیاتی منطقیں پیچیدگی پیدا کرتی ہیں۔ اسلام نے صلوٰۃ' زکوٰۃ اور وضو کی جو اصطلاحیں متعارف کرائی ہیں ان کے مفاہیم ناقابل تقسیم اور ناقابل مثال ہیں۔ ان سب کی دوہری تعبیر ہے اور ان کی تطبیق و توصیف صرف اور صرف انسان کی مثال سے ہی سمجھ میں آسکتی ہیں۔

ایک نوآموز شخص جب قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے تو پہلی نظر میں اسے آیات بے ترتیب اور نظم کلام میں انتشار محسوس ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات ہروقت ذہن میں رکھی جانی چاہیے کہ قرآن کا اسلوب زندگی ہے' ادب نہیں ہے۔ قرآن کے بارے میں جو جامع ترین بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ زندگی ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ یہ

زندگی آنحضرت ﷺ کی ہے۔ تحریر کی شکل میں تو قرآن شاید بے ترتیب محسوس ہوتا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی شکل میں یہ مربوط و منظم نظر ہی نہیں آتا چلتا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے اس قرآن کو تسلیم کیا تھا ان کی زندگی میں مذہب و سیاست کے اس کامل ترین مجموعے نے بے حد و بے مثال قوت توانائی شادابی اور رعنائی بھر دی تھی۔ اسلام نے مختصر سے وقت میں زندگی کی اصل روح کو کائنات بھر کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔

اسلام عدل کی راہ ہے' اس کا اندازہ اس چیز سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ہمیشہ دو متضاد سمتوں سے اسلام پر حملے کیے جاتے رہے ہیں۔ نام نہاد مذہبی حلقوں کا اعتراض ہے کہ اسلام فطرت (Nature)' ترقی (Progress) اور دنیاوی معاملات کا علمبردار ہے' جبکہ اہل سائنس اسلام میں مذہبی' روحانی اور تصوفانہ باتوں کو لائق تنقید سمجھتے ہیں۔ اسلام صرف ایک ہی ہے جس طرح زندہ انسان روح و جسم کا مجموعہ ہوتا ہے' لیکن ادھورے نقطۂ ہائے نظر اس کے مختلف پہلوؤں کو چھپا دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مادہ پرستوں کو اعتراض ہے کہ دین اسلام تو صرف روح اور تصوف کا مذہب ہے اور وہ مذہب کو دائیں بازو کی تحریک قرار دیتے ہیں۔ {۲} جبکہ اہل مذہب (عیسائیت وغیرہ) اسلام کو سماج سدھار تحریک (Social Reform Movement) اور بائیں بازو کی تحریک یا اشتراکی تحریک کا چربہ (Semi-Social Move) قرار دیتے ہوئے بالکل نہیں ہچکچاتے۔

گہرائی میں اتر کر اسلام کے اعتقادات' تصورات' نظریات اور تعلیمات کا جائزہ لینے سے اس کی دوہری اور دو پہلو خصوصیات (Bipolar Qualities) ابھر کر سامنے

{۲} اشتراکی حضرات مذہب کو استحصالی سانچہ' سرمایہ دار کی سازش' غریب عوام کے لئے افیون اور پسے ہوئے طبقات کا مزید استحصال سمجھتے ہیں (مترجم)۔

آتی ہیں۔ اسلام کا کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں ہے جو کہ محدود تعریف کی روشنی میں خالصتاً مذہبی ہو۔ سیاست' معاشرت اور سائنس سے لاتعلق ہو۔ اہل تصوف اخلاق پر زور دیتے ہیں جبکہ اہل فلسفہ و منطق دلیل پر زور دیتے ہیں۔ محدود مذہبیت اور نام نہاد سائنس دونوں ہی اسلام سے الجھن محسوس کرتے ہیں۔ اس کی صرف اور صرف یہ وجہ ہے کہ اسلام ان کے اپنے بنائے ہوئے اصولوں' ذہنی رویوں' اور خود ساختہ سانچوں میں فٹ نہیں بیٹھتا۔ مثال کے طور پر وضو کی مثال ہی لے لیں۔ صوفیاء تو اسے ایک مذہبی اور روحانی عمل قرار دیں گے اور پانی کے ذریعے جسم کے اعضاء کے دھلنے کو ظاہری علامت یا علامتی اظہار قرار دیں گے جبکہ عقل پرست اور ظاہر بین نگاہ اسے حفظان صحت کا ایک اچھا اصول قرار دے گی۔ دونوں گروہ اپنی اپنی جگہ پر درست بات کہہ رہے ہیں۔ لیکن دونوں گروہ جزوی بات کر رہے ہیں۔ اہل باطن کی تعریف میں نقص یہ ہے کہ انہوں نے حفظان صحت کے پہلو کو فراموش کردیا اور اسے صرف ایک مظہر قرار دیا۔ اس طرز فکر کو اگر اختیار کرلیا جائے اور تمام سوالات کے جوابات اسی طرز پر فراہم کیے جائیں تو اسلام چند رسومات کے مجموعے کے سوا کچھ نہ رہے گا اور اس میں سے تخلیقی' معاشرتی اور ظاہری دنیاوی پہلو غائب ہوجائیں گے۔

اب ظاہر بین اور عقل پرست لوگوں کا استدلال ملاحظہ فرمایئے۔ وہ اسلام کے دینی پہلو کو یکسر نظرانداز کرکے اس دین کو سیاسی تحریک' قرار دے کر محدود اور مقید کردیتے ہیں۔ پھر اسلام پر قوم پرستی کا لیبل چسپاں کردیتے ہیں۔ پھر اسلام کو تمام اخلاقی و مذہبی حدود و قیود سے پاک قرار دے کر مروجہ قوم پرستانہ نظریات کے برابر لا کھڑا کرتے ہیں۔ اس صورت میں اسلام کا مطلب صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ ایک خاص گروہ اور قوم کا نام ہے جو دوسرے گروہوں اور قوموں سے مختلف ہے۔ اسلام کبھی بھی ایک قوم نہیں رہا۔ اس کے برعکس اسلام تو ہر قوم کے لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دینے اور پکارنے کا نام ہے۔ قرآن نے کہا : ﴿ الذین ان مکنھم فی الارض اقاموالصلوۃ و اتوالزکوۃ

وامروا بالمعروف و نہوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔ الحج۔ ۴۱ } (یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے)۔ اور یہ فرض ایک اخلاقی قوت اور اخلاقی تحریک ہے۔ اگر ہم اسلام کے سیاسی فلسفے اور معاشرتی و عمرانی کردار کو فراموش کردیں اور معروف مذہبی تعریف کو قبول کرلیں تو اس کا مطلب خاموش غلامی اور فکری جکڑ بندی کے سوا اور کیا ہوگا۔ اس کے برعکس اس فرض کے ایک دینی فرض ہونے کو نگاہوں سے اوجھل کردیں تو پھر اخلاقی قوت کے طور پر اسلام کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اگر وسائل اور کارکن اورافراد کسی ظالم سامراج کے غلام ہوں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ برطانوی سامراج ہو' جرمن سامراج ہو یا مذہب کے نام پر کوئی آمریت ہو۔

اسلام کی پکار تو یہ ہے کہ ایک شخص اپنے جسم و روح کو معاشرے کے ساتھ ہم آہنگ کرے اس طرح کہ معاشرتی و سماجی ادارے اور قوانین اس کے معاون و مددگار ہوں' اس کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ اسلام تو ہر دور میں دینی و دنیاوی' ظاہری و باطنی اندرونی و بیرونی توازن کا علم بردار رہا ہے اور آج بھی اسلام کو یہی کردار بہرحال ادا کرنا ہے' اسلام کا نصب العین آج بھی یہی ہے اور مستقبل میں بھی اسلام یہی کردار ادا کرے گا۔

اس کتاب میں مسائل کو اس انداز میں زیر بحث لایا گیا ہے کہ پیچیدہ ترین مسائل سب سے پہلے زیر بحث آئے ہیں۔ اس حقیقت سے سب آگاہ ہیں کہ آج دنیا دو متضاد کیمپوں میں بٹ چکی ہے اور اس تضاد کی بنیاد نظریات ہیں۔ تفریق' تقسیم' مخالفت و مخاصمت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ آج ہمارے سامنے دو متضاد جہان آباد ہیں جو سیاسی نظریاتی اور ذہنی و جذباتی طور پر ایڑی سے چوٹی تک بٹ چکے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ہی انسانوں کی دنیا کو بانٹ دیا گیا ہے ــ تاہم دنیا کا ایک حصہ ایسا ہے جس کو اس

تقسیم اور تفریق کا شکار نہ بنایا جاسکا اور اس کی اکثریت مسلم ممالک پر مشتمل ہے۔ یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے کہ نظریاتی طور پر اسلام آزاد ہے اور اس کا کسی (مشرکانہ کافرانہ عقیدے) کے ساتھ اتحاد و الحاق نہیں ہے۔ {۳} اسلام کا نام ہی اس کی تعریف اور الگ حیثیت متعین کردیتا ہے۔

نظریاتی اور سیاسی طور پر مسلم ممالک کی عدم وابستگی جاری ہے اور جاری رہے گی اور اسے جاری رہنا بھی چاہیے۔ تقسیم در تقسیم سے علیحدگی کی وجہ صرف سیاسی نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے یہ فیصلہ کن عوامی مطالبے کام کر رہے ہیں کہ مشرق و مغرب کے تمام بیرونی نمونوں (Ideals) سے اور اثرات سے نجات حاصل کی جائے اور آج کی دنیا میں اسلام کا حقیقی مقام یہی ہے۔

اسلام کو مشرق و مغرب میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ اس کے پیروکاروں کو اپنے مشن کا علم دوبارہ بلند کرنا ہوگا۔ یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ مروجہ نظریات اپنی انتہائی شکلوں کے ساتھ انسانیت پر عائد نہیں کیے جاسکتے۔ اور ان نظاموں کو ازسرنو اپنی ترکیب (Constituents) کا جائزہ لینا پڑے گا۔ نیز "وسطی راہ" اختیار کرنا ہوگی۔ پیروان اسلام ہر دور میں "امت وسط" رہے ہیں۔ ماضی میں مسلمان قدیم تہذیبوں اور مغرب کے درمیان "امت وسط" کا کردار ادا کرتے رہے اور آج بھی شورشوں، المیوں، فتنوں، سازشوں، فسادوں، اور خرابیوں کی ماری ہوئی اس دنیا کو دوبارہ ملانے اور جوڑنے کے لئے اسلام کے پیرو کاروں کو اپنا دست تعاون پیش کرنا ہوگا اور امید کی جاسکتی ہے کہ تیسری دنیا یعنی اسلامی دنیا یہ کردار، یعنی "امت وسط" کا کردار ادا کرے گی۔

{۳} ایران اور پاکستان نے سینٹو (CENTO) معاہدے سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔ انڈونیشیا، سوڈان، مصر اور صومالیہ نے مشرقی بلاک کے پھندے میں آنے سے انکار کردیا ہے۔

میں پھر گزارش کرنا چاہوں گا کہ یہ کتاب مذہبیات کی کتاب نہیں ہے۔ نہ ہی اس کتاب کا مصنف مفسر و شارح ہی ہے۔ صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اس زبان میں اسلام کی تعلیمات کی توضیح و تشریح ہے جس کو اس ملک کے نوجوانوں کی اکثریت بولتی اور سمجھتی ہے۔

اس سلسلے میں ہر کوتاہی کو ہم تسلیم کرتے ہیں۔

علی عزت بیگووچ

باب اول تمہید : مذہب پر ایک نظر

تخلیق اور ارتقاء

❑ ڈارون اور مائیکل اینجلو :

انسان کی تخلیق کیسے ہوئی؟ اس سوال سے ہر انسانی نظریے کا آغاز ہوتا ہے۔ جب کبھی اس بحث کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کہ انسان کو زندگی کس طرح گزارنا چاہیے تو سب سے پہلے اس سوال کا جواب مطلوب ہوتا ہے کہ انسان کا آغاز کس طرح ہوا تھا؟اور اہل سائنس کا جواب اہل مذہب کے جواب سے مختلف ہوتا ہے۔

اہل سائنس کا کہنا ہے کہ انسانی زندگی کا آغاز زندگی کی حقیری شکل سے ہوا۔ اس وقت یہ ممکن نہ تھا کہ انسان اور حیوان میں تمیز کی جاسکے۔ بعد ازاں ارتقاء کی منزل طے کرنے کے بعد موجودہ انسان وجود میں آیا۔ اہل سائنس کا خیال ہے کہ سیدھا چلنے کی کوشش کرنا' گفتگو اور اشاروں کے ذریعے پیغام پہنچانا اور اوزار بنانا حیوان کے انسان میں تبدیل ہونے کی علامتیں تھیں۔۔ سائنس دان انسان کو فطرت کی تخلیق اور فطرت کی اولاد قرار دیتے ہیں اور یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ انسان فطرت کا حصہ ہے اور حصہ رہے گا۔

اہل مذہب انسان کی پیدائش کو خدا کا فعل قرار دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انسان کا وجود ارتقائی عمل کے سبب وجود میں نہیں آیا بلکہ خدا کی رضا اور خدا کے ارادے سے وجود میں آیا۔ مذہب کے پیرو کاروں کے ذہن میں یہ تصور ہے کہ انسان کو پیدا کرنے کے بعد اسے زمین پر اتارا گیا۔ انسان اور فطرت کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوگیا اور یہ اب بھی جاری ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا انسان "ارتقائی عمل" کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے یا اسے خدا تعالیٰ کی ذات نے تخلیق کیا ہے؟ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کیا ہے؟ کیا یہ دنیا کا حصہ ہے یا دنیا سے مختلف کوئی چیز ہے؟

عقل پرست دہریوں کا کہنا ہے کہ "انسان مکمل حیوان ہے"۔ "انسان ایک جامع مشین ہے"۔ انسان اور جانور کے درمیان وہ صرف ایک درجے کا فرق کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں انسان جانوروں سے ایک درجہ آگے ہے۔ صلاحیت اور استعداد میں دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ انسان کی کوئی مخصوص اساس ہی ہے۔{۱} ان کا کہنا ہے کہ معاشی و سماجی عوامل کا وجود ہر دور میں رہا ہے اور اس کی تاریخ ہی انسان کے بارے میں رائے قائم کرنے میں مددگار ہوسکتی ہے۔{۲} کائنات کے دوسرے نظاموں کی طرح انسان بھی ایک نظام ہے{۳} اور اس نظام کا نام ہے "کام"۔ فریڈرک اینجلز کی بھی

{۱} John Watson : "No divinity line between man and Brute"

Psychology Review 20 1913 ; p.158.

{۲} George Lukacs : Existentialism or Marxism Studies in

European Realism Edith. Bone (London Hillway Publishing 1950)

{۳} Ivan P. Pavlov. "Experimental Psychology" Essays in

Psychology and Psychiatry. (New York Citadel Press 1962).

یہی رائے ہے۔ وہ کہتا ہے "انسان اپنے ماحول اور اپنی کارکردگی کا حاصل ہوتا ہے"۔ انسانی ہاتھ انسان کی ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ "ہاتھ" اور "زبان" کا ارتقاء' حیوانی زندگی کے خاتمے اور انسانی تاریخ کے آغاز کا نقطہ اتصال بنتا ہے۔ {۴} یہ تمام خیالات بظاہر تو بڑے پرزور محسوس ہوتے ہیں لیکن یہ عظمت انسان کی نفی کرتے ہیں۔

مادہ پرست فلاسفہ انسان کو اس کے اجزائے ترکیبی میں اس طرح بانٹ دیتے ہیں کہ آخرکار انسان غائب ہوجاتا ہے اور اجزاء باقی رہ جاتے ہیں۔ اینجلز کا کہنا ہے کہ انسان سماجی تعلقات کا نتیجہ ہوتا ہے اور "پیداوار کے موجودہ ذرائع کا حاصل انسان ہے" اور اس کے علاوہ انسان کی کچھ حیثیت نہیں ہے۔

شخصیت اور وجود سے محروم انسان کو ڈارون نے اپنے فلسفے کا تختہ مشق بنا لیا اور کہا کہ طبعی انتخاب (Natural Selection) کے سبب انسان نے ترقی کی ہے اور اسی طبعی انتخاب کی ترقی ہے کہ انسان بول سکتا ہے' اوزار بنا سکتا ہے اور سیدھا ہوکر چل سکتا ہے۔ علم حیاتیات نے انسانی زندگی کو کیمیائی ـــ طبعی عوامل کا تعامل اور مالیکیولوں کا کھیل قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے طبعی عوامل میں زندگی شعور اور روح کا کوئی تصور نہیں ہے۔ لہٰذا نہ انسان کی کوئی اساس ہے نہ ہی انسانیت کی کوئی اساس ہے۔

ڈارون نے انسان کے متعلق جو تصور قائم کیے ہیں ان کے اندر بہت سی خامیاں ہیں۔ علاوہ ازیں انسان کے بارے میں ان تصورات نے انسان کے مسائل میں اضافہ کیا ہے۔ انسان کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد نہیں دی ہے۔ سائنس سنگدلانہ تعبیرات کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ انسان' جانور کی حالت سے ترقی کرکے انسان بنا ہے۔ جبکہ فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے اپنی پینٹنگز اور دیگر فنون سے یہ ظاہر کرنے کی

{۴} H. Berr in his introduction to Lewis H. Morgan:
Ancient Society (Chicago C.H. Kerr 1957)

کوشش کرتے ہیں کہ انسان کسی اور سرزمین سے اس سرزمین پر نازل ہوا ہے۔ اہل سائنس چارلس ڈارون اور اس کے نظریات کی طرف رجوع کرتے ہیں جبکہ فنکار اور اہل تخلیق مائیکل اینجلو کے فن پاروں کی مثال پیش کرتے ہیں۔

انسان اور اس کی آفرینش کے متعلق ڈارون اور مائیکل اینجلو دو متضاد تصورات پیش کرتے ہیں' لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ سائنس اور فنون لطیفہ میں سے کوئی ایک دوسرے پر غالب آجائے۔ سائنس کا سہارا شواہد ہیں' جبکہ فن اور اہل فن کا احترام لوگوں کے دلوں میں ہوتا ہے {۵}۔

ڈارون اور دی لیمارک کا خیال تھا کہ انسان حیاتیاتی مظہر ہے اور انسان کی فطرت "حیوانی" ہے۔ سائنس دان کہتے ہیں کہ انسان "ایک ذہین جاندار" ہے جبکہ مذہب کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان کائنات کا مرکز ہے اسی لئے انسان کو "شخصیت" عطا کی گئی ہے۔ "ہم انسان ہیں" کا اعلان ہمیں یہ یاد کراتا ہے کہ ہم گناہ گار ہیں' کمزور ہیں' لیکن اس کے باوجود دیگر مخلوق سے برتر ہیں اور ہماری ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے سینٹ پیٹر کو اسی بات پر تنبیہ کی تھی "تم صرف انسان کے متعلق سوچتے ہو"۔ (خدا کو ترجیح دو)

مادہ پرست ہماری توجہ ہمیشہ اشیاء کے ظاہری پہلو کی طرف مبذول کراتے ہیں اینجلز "ہاتھوں" کے بارے میں لکھتا ہے :

"انسانی ہاتھ نے وہ اعلیٰ ترین شکل اختیار کی جس کے سبب ریلفیلو نے رنگ دار تصاویر بنائیں۔ تھور والڈسن نے مجسمے اور پیگانینی نے موسیقی مرتب کی"۔ {۶}

{۵} Titus Carns Lucretius De rerum Natura Trans. W.H.D. Rouse 3rd ed.) Cambridge MA. Harvard University Press 1937)

حاشیہ (۶) آگے ہے۔

اینجلز روحانی نہیں ' بلکہ حیاتیاتی تسلسل کی ترقی کی بات کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے منظر کشی ایک تکنیکی اور سائنسی عمل نہیں' بلکہ روحانی عمل ہے۔ بیتھیوون نے موسیقی کی دھنیں ترتیب دی تھیں جبکہ وہ بہرا تھا۔ رافیل کی بنائی ہوئی تصاویر اس کی روح کی پیاس اور کرب کو ظاہر کرتی ہیں۔ فنون لطیفہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان صرف حیاتیاتی تسلسل کا نام نہیں ہے بلکہ روحانی پہلو بھی اس کے ساتھ ساتھ ہے اور فنون لطیفہ روح کی نمائندگی کرتے ہیں۔

سائنس نے انسان کی جو تعریف متعین کی ہے وہ آخری تعریف نہیں ہے اور انسان کی جامع ترین تعریف متعین کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔ کسی تصویر کو رنگ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کسی نظم کو حروف نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح کسی مسجد کو اینٹ' لکڑی اور عمارتی سامان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے باوجود مسجد اور فوجی بیرک میں فرق ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آپ گوئٹے کی لکھی ہوئی نظم کے فنی محاسن و معائب (Critical Appreciation) دریافت کرلیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ آپ شاعر اور کلام کی روح کو بھی پالیں۔ آثار قدیمہ' نفسیات اور عمرانیات کے علوم انسان کی صرف ظاہری زندگی کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ یہ انسان کی جامع حقیقت کا محاصرہ کرنے سے قاصر ہیں۔

❑ آئیڈیلزم :

نظریہ ارتقاء یہ ہے کہ اولین دور میں جو انسان ظاہر ہوا وہ جانور کی ترقی یافتہ شکل تھا۔ دور آغاز کا ذکر ہو یا موجودہ زمانے کی بات' ہم دیکھتے ہیں کہ جانوروں کے ریوڑ ہر مقام

---

(۱) Triedrich Engels "The Part Played by Labour in the transition from Ape to man"(London: Lawrence of Wishart 1941).

پر خوراک تلاش کرتے رہتے ہیں اور اس طرح اپنی بقاء کی جدوجہد کرتے ہیں' لیکن انسان ہر دور میں علامتوں' اشاروں' عقائد اور پسند ناپسند میں گھرا رہا ہے۔ اور یوں انسانوں اور جانوروں کے درمیان پایا جانے والا فرق صرف ارتقاء کے درجوں کا فرق شمار نہیں کیا جاسکتا۔

انسان ارتقاء کے ذریعے موجودہ مقام تک پہنچا ہے۔ یہ بات انسان کے مادی وجود اور ظاہری تاریخ تک تو صحیح تسلیم کی جاسکتی ہے۔{۷} لیکن انسان کے اندر کا جو انسان ہے وہ جانور ہونے کے خیال کی نفی کرتا ہے۔ اگر انسان فطرت کی پیداوار ہے تو پھر اس نے فطرت کی مخالفت کیوں شروع کردی ہے؟ انسان کی ذہانت میں ہر آنے والے دور میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے لیکن انسان قربانی' جسمانی لذت اور جدوجہد کو کسی بھی ترقی یافتہ دور میں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

جانوروں کے وجود کا بنیادی اصول افادیت اور کارکردگی ہے لیکن انسان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے۔ کارکردگی کے معاملے میں جانوروں کی حسیں (Senses) زیادہ حساس ہیں۔۔ وقت کے بارے میں جانوروں کو انسانوں سے زیادہ بہتر حس عطا ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر انسانی آواز کی نقل کرنے والا پرندہ مینا (Starlings) غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ قبل خوراک کھانا بند کردیتا ہے۔ شہد کی مکھیاں اپنے روزانہ اوقات کار کی حیران کن حد تک منصوبہ بندی اور پابندی کرتی ہیں۔ اپنی سہولت کے لئے یہ مکھیاں

{۷} فاضل مولف کی بات درست نہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ انسانی جسم مختلف مدارج سے گزرتا ہوا اس حالت کو پہنچا ہے تو ڈارون کی یہ بات سچ ثابت ہوتی ہے کہ کبھی یہ بوزنے کی شکل میں بھی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اس کی جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کے ساتھ کامل صورت میں پیدا کیا گیا۔ قرآن کا یہی دعویٰ ہے کہ انسان کو بہتر سے بہتر طور پر خلق کیا گیا ہے۔ اس کی تخلیق کے سلسلے میں روح اور جسم کی تفریق نہیں ہے (ادارہ)۔

سورج کے رخ کے لحاظ سے زمین پر کچھ علامات مقرر کرلیتی ہیں۔ اگر مطلع ابر آلود بھی ہو تو یہ مکھیاں مخصوص سمت میں سفر کرلیتی ہیں۔ اس طرح دیگر جانوروں اور پرندوں کے تمام گروہ بھی کسی نہ کسی نمایاں خصوصیت کے حامل ہیں۔

اگر جانداروں کی دو قسموں کو صرف ذہانت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو جو گروہ ذہنی طور پر کمزور ہوگا وہ جلد ہی نکال باہر کردیا جائے گا۔ انسان نے اپنی ذہانت کے سبب ہی قوت کی کمی پر قابو پایا ہے' لیکن ذہانت اپنی اصل کے لحاظ سے حیوانی نہیں' بلکہ انسانی خاصہ ہے۔ جانوروں کی ذہانت کے بارے میں بھی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جانور کوئی ناقص سا اوزار بھی تیار نہیں کرسکتا۔ وہ صرف نقل کرتا ہے یا ان اشیاء سے کام لیتا ہے جو موجود ہیں یا جنہیں انسان نے بنایا ہے۔ {۸}

کیلے حاصل کرنے کے لئے بندروں کی نسل چمپنیزی درختوں کی شاخیں استعمال کرتے ہیں یا اپنے شکار پر ریچھ پتھر سے نشانے لگاتا ہے۔ علاوہ ازیں شہد کی مکھیوں' بگلوں اور بندر وغیرہ کے بارے میں معلومات اکٹھی کی گئی ہیں کہ یہ کس طرح اپنی خاص بولی یا اشارے کے ذریعے معلومات آگے منتقل کرتے ہیں۔ {۹} نیویارک کے چڑیا گھر کے ڈائرکٹر ڈاکٹر بلیر نے جانوروں کی ذہانت' اپنی قریب ترین چیز کے استعمال اور حرکات و سکنات کے بارے میں دلچسپ حقائق اکٹھے کیے ہیں۔ ان کے مشاہدے کا حاصل یہ ہے کہ تمام جانور سوچنے اور اپنی جبلت کے مطابق عقل سے کام لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

زبان حیاتیاتی مظہر ہے اور زبان کی ادنیٰ شکل جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ لسانی اصولوں کا سائنسی اور ریاضیاتی بنیادوں پر بھی تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ {۱۰} ذہانت و فطرت اور

{۸} Henri Bergson: Creative Evolution Trans.

rthur Mitchell New York: The Modern Library 1944

{۹} New light on Animal Ways (New York Cromwell 1952)

{۱۰} کچھ مذاہب مثلاً عیسائیت میں خاموش رہنے کا روزہ ہوتا ہے۔

ذہانت و زبان کے درمیان ایک یکسانیت سی پائی جاتی ہے۔ ذہن اور مادہ جس طرح ایک دوسرے کے مددگار ہیں اسی طرح ذہن اور زبان ہیں۔ زبان دماغ کا ہاتھ ہے۔ برگساں نے تو یہ تک کہہ دیا ہے کہ "دماغ کا کام یہ ہے کہ ہماری روحانی زندگی کو اسی چیز تک محدود کردے جو ہمارے لئے سودمند ہے۔{۱۱}

انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو جانوروں' کیڑے مکوڑوں اور دیگر حیوانات میں نہ پائی جاتی ہو۔ شعور' ذہانت' ابلاغ وغیرہ۔ گویا انسان حیوانات کی دنیا سے بھی ایک گونہ تعلق رکھتا ہے۔ لیکن حیوانات کی دنیا میں ایک بھی چیز ایسی نہیں ہے جو معمولی سے معمولی شکل میں بھی مذہب آرٹ' عقائد' اخلاقیات نما ہو ، لیکن یہی چیزیں ہر دور میں انسان کے ساتھ رہی ہیں ۔ جب کوئی جانور شکار کرنے جاتا ہے تو وہ بڑے فہم اور دانائی سے سارا کام سرانجام دیتا ہے۔ کوئی بھی جانور ایک موقع بھی ضائع نہیں جانے دیتا۔

شہد کی مکھیاں اپنے معاشرے کے بیکار عناصر کے ساتھ بڑی بے دردی سے پیش آتی ہیں اور بیکار مکھیوں کو چھتوں سے نکال باہر کرتی ہیں۔ منظم معاشرتی زندگی کی بہترین مثال شہد کی مکھیوں کی زندگی ہے۔ لیکن جانوروں کا کوئی بھی گروہ ایسا نہیں ہے جس میں انسانوں کی طرح انسان پروری' انسان نوازی' کمزوروں' محروموں اور معذوروں کی حفاظت اور شناخت وغیرہ کی صفات پائی جاتی ہوں۔

جانوروں کے لئے چیزوں کا وہی مطلب ہوتا ہے جو وہ نظر آتی ہیں۔ انسانوں کے لئے ہر چیز کا ایک خیالی مفہوم بھی ہوتا ہے اور بعض اوقات یہ مفہوم حقیقی مفہوم سے بھی زیادہ قیمتی بن جاتا ہے۔ ابتدائی دور کے انسان کو آخر کیا مسئلہ درپیش تھا کہ وہ اپنی بقاء کی جنگ میں شریک ہوا؟ ابتدائی دور کے انسان جب شکار کا گوشت حاصل کرنے لئے جاتے

{۱۱} Bergson : Creative Evolution.

تو مختلف قسم کی دعاؤں ' مناجاتوں ' اور رسومات میں مشغول ہو جاتے تھے' اگر کوئی شخص ان رسومات کی خلاف ورزی کرتا تو شکار پر جانے کو منحوس خیال کیا جاتا۔ عورتیں بھی ان رسومات میں شریک ہوتی تھیں {۱۲}۔ شکار میں نوجوانوں کی شمولیت سے قبل پیچیدہ رسومات ادا کی جاتی تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب شکار سے قبل دعا کی جائے گی یا منتر پڑھا جائے گا تو شکار لازماً ان کے قابو میں آجائے گا۔ انسان اس کے ساتھ ساتھ ہر دور میں ایک اور دنیا کی تلاش میں مشغول رہا ہے' چاہے یہ دنیا حقیقی ہو یا تصوراتی۔

ابتدائی دور میں انسانی معاشرے میں بیجوں کے بوانے اور فصل اگانے کے تصور کے ساتھ "انسانی جان کی قربانی" کا تصور بھی ملحق تھا۔ ایچ جی ویلز اپنی "مختصر تاریخ عالم" میں لکھتا ہے :

> "بارہ سے بیس ہزار سال قبل بیجوں کی بوائی کے موسم میں زمین میں بیج ڈالنے سے قبل انسانی جان کو قربان کرتے' تاکہ وہ فصل حاصل کر سکیں۔ یہ قربانی کسی معمولی اور غیر اہم شخص کی نہیں ہوتی تھی' بلکہ اس کے لئے کسی ایسے نوجوان مرد یا دوشیزہ کا انتخاب کیا جاتا تھا۔ جس کی خصوصی نگہداشت میں تربیت ہوئی ہوتی اور جو قابل تحسین حد تک نمایاں ہوتا۔ {۱۳}ان اولیں گروہوں نے بیج بونے اور بروقت فصل کاٹنے کے فن میں عظیم الشان پیش رفت کی"۔ {۱۴}

{۱۲} کلام پاک میں سورہ الانعام کی آیت ۳۸ میں ارشاد ہوا:

ترجمہ : زمین میں چلنے والے کسی جانور اور ہوا میں پروں سے اڑنے والے کسی پرندے کو دیکھ لو۔ یہ سب تمہاری ہی طرح کی انواع ہیں۔

{۱۳} H.G. Wells. A Short History of the World

New York : Pelican Books 1946.

حاشیہ (۱۴) آگے ہے

ایچ اجی ویلز اسی کتاب میں آگے جا کر لکھتا ہے :

"قربانی کا تصور اس دور کے انسانی معاشرے کی تمام رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ ہزاروں انسانوں کی قربانی پیش کی جاتی' انسان کو زندہ کاٹ ڈالا جاتا' اس کے دل کو ہوش ہی میں چیر دیا جاتا۔ سماجی زندگی ہو یا قومی تہوار' ان تمام مواقع پر ایسے ہی کھیل کھیلے جاتے۔ اس زمانے میں پروہت ان کی راہنمائی کرتے"۔{۱۵}

گستاف فلابرٹ اپنی کتاب "سلامبو" میں بیان کرتا ہے :

"اہل کار تھیج بارش کے لئے دعا کرتے تو اپنے بچوں تک کو اپنے معبود "ملاخ" کے دہکتے ہوئے منہ میں دھکیل دیتے"۔ ہو سکتا ہے یہ مثالیں عجیب و غریب محسوس ہوں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آج بھی یہ المیہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں جاری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ توہمات کی وجہ قومیں اور افراد غیر فطری طریقہ کار اختیار کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ خطا انسان کی سرشت میں داخل ہے۔

قربانی کا تصور بلا امتیاز تمام مذاہب میں موجود رہا ہے اس قربانی کی نوعیت کیا رہی ہے عموماً یہ بات غیر واضح اور ناقابل فہم رہی ہے۔ قربانی کا تصور اس چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ایک اور دنیا بھی موجود ہے۔ قربانی کا تصور انسان اور جانور کے درمیان حد فاصل رہا ہے۔ قربانی کا تصور ضرورت' مفاد اور فائدے سے ہٹ کر ہے۔ مفاد کی تلاش حیوانی جذبہ ہے جبکہ قربانی

{۱۴} H.G. Wells A Short History of the World

New York : Pelican Books 1946.

{۱۵} "DO"

انسانیت کی علامت ہے۔ (اپنے معبود کے سامنے سرخروئی کے حصول کے لئے) اس دور کے لوگ اپنے ناک' کان' انگلیاں اور دیگر اعضاء کاٹ ڈالتے اور اپنی ان حرکتوں کو مختلف نام دیتے تھے۔ ویلز لکھتا ہے :

"جانور یہ کام نہیں کرتے۔ {۱۶}اس کے مقابلے میں لومڑ کو لیجئے' اگر اس کو جال میں قید کردیا جائے تو وہ اپنی ٹانگ پر کاٹ لیتا ہے (اور یہ فعل قربانی کے جذبے کے تابع نہیں ہوتا)۔ {۱۷}یہ واقعات ارتقاء کی نفی کرتے ہیں اور ان سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ارتقاء' ترقی' معکوس کا نام ہے"۔

دور اول کے انسان کے بارے میں متضاد اور پیچیدہ خیالات ظاہر کئے گئے' لیکن یہ بھی مانا گیا ہے کہ انسان تاریکی میں پیدا نہیں ہوا اور یہ کہ انسان آغاز ہی سے اخلاقی ذمہ داریوں کا بوجھ محسوس کرتا رہا ہے۔

سائنس دان یہ واضح کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ وہ اولین جاندار جس کو انسان کے مشابہ قرار دیا جاتا ہے اور لنگور کے مشابہ بھی قرار دیا جاتا ہے جو درختوں سے پھل توڑنے کے لئے اس کی شاخ کو چھڑی کے طور پر استعمال کرتا تھا اور اپنے ہم جنسوں تک پیغام پہنچانے کے لئے مخصوص آوازیں نکالتا تھا آیا وہ انسان ہی تھا یا لنگور تھا؟ اگر اس

{۱۶} جانور بھوکا ہو تو خطرناک ہوتا ہے۔ انسان کا پیٹ بھر جائے تو وہ مزید خطرناک ہو جاتا ہے۔

{۱۷} قربانی اسلام میں عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن اس کی بنیاد کسی جاندار کی جان لینے پر نہیں' بلکہ اپنے تمام جذبوں اور تمام خواہشات سے پاک ہوکر اپنے آپ کو اللہ کے احکام کی بجا آوری کے لئے وقف کردینے کے فیصلے پر ہے۔ جانور کو قربان کرنا اس کی علامت ہے۔ تاریخی طور پر اس کا آغاز حضرت ابراہیم خلیل اللہ (ع) اور حضرت اسماعیل ذبیح اللہ (ع) کے واقعے سے ہوتا ہے جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔ اور قرآن ہی میں یہ بات بتادی گئی ہے کہ : ان جانوروں کو ہم نے اس طرح تمہارے لئے مسخر کیا ہے۔ تاکہ تم شکر ادا کرو۔ نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں' نہ خون' مگر اسے تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے"۔ (الحج۔ ۳۷) { ادارہ }

سلسلے میں کوئی ٹھوس ثبوت فراہم ہو جائے تو پھر دیگر اعتراضات بھی رفع ہو جائیں گے۔
انسان اور حیوان کے درمیان فیصلہ کن چیز ذہن یا جسمانی ساخت کا نہیں' بلکہ روحانی فرق ہے اور مذہبی' اخلاقی نیز جمالیاتی پہلو روح کے ساتھ ہی وابستہ ہیں۔ انسان کے ظہور کو اس وقت سے شمار نہیں کیا جانا چاہیے جب سے اس نے سیدھا چلنا شروع کیا تھا یا جب اس کے ذہن اور نطق اور ہاتھوں نے کام کرنا شروع کیا تھا' بلکہ اس وقت سے شمار کیا جانا چاہیے' جب اس نے عبادات کا آغاز کیا۔ دور اول کے انسان نے پندرہ ہزار سال قبل پھولوں اور جانوروں اور پرندوں کے حسن کو پرکھنے کا آغاز کیا اور اپنے غاروں کی دیواروں پر ان کی تصاویر بنائیں اور پتھروں پر نقش (Engrave) کیا۔ اس دور کا انسان موجودہ دور کے انسان سے زیادہ جمال پرست محسوس ہوتا ہے کیونکہ آج کا انسان لذت پرستی کی تلاش میں جمالیات کے تمام احساسات کو فراموش کر چکا ہے۔ بہتر سے بہتر کی تلاش' حسیات سے محرومی اور جذبات کی کمی نے اس کو گویا حس لطیف ہی سے محروم کر دیا ہے۔

اپنی کتاب "پہلا قانون" میں اٹیکنسن لکھتا ہے کہ :

"دنیا بھر میں پائے جانے والے لوگوں میں مختلف چیزیں ممنوع تھیں۔ تاہم دیکھنے' چھونے اور برائی سے پاک رہنے کی پابندیاں ہر جگہ پائی جاتی رہی ہیں۔ اس طرح پابندیوں کا ایک مکمل نظام وضع ہوا اور اس نے بعد ازاں حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی شکل اختیار کر لی"۔

انسان فطرت کے ساتھ جو رویہ اختیار کرتا ہے وہ "اجنبی رویہ" ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ انسان فطرت کی اولاد نہیں ہے۔ انسانوں کے اندر بنیادی طور پر "خوف" کا جذبہ پایا جاتا ہے' لیکن یہ جانوروں کے "حیاتیاتی خوف" سے قطعاً مختلف ہے۔ انسان کے اندر پایا جانے والا خوف' کائنات کے اسرار" کا خوف ہے۔ مارگن ہیریگر نے اسے "انسانی وجود کا دائمی عنصر" قرار دیا ہے۔ اس خوف کی تعریف میں حیرت' تجسس' بے حسی اور لاپروائی بھی آجاتے ہیں اور یہی احساسات تہذیب و تمدن اور فنون لطیفہ کے تحریکی عناصر ہیں۔

اگر انسان فطرت کی پیداوار اور اس کی اولاد ہوتا تو اس کے متعلق کوئی بھی چیز ناپاک اور غیر خالص نہ ہوتی' جس دنیا سے ہم متعارف ہیں اس کا ایک ایک جزو اس سے متصادم ہے۔ انسان ہمیشہ اپنے مذہب کے ذریعے اپنے خوف اور اپنی ناامیدی کا اظہار کرتا رہا ہے۔ وہ اس سوال کے جواب کی تلاش میں ہے کہ سکون اور نجات کہاں سے ملے گی۔ ضمیر اور مفاد کے درمیان مستقل کشمکش' خوش بختی اور بد بختی' اچھائی اور برائی کا احساس اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات منطق کے ذریعے تو فراہم نہیں کیے جاسکتے اور ہر شخص ڈاردن کی طرح مستقل نظریہ تو اختراع نہیں کر سکتا۔ جانوروں کی انتہائی ترقی یافتہ انواع بھی موجود ہیں۔ لیکن ان کے اندر ممنوع اور غیر ممنوع کا ہلکا سا احساس بھی نہیں پایا جاتا۔ لیکن انسان اس فرق سے آگاہ ہے۔ اسی طرح مذہب اور فنون لطیفہ صرف ان علاقوں میں پائے گئے ہیں جہاں انسانوں نے بودوباش اختیار کی۔ تاریخی لحاظ سے سائنس' مذہب اور فنون لطیفہ کی نسبت جدید ہے {۱۸}اور ان کی مدد سے انسانی حیات کے آغاز کے بارے میں بہت سے سوالوں کے جواب مل سکتے ہیں۔

مادہ پرستوں کے نزدیک' انسانیت کی تاریخ بڑھتی ہوئی لامذہبیت کے عمل کے ریکارڈ کا نام ہے۔ لیکن آج تک کوئی بھی اس کی وضاحت نہیں کرسکا کہ ابتدائی دور کے انسان ہی کی زندگی میں عقائد' منکرات' اسرار اور تلاش کیوں پائی جاتی تھی اور انسان

{۱۸} پلوٹارچ کہتا ہے : "ہمیں ایسے شہر ملے ہیں جو بادشاہوں' محلوں' تہذیب کے نمونوں ادب اور تھیٹر سے محروم ہیں۔ لیکن کوئی شہر ایسا نہیں ملا' جہاں عبادت گاہوں اور معبدوں کے آثار نہ ہوں

Plutarchis Morals Boston Brawn & Co. 1983.

مذہب کے بغیر کوئی معاشرہ نہیں رہا۔

Henri Bergson : Moral et de la Religion.

اپنے اردگرد پائے جانے والے پتھروں' ستاروں' دریاؤں وغیرہ سے اپنی زندگی اور اپنا وجود کیوں منسوب کرتا رہا ہے{۱۹}؟

آج کا مہذب انسان زندگی کو میکانکی اور غیر نامیاتی بنانے پر کیوں تلا ہوا ہے؟ جبکہ جو خوف ہزاروں سال پہلے انسانوں کو لاحق تھے وہی ہم کو لاحق ہیں۔ آخر کیوں ہم ان خوفوں اور توہمات سے نجات حاصل نہیں کر سکے؟

آسمان کی طرف نگاہیں اٹھانے کا عمل انسان کے ساتھ خاص ہے۔ ہزاروں سال قبل کا انسان اس حالت میں پایا گیا کہ اس کی عقلی توجیہہ کرنا تو ممکن نہیں ہے' تاہم یہ تعبیر کی جا سکتی ہے کہ انسان کے اندر کا انسان اس سے کہتا ہے کہ کوئی چیز آسمان سے اترتی ہے اس کا خیال کرو کیونکہ آسمان سے اترنے والی چیز (وحی) عمل ارتقاء کے نتیجے میں ظہور پذیر نہیں ہوئی اس لئے نظریہ ارتقاء اسے سمجھنے میں ناکام رہا ہے۔

فرانس میں پتھر کے دور کے انسان کے بارے میں تصاویر دیکھ کر ہنری سملے نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دور اول کے انسان کی نفسیاتی ترکیب اور دور جدید کے انسان کی نفسیاتی ترکیب میں بہت کم فرق ہے۔{۲۰} ستر ہزار سال پہلے کے انسان کا سر بھی "الہیات" سے اسی طرح چکرانے لگتا تھا جس طرح دور جدید کا انسان بیماری کا شکار ہو جاتا ہے"۔{۲۱}

مفروضہ "حیوانی دور" میں انسان کے ظہور سے قبل کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے عقائد یا اخلاقیات کا خفیف سا اشارہ ملتا ہو۔ جانوروں کا ظہور ذہنی اور جسمانی تبدیلی' انسان کا ظہور اور بعد ازاں نطشے کے پیش کردہ 'انسان اعلیٰ' (Superman) کا ظہور کچھ

{۱۹} Soloman Reinach Cultes,Mythes et. religions,Paris 1901.

{۲۰} U.A. Frankfurth From Myth to Philosophy. Serbocroatian trans. (Subotica – Beograd: Minerva 1967).

{۲۱} Simle'n Speech at 1076 Archeological Congress in Nice.

ناممکن سا محسوس ہوتا ہے۔ نٹشے کے پیش کردہ انسان اعلیٰ کے ظہور کے پس منظر میں ڈارون کا نظریہ واضح طور پر کارفرما نظر آتا ہے۔ نظریہ ارتقاء انسانی تفکر سے باہر کی چیز ہے۔ {۲۲} نظریہ ارتقاء نے جس وجود کو بطور انسان متعارف کرایا ہے وہ انسان نہیں' انسان نما ہے۔ {۲۳} روسی شاعروز نیمنیس کی نے اسی لئے کہا ہے : "مستقبل کے کمپیوٹر ہر وہ کام کر سکیں گے جو انسان کرتا ہے سوائے مذہبی ہونے اور شاعر ہونے کے {۲۴}۔

جانوروں کو کسی فعل کے شیطانی یا رحمانی ہونے کا علم نہیں ہوتا۔ انھیں خوبصورتی کا احساس نہیں ہوتا۔ بدصورتی کا احساس نہیں ہوتا۔ پہلے کچھ سائنس دان کہتے تھے کہ پچھلے زمانوں میں بندر تصاویر بنا سکتے تھے' لیکن اب اس خیال کی تردید ہو چکی ہے تاہم یہ بات بہرحال ثابت ہو گئی ہے کہ بندر انسانوں کی نقالی بڑی مہارت سے کر سکتے ہیں۔ 'بندروں کے فن تصویر کشی' کا وجود کبھی بھی نہیں رہا {۲۵}۔

اس کے برعکس' غاروں میں رہنے والے انسان آغاز سے ہی نقش بنانے اور پتھر تراشنے کے فن سے آشنا تھے۔ ان کی تصاویر' صحارا کے غاروں' التمیرا' ہسپانیہ' لیکاس' فرانس اور حال ہی میں ماشکا' پولینڈ میں دریافت ہوئی ہیں۔ ان میں سے بہت سی تصاویر کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تیس ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی ہیں۔

{۲۲} Nietzsche Thus Spoke Zarathustra,Surbo Croatian tra nslation (zagreb Mladost 1976)

{۲۳} جس طرح نٹشے نے Superman کا تصور پیش کیا ہے۔ انگریزی ادیب مارلو نے "Dr. Faustus" کو اپنے ڈرامے میں پیش کیا ہے۔

{۲۴} خدا کے باغی ادب نے ایسے ہی "اعلیٰ کردار" تشکیل دیے ہیں جو اخلاقی حس سے ہمیشہ محروم رہے۔

{۲۵} بکن نے اس موضوع پر تحقیق کی ہے۔

روسی ماہرین آثار قدیمہ نے چند سال قبل آلات موسیقی کا ایک جوڑا دریافت کیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ آلہ بیس ہزار سال قبل یوکرین کے قریب چرنگوو میں بنایا گیا تھا۔

جسم کو ڈھانپنے' اس کی حفاظت کرنے' اس کو سجانے' سنوارنے اور اس کے تحفظ کا جذبہ انسان ہی کی طرح قدیم ہے۔ لباس جسم کی حفاظت بھی کرتا ہے اور اس کی زینت بھی ہے۔

اپنے جسم کو ڈھانپنے اور اس کی حفاظت کا جذبہ جتنا قدیم ہے اتنی ہی اس کی یہ خواہش قدیم ہے کہ اپنے آپ کو بنایا' سنوارا اور سجایا جائے۔ زمانہ قبل از تاریخ سے موجودہ زمانے تک یہی حال ہے۔ لباس جسم کی حفاظت ہی نہیں کرتا' بلکہ مختلف لباس اس دور کی نشاندہی بھی کرتے ہیں جس میں ہم رہتے ہیں اور اس گروہ کی بھی جس سے ہمارا تعلق ہوتا ہے۔ ہمارا لباس ایک تصویر بن جاتا ہے۔ شاعری کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

جانوروں کی جلد اور پرندوں کے پر یقیناً خوبصورت ہوتے ہیں لیکن اس حسن کی پشت پر ایک مقصد ہمیشہ کارفرما ہوتا ہے۔ ابتدائی دور کے انسان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اولین مجسمہ ایک انسان کا تھا۔ غلط مذہبی جذبہ جس کی بنیاد میں ٹیڑھ واقع ہوئی ان دیوی' دیوتاؤں کے نرالے مجسمے بنائے جانے کا باعث بنا اور ایسے ہی نقالی نقوش اوشانا میکسکو اور آئیوری کوسٹ وغیرہ میں بھی ملے ہیں۔

نقش سازی و بت تراشی سے متعلق تمام فنون بنیادی طور پر غیر اسلامی ہیں۔ دیگر مذاہب کے اندر فنون لطیفہ کی اثرپذیری کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں زمانہ قبل از تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑے گا اور دیکھنا ہوگا کہ اخلاقیات کے ساتھ ساتھ انسانی جذبوں کو تسکین دینے کا عمل کس طرح جاری رہا ہے۔

انسانوں اور جانوروں میں عدم مشابہت کا سراغ لگانا ہو تو دیکھ لیجئے کہ انسان نے ہر دور میں بغاوت کی ہے' لیکن ایک جانور بھی اس طریقہ کار سے بغاوت نہیں کرتا جو جانوروں کے لئے مقرر ہے۔ یعنی وہ بہرحال جبلت کے تابع رہتا ہے۔ انحراف یا بغاوت صرف

انسان ہی کرتا ہے اور انسان ہی وہ واحد جاندار ہے جس نے طے شدہ راستے کے خلاف اپنے لئے راہیں نکالی ہیں۔ حیوان مطلق کے مقابلے میں حیوان ناطق یعنی انسان تاریخ کے ہر دور میں اپنی عملی زندگی میں آزاد اور متحرک رہا ہے۔ اس کے انقلابی عمل کے آثار اعلی ترقی یافتہ تہذیبوں میں ملتے ہیں۔ جہاں کہیں وجود کی بقاء کے لئے معلوم ضابطوں سے انحراف کی طرف ضرورت محسوس ہوئی' مصنوعی طریقے اختیار کیے گئے۔ مثلاً تنظیم' اجتماعیت' یکسانیت' یکساں لباس' فرد کے اوپر معاشرے کی حکمرانی وغیرہ {۲۶} تمام باتیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔ {۲۷}

جوہن ہزنگا نے یہ نظریہ پیش کیا کہ جانور بھی کھیلتے ہیں۔ کھیل کے ذریعے وہ اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہیں اور یہ کھیل حیاتیاتی (جنسی) ضرورت پر مبنی ہوتے ہیں' انسان جو کھیل کھیلتا ہے وہ آزادنہ اور کسی شرط کے بغیر ہوتے ہیں' انسان کے کھیل میں شعور' مقصدیت اور تفریح شامل ہوتی ہے۔

ایک خاص قسم کا کھیل وہ ہے جس کا نام POTLATCH ہے اور تمام ابتدائی تمدنوں میں کھیلا جاتا رہا ہے۔ آج بظاہر تو یہ کھیل غیر عقلی اور غیر سودمند محسوس ہوتا ہے ۔ لیکن ہزنگا نے اپنی کتاب میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس کی افادیت ثابت کی ہے۔ وہ ایک خاص قسم کی رسم کا ذکر کرتا ہے جس میں ہندی ریڈ انڈین کو اکت قبائل بہت بڑی تعداد میں ایک دوسرے کو تحائف دیا کرتے ہیں اور جواب میں دوسرا قبیلہ ایک مخصوص مدت میں اس قبیلے کو ایک رسم میں وہ تحائف لوٹا دیتا ہے۔ تحفے دینے

{۲۶} Albert Camus L' Homme re' Volte (paris : Grallimard 1951)

{۲۷} Johan Huizinga Homo Ludens: A study of the play element in culture (Boston : Beacon Press 1955)

کی اس رسم میں پورا قبیلہ شامل ہوتا ہے۔ اس کے اثرات ان کے قانون' ان کے نظام اور فنون لطیفہ پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ اس کھیل میں نہ صرف دوسروں کو تحائف دیئے جاتے ہیں۔ بلکہ تحائف کو ضائع بھی کردیا جاتا ہے یہ دکھانے کے لئے کہ ان کے بغیر بھی رہا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے کاموں سے عموماً مقابلے کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ اگر قبیلے کا سردار تانبے کے بنے ہوئے ایک برتن کو توڑ دیتا ہے یا کمبلوں کے بہت بڑے ڈھیر کو آگ لگا دیتا ہے یا اپنی چھڑی توڑ دیتا ہے تو اس کے مخالف پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ بھی کسی قیمتی چیز یا اس چیز کے ہم پلہ چیز کو ضائع کردے۔ اس قسم کے مقابلے جس میں اپنی ہی چیز کو ضائع کیا جاتا ہے تمام دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ مار سیل ماس نے ملائی لوگوں میں اس قسم کے مقابلوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اپنی کتاب Essai Sur le Pon میں وہ ثابت کرتا ہے کہ اسی قسم کے مقابلے قدیم یونان' روم اور قدیم جرمن تہذیب کے حامل ممالک میں بھی ہوتے تھے۔ گرینیٹ نے تحفہ دینے کا چینی تہذیب میں بھی تذکرہ کیا ہے۔

یہی روایت قدیم عربوں میں "معاقرہ" کے نام سے پائی جاتی تھی اور ماس کہتا ہے کہ عظیم ہندوستانی داستان مہابھارت بھی ایک عظیم الشان مقابلے کی تاریخ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میرے علم کے مطابق ماہرین لغت Potlatch کا تعلق جادو اور دیو مالائی قصوں سے جوڑتے ہیں۔ اس میں مادی فوائد کا تذکرہ نہیں ہے۔{۲۸} اشیاء کو ضائع کرنا' ان سے لاتعلقی ظاہر کرنا' اصول کے اوپر اشیاء کو قربان کردینا چاہے مصنوعی طور پر ہی کیوں نہ ہو یہ سب دور جہالت کی انسانی خصوصیات ہیں۔ یہ خاصہ کبھی بھی جانوروں میں نہیں پایا جاسکتا۔

کچھ مدت تک انسان کی ابتداء کے بارے میں ڈارون کا نظریہ حتمی سمجھا جاتا رہا جس

{۲۸} Maracel Granet, Chinese Civilization

(London: K. Paul Trench Trubner & Co. Ltd. 1930)

طرح کائنات کے بارے میں نیوٹن کا نظریہ (COSMOS) حتمی مان لیا گیا تھا' لیکن جس طرح نیوٹن کا میکانکی نظریہ قبول عام حاصل نہ کرسکا کیونکہ یہ کائنات کے کچھ مظاہر کی وضاحت کرنے میں ناکام رہا تھا' اسی طرح ڈارون کے نظریے پر بھی عرصہ دراز سے نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ نظریہ ارتقاء اس چیز کی وضاحت کرنے میں ناکام رہا ہے کہ اولین دور میں مذہب کے آثار کیوں نظر آتے ہیں اور آج تک اس کے باقی رہنے کی کیا وجہ ہے؟ آخر کیا وجہ ہے کہ معاشی و اقتصادی طور پر زندگی گزارنے کے باوجود انسان نفسیاتی طور پر غیر مطمئن ہے۔ تعلیم اور زندگی کے اعلیٰ ترین معیار کے باوجود خودکشی اور ذہنی امراض میں اضافہ کیوں ہو رہا ہے۔ آج ترقی کے مفہوم میں انسانیت کی ترقی کیوں شامل نہیں ہے؟ ڈارون اور نیوٹن کے واضح تصورات کو قبول کرلینے کے بعد انسانی دماغ ان کا رد کرتے ہوئے جھجکتا ہے۔

نیوٹن کے خیال میں دنیا ایک مستحکم' منطقی اور مسلسل عمل ہے اور ڈارون کا کہنا ہے کہ انسان سادہ ہے' یک سمتی ہے۔ وہ بقاء کی جدوجہد کرتا ہے اور ایک متحرک دنیا میں اپنی ضروریات' خواہشات اور مقاصد کو پورا کرتا رہتا ہے۔

آئن سٹائن نے نیوٹن کے تصور کی نفی کی' لیکن ڈارون نے انسان کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے تمدن و ثقافت کی ناکامی نے اس کی ناکامی پر مہر لگا دی ہے۔ انسان غیر مطمئن ہے' پریشان ہے' شکوک و شبہات میں مبتلا اور خوفزدہ ہے۔ وہ مستقبل سے خوفزدہ ہے۔ آئن سٹائن کے الفاظ میں انسان "خمار" ہے۔

فلسفہ جو انسان کے بارے میں ایک طویل عرصے تک ڈارون کی وضع کردہ لائن کو اختیار کیے رہا ہے' اب آئن سٹائن کے نظریے کو قبول کرکے اس کے تلپٹ ہونے کا منتظر ہے۔ ڈارون کے نظریے کے برعکس جو تازہ ترین نظریہ قائم کیا گیا ہے اس کے اور قدیم نظریے کے درمیان وہی تعلق ہوگا جو آئن سٹائن کی دنیا اور نیوٹن کی دنیا میں ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ آزمائش کے ذریعے ہم بلند ہوتے ہیں اور تفریح کے ذریعے پستی میں

آجاتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم جانوروں سے مختلف ہیں۔ نہ تو انسان کو ڈارون کے خیالات کے مطابق تراشا گیا ہے اور نہ کائنات کو نیوٹن کے خیالات ہی کے مطابق بنایا گیا ہے۔

❑ دنیا کی دو رخی حیثیت :

کیا ہم اس قابل ہیں یا مستقبل میں اس قابل ہو سکیں گے کہ قابل اطمینان زندگی بسر کر سکیں؟ اس کا جواب ہے "ہاں" اگر ہم زندگی کو سمجھ سکیں۔ اب دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم زندگی کو سمجھ سکتے ہیں۔
حیاتیات "زندگی کے جوہر" کا علم ہے یہ تو زندگی کے مظہر کے سائنسی مطالعے کا نام ہے۔ گویا اس مطالعے کا حاصل زندگی ہے۔

انسان اور حیوان کے درمیان ہم نے جو عدم موافقت تلاش کی ہے وہی ہمیں مادے اور زندگی کے درمیان بھی مل جاتی ہے' لیکن یہاں اس کا درجہ حرارت نسبتاً کم ہو جاتا ہے کیونکہ یہاں انسان مادے کے مقابلے میں ہے۔ ایک طرف تو ہم مقدار، یکسانیت' اتفاقات' میکانیت اور تکرار دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اصلیت' معیار' نشوونما' تسلسل اور حیات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ زندگی مادے کے تسلسل اور اس کے ارتقاء کا نام نہیں ہے چاہے اس کو فلسفیانہ انداز میں لیا جائے یا میکانکی انداز میں اور نہ زندگی مادے کی انتہائی منظم اور پیچیدہ ترین شکل ہی ہے۔ اگر زندگی اور مادے پر تفصیلی غور و فکر کیا جائے اور مادے کی تعریفیں متعین کی جائیں تو معلوم ہو گا کہ زندگی مادے کی ہر ایک تعریف سے جدا ہے۔ زندگی قطعی طور پر مادے کے برعکس ہے۔

ماہرین حیاتیات کی رائے میں زندگی کی تعریف میں فشار کائنات (Entropy) سب سے پیچیدہ مقام ہے۔ تمام قوانین انتشار کی طرف جاتے ہیں جس کا مطلب کائنات کی

عدم تنظیم ہے۔ اس کے برعکس ایک جاندار کی بنیادی صفت "عدم انتشار" ہے' یعنی اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ سادہ سے پیچیدہ کی تخلیق کرتا ہے۔ بدنظمی سے منظم (چاہے مختصر کیوں نہ ہو) اور اعلیٰ درجے کی توانائی کا نظام قائم کرتا ہے۔ ہر مادی نظام اعلیٰ درجے کے انتشار کی طرف بڑھتا ہے اور ہر زندہ نظام مخالف سمت میں چلتا ہے' کیونکہ زندگی میکانکی قوانین کے خلاف ایک تحریک "کا نام ہے"۔

روسی سائنس دان کزن جیتزوف جس کا مخصوص شعبہ پیچیدہ الیکٹرانک کمپیوٹر اور انسانی نظام شرید کا تقابل (Cybernetics) ہے کہتا ہے :{۲۹}

"میں ماہر حیاتیات نہیں ہوں' اس لئے اس میدان میں جو لوگ سب سے آگے ہیں میں ان کی آراء درج کرنا چاہونگا۔ زندگی کی وضاحت کرنے میں ناکامی علم حیاتیات کی ایک ایسی حقیقت ہے جس پر خاموشی سے نہیں گزرا جاسکتا۔ میں یہ بھی گذارش کروں گا کہ یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے"۔

۱۹۵۰ء میں آندرے جارج نے حیاتیاتی علوم کے ماہر ڈاکٹروں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ زندگی کیا ہے؟ اس سوال سے جتنے جوابات بھی اسے ملے وہ غیر حتمی تھے اگرچہ انہیں احتیاط کے ساتھ درج کیا گیا تھا۔ مثال کے طور پر ہم پائیر لیپس اور جین روستاند کے جوابات درج کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں :

"اس راز پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ کہ ہماری کم علمی زندگی کے بارے میں ہماری ہر وضاحت کو کیوں غیرواضح بنادیتی ہے{۳۰}۔ ابھی تک ہم معلوم

{۲۹} Boris G. KuznJetzov Einstie Trans Vladimir Talmy New York: Phaesra 1970

{۳۰} Pierre lapin n.p.d. (no publication date).

نہیں کرسکے کہ زندگی کیا ہے' بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہم زندگی کے مظہر اور عمل کے بارے میں مکمل اور صحیح ترین تعریف متعین کرنے میں ناکام رہے ہیں" {۳۱}۔

کوئی بھی عنصر اپنے سادہ ترین اجزاء میں دوبارہ منتشر نہیں ہوسکتا اور یہ چیز اس قدر تعجب خیز ہے کہ ابتدائی زمانوں ہی سے لوگ یہ بات مانتے تھے کہ ایک خاص غیر مادی مافوق الفطرت چیز اس میں حلول کر گئی ہے آخر کس طریقے سے کوئی وجود خود کو زوال پذیر ہونے کو روکتا ہے؟...... کائنات کا ہر عمل حادثہ اور تبدیلی فشار کی صلاحیت بھی پیدا کر لیتا ہے...... جاندار اس عمل کو باقی رکھ سکتا ہے' یعنی خود باقی رہ سکتا ہے۔ گویا کہ عدم فشار کی صلاحیت کے سبب جاندار باقی رہتا ہے۔

فرانسیسی ماہرین قدیم حیات ٹلہارڈ ڈی شارڈن کہتا ہے :

"بہت سی رکاوٹوں کے باوجود بڑے مالیکیولوں سے کئی خلیوں پر مبنی جاندار بننے کا سلسلہ بلا انقطاع جاری و ساری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تذبذب' شعور اور تنظیم وجود میں آتے ہیں' یہاں سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ دنیا کی حرکت اور زندگی کی حالتوں کے پیچیدہ تر ہونے کے سفر میں کوئی تناسب ہے یا نہیں ہے؟ کیونکہ اسکی بدولت زندگی پیچیدہ تر اور منظم تر ہوتی چلی جارہی ہے اس سوال کے جواب کی فراہمی سے کائنات کا راز معلوم کیا جاسکتا ہے"

"خلیات کی فطری صلاحیت اعضاء کو پیدا کرتی ہے۔ نیز حشرات کچھ دیگر اشیاء کا مظاہرہ کرتے ہیں۔یہ وہ حقیقتیں ہیں جن کا ہم نے باضابطہ مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن پھر بھی اپنے موجودہ مطالعے کے سبب ان کی وضاحت کرنے میں ہم ناکام رہے ہیں" {۳۲}۔

{۳۱} Jean Rostand, Life the Great Adventure (New York Scribner 1956).

حاشیہ (۳۲) آگے ہے

کارل جیسپرز اس عمل کے بارے میں اپنی کتاب (General Psychopathology) میں لکھتا ہے :

"نفسیاتی معاملات اس طریقے سے ظاہر ہوتے ہیں کہ وہ بالکل نئے محسوس ہوتے ہیں اور ایسے طریقے سے ظہور میں آتے ہیں کہ ان کو آسانی سے سمجھا نہیں جاسکتا۔ یہ عوامل ایک ایک کرکے ظاہر ہوتے ہیں یعنی ایک دوسرے کی وجہ سے ظاہر نہیں ہوتے۔ ایک عام انسان کے نفسیاتی ارتقاء میں چاہے ارتقاء معتدل ہو یا غیر معتدل ' بہت سی ایسی چیزیں ابھرتی ہیں جن کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ نفس کے ظہور کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل ہے۔ نفسیاتی عوامل کو بیرونی طور پر نہیں سمجھا جاسکتا' جس طرح فطرت کے عوامل کو اندرونی طور پر نہیں سمجھا جاسکتا" {۳۳}۔

اپنی کتاب میں جیسپرز سمجھنے اور وضاحت کرنے پر روشنی ڈالتا ہے یعنی فطری سائنس میں سبب اور اثر کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ اپنی تحقیق کا یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ "یہاں ہم اپنے علم کے ابتدائی ذرائع کو زیر بحث لا رہے ہیں جو کہ ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں {۳۴}۔

فرانسیسی ماہر فزکس لوئس ڈی بروگلی جسے ادب کا اعلیٰ ترین انعام نوبل لارئیٹ ملا ہے اس نے ۱۹۲۹ء میں کہا تھا : ہم کیمسٹری اور فزکس کے وجود کے موجودہ علوم کی بدولت زندگی کی وضاحت نہیں کرسکتے" {۳۵}۔

{۳۲} Alexis Carrel, Man the unknown

(New York : Harper & Brothers 1939).

ہیگل کہتا ہے: "مادہ صرف باہر ہے' روح کا مرکز اندر ہی ہے'

{۳۳} George W.F. Hegel Samtliche werke ed. Herman Glockner

(Stuggart F. Frommann 1961). حاشیہ (۳۴) اور (۳۵) آگے ہے

سوئٹزرلینڈ کا ماہر حیاتیات گائیٹ اشارہ کرتا ہے کہ :

"زندگی کے طبعی اور کیمیائی تعلق میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ماہرین فزکس کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہم ماہرین حیاتیات نے کیمیائی اور طبعی فارمولوں کے ذریعے زندگی کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ وضاحت ہم سے پوری طرح نہیں ہو سکی ہے۔ یہ زندگی بہت پیچیدہ ہے اور یہ ایک منظم شکل اختیار کر چکی ہے اور یہ صرف ایک مرتبہ معرض وجود میں نہیں آئی' بلکہ اربوں سالوں میں کروڑوں مرتبہ مختلف پہلو اختیار کر چکی ہے۔ ہمیں تو بس ایک تعمیری صلاحیت ملی ہے۔ جس کو کیمسٹری اور فزکس کی اصطلاح میں بیان نہیں کیا جا سکتا"{۳۶}۔

اندرے لی وف جو کہ فرانسیسی ماہر حیاتیات ہے اور اسے ۱۹۶۵ء میں نوبل انعام مل چکا ہے اسے بیکٹیریا اور وائرس پر جینیاتی میکانزم پر کام کرنے کی وجہ سے شہرت ملی ہے' وہ کہتا ہے :

"زندگی کو ایک صلاحیت' ایک تشکیل یا ایک وجود کی حالت قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایک جاندار وجود باہمی طور پر انحصار کرنے والے نظاموں اور اعمال کا

{۳۴} Karl Jaspers' General Psychopathology trans. J. Hoenig and Marian W. Chicago Press 1963).

{۳۵} Louis de Broglie "Address delivered at stockholm December 12, 1929 on receiving the Nobel Prize (Matter and light. The New Physics trans. W.H. Johnston) (New York : Dover Publications 1946) P. 165-179).

{۳۶} Guyenot n. p.d..

آزاد مجموعہ ہے جو کہ (تقسیم در تقسیم سے) پیدا کرنے کے قابل ہے...... عام طور پر کہا جاتا رہا ہے کہ نامیاتی مادوں اور زندہ مادے کے درمیان وائرس ایک رابطہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زندہ مادے کا وجود ہی نہیں ہے۔ ایک خلیے کے عناصر مثلاً البومین، انزائم یا نیوکلیک ایسڈ زندہ مادے نہیں ہیں۔ صرف ایک جاندار زندہ ہے اور یہ جاندار اپنے تمام اجزاء کی نسبت زیادہ اہم ہے۔ ہم نے وائرس کے نیوکلیک ایسڈ کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کو بنیاد بنا کر ہم زندگی کا تجزیہ نہیں کر سکتے کیونکہ ان سب میں وائرس کا دخل ہے جو کہ ایک جینیاتی مظہر ہے اور نیوکلیوٹائیڈ سے متعلق ہے اور یہ عمل میں شریک ہوتا ہے ...... کبھی کبھار زندگی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ البومین کے کچھ حصوں یا نیوکلیک ایسڈ کو تیار کر لیا جائے۔ لیکن ابھی تک یہ ممکن نہیں ہوا ہے کہ کسی بے جان نظام یا وجود کو زندگی بخشی جا سکے...... حتیٰ کہ صرف ایک بیکٹیریا کو پیدا کرنا بھی ہماری پہنچ سے باہر ہے"{۳۷}۔

آئیوان پالوف معروف روسی ماہر نفسیات اور سائنس دان ہے وہ بھی اسی قسم کے شکوک و شبہات کا اظہار کرتا ہے:

"ہزاروں سال سے انسانیت نفسیاتی حوادث کو تلاش کرتی رہی ہے۔ روحانی زندگی کا عمل اور انسانی روح، یہ وہ سوالات ہیں جن پر ماہرین نفسیات بڑی شدومد سے کام کر رہے ہیں، بلکہ ادب اور فنون لطیفہ کو بھی زیر بحث لا رہے ہیں، کیونکہ ادب اور فنون لطیفہ تو نفسیاتی زندگی کا مظہر ہیں۔ انسان کے اندر کی دنیا کی وضاحت کرنے کے لئے لاکھوں صفحات لکھے جا چکے ہیں، لیکن

{۳۷} Andre L'woff of Microbes and life ed. Jacques Monod and Ernest Borck : New York Columbia Universitty Press 1971).

کسی ایسے نتیجے تک پہنچنے میں جسے بالکل درست کہا جاسکے۔ ہم ابھی تک کامیاب نہیں ہوسکے ہیں۔ ہم کوئی ایسا فارمولا دریافت نہیں کرپائے جو انسان کی نفسیاتی زندگی کو کسی قانون میں منضبط کرسکے"{۳۸}۔

الیکسس کارل خلیے (Cell) کے اندر زندگی کی حقیقت کو سمجھنے میں ناکامی کا اس طرح اعتراف کرتا ہے :

"اعضاء اپنی تعمیر میں جن عوامل سے گزرتے ہیں انہیں سمجھنا انسانی فہم سے باہر ہے۔ یہ تمام وجود (انسان) ایک سادہ خلیے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک مکمل گھر ایک جادوئی اینٹ سے وجود میں آجائے اور یہ اینٹ جادوئی طور پر دوسری اینٹوں کو جنم دے۔ انسان کے اعضاء اسی طرح جنم لیتے ہیں جس طرح پریوں کی کہانیوں میں اعضاء وجود میں آجاتے ہیں۔ اس عمل کو سمجھنے میں ہمیں تو اپنی عقل بے بس نظر آتی ہے"۔

آگے جاکر لکھتا ہے :

"ابھی تک ہم اپنے جسم کے نظام، اس کی خوراک اور اس کی اعصابی اور روحانی توانائی کے راز تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ کیمیا اور فزکس کے قوانین مکمل طور پر مردہ مادے اور جزوی طور پر انسان پر لاگو کیے جاسکتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ انیسویں صدی کے مشتبہ نظریات، خصوصاً جیکوز لوئب کے نظریات سے پرہیز کریں۔ اگرچہ ان طبعی و کیمیائی نظریات پر سائنس دان اور نفسیات کے ڈاکٹر بدقسمتی سے ابھی تک یقین رکھتے ہیں"۔

زندگی ایک عمل کا نہیں، بلکہ معجزے کا نام ہے۔ مثال کے طور پر انسانی آنکھ کو لیجئے۔ انسانی آنکھ کے ایک عضو میں ایسا مادہ موجود ہے جو کہ چکنائی سے بنا ہوا ہے۔

{۳۸} Pavlov, "Experimental Psychology".

اس کی حفاظت کے لئے ایک اوپر پرت ہے ایک نیچے پرت ہے۔ ان دونوں پرتوں میں پلکیں ہیں۔ اس کے علاوہ ابرو ہیں' جھلیاں ہیں' نالیاں ہیں۔ موٹر مسلز کے ذریعے آنکھ تمام اطراف میں دیکھ سکتی ہے۔ دو موٹر مسلز سیدھے اور دو ترچھے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ نسیں ہیں جو کہ آنسو خارج کرنے کا باعث بنتی ہیں اور ان آنسو لانے والی نسوں کے غدود کو (Lachrymal gland) کہتے ہیں جو کہ ایک تھیلی میں ہوتا ہے اسے (Lachrymal Sac) کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ آنسو لانے والا آمیزہ ہوتا ہے جو آنکھ کے اندر نمی رکھتا ہے اور اس کو بیرونی مداخلت اور بیماریوں سے بچاتا ہے۔ آنکھ کے ڈھیلے کی تین تہیں ہوتی ہیں۔ سب سے بیرونی پرت مکمل ہوتی ہے اور اس میں سے کسی چیز کا گزرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ آنکھ کا سفید حصہ ہوتا ہے اور سامنے کی طرف سے یہ قرنیہ میں تبدیل ہوجاتا ہے جس میں سے روشنی کا گزرنا ممکن ہوتا ہے۔ شریانوں کا جال آنکھ کے سفید حصے کے نیچے بچھا ہوتا ہے اور اس کے اندر خون کی نالیاں ہوتی ہیں جو آنکھ کی نشوونما کرتی ہیں۔ آنکھ کی کارکردگی کے لئے تیسری پرت سب سے اہم ہے۔ اس پرت کو (Retina) کہتے ہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں حسی خلیات (Censory Cells) موجود ہوتے ہیں۔ یہ سیل طویل ہوتے ہیں اور عریض بھی۔ ان کا سلسلہ دوہرے خلیات کے ساتھ ملا ہوا ہے اور یہ خلیات کے ریشے باہم مل کر خلیات مرکز بصارت تشکیل دیتے ہیں۔ ڈھیلے کے اندر ایک شفاف' قابل گردش پانی نما مادہ ہوتا ہے۔ سامنے کے حصے میں سانچہ نما عدسے (Crystalline Lens) ہوتے ہیں جو کہ بیضوی رنگدار جھلی سے جڑے ہوئے اور (Ciliar body) سے متعلق ہوتے ہیں۔ جب روشنی کی شعاعیں قرنیہ سے گزرتی ہیں تو وہ اپنی شکل بدل لیتی ہیں' تاکہ آنکھ کے پچھلے حصے پر تصویر بنا سکیں اور اوپر سے نیچے ایک تصویر بنتی ہے جو کہ دماغ کے بصری مرکز پر منتقل ہوجاتی ہے۔ ہر آنکھ تصویر کو مختلف زاویے سے وصول کرتی ہے۔ دونوں آنکھوں سے وصول ہونے والا یہ خلیاتی پیغام سفر کرتا ہے اور عدسی خلیات مرکز بصارت تک پہنچ جاتا ہے۔ مجموعی تحریک درمیان مغز

کے مقام ہائے اتصال (Midbrain Junctions) تک سفر کرتی ہے اور ریشوں (Fibres) کے ذریعے(Occipital Lobe)میں تقسیم ہوجاتی ہے جہاں سے اشیاء کو "دیکھا" جاسکتا ہے۔ آنکھ کی کارکردگی کے لئے آنسوؤں کی بے انتہا اہمیت ہے۔ Lachrymal gland آنسو پیدا کرتے ہیں اور یہ قرنیہ کو نم آلود رکھتے ہیں۔ دیگر مادوں کے علاوہ آنسوؤں میں(Lasozyme)بھی ہوتا ہے جوکہ بیکٹیریا کے حملوں اور دیگر بیماریوں سے بچاؤ کے لئے اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ آنسوؤں کا بہاؤ ساتویں(Cranial Nerve)کے ذریعے کنٹرول ہوتاہے اور اسے(The Nervus Facialis)کہاجاتا ہے۔ بیکٹیریا کش مادے کے طور پر انسانی آنسو کسی بھی کیمیائی عنصر یا دوا سے بہتر ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کم وبیش بیکٹیریا کی سو قسم کے جراثیم کو ہلاک کرڈالتا ہے اور اگر چھ سو مرتبہ بھی اس مادے میں تبدیلی یا اضافہ کیا جائے تب بھی اس کی یہ صلاحیت برقرار رہتی ہے۔

اسی طرح جگر کئی قسم کے کام سرانجام دیتا ہے۔ چونکہ یہ غدود ہے اس لئے رطوبت پیدا کرتا ہے جوکہ خوراک کے ہضم ہونے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جگر ایک ایسی کیمیائی فیکٹری ہے کہ اس کا کسی بھی فیکٹری سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کسی بھی کیمیائی عنصر کی ہیئت ترکیبی کو بدل کر رکھ دیتا ہے ۔یہ بہت سے زہریلے مادوں اور خطرناک اجزاء کو بے ضرر بنا کر رکھ دیتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک طاقتور زہرکش عضو (Detoxifying Organ) ہے۔ یہ خون کو محفوظ رکھنے کا سٹور ہے۔ علاوہ ازیں یہ حیاتین (Vitamins) اور ہضم شدہ نشاستہ (Carbohydrates) جوکہ (Glycogen)کی صورت میں موجود ہوتا ہے کو بھی محفوظ رکھتا ہے جوکہ خون میں شکر کے درجے کو برقرار رکھنے کے لئے جگر سے باہر نکالا جاتا ہے۔ کولیسٹورل' انزائم' حیاتین اے' لحمیات' منجمد خون اور دیگر عناصر کی مرمت کرتا اور قابل استعمال بناتا ہے۔ خون کے سرخ ذرات (Red blood corpuscles) کی تیاری کا کام بھی بوقت ضرورت جگر

ہی سرانجام دیتا ہے۔

ہمارا خون غذائی اجزاء جسم کے مختلف حصوں کو منتقل کرتا رہتا ہے۔ خون ہی پھیپھڑوں سے آکسیجن حاصل کرتا ہے اور انہیں خلیات تک پہنچاتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو تین سو کروڑ کھرب (30 Trillion) خلیات سے نکال باہر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں خون ہارمونز اور انٹی باڈیز (بیماری روکنے والے خلیات) کو آگے منتقل کرتا ہے جس کے ذریعے جسم کے اندرونی وفاع کا نظام تشکیل پاتا ہے۔ خون جسم کے درجہ حرارت کو جاری و ساری اور معتدل رکھنے پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ خون کے سفید ذرات (White blood Corpuscles) باہر سے حملہ آور ہونے والے بیکٹیریا کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ انہیں ہضم کرتے ہیں اور بیکٹیریا کے علاوہ باہر سے حملہ کرنے والے دیگر عناصر پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

دماغ (Cerebrum) پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کے دو خانے ہوتے ہیں۔ ایک کو (Thalamus) کہتے ہیں۔ اس میں (Medulla Oblongata) اور (Pons) ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ (Midbrain) ہوتا ہے جس میں (Cerebellum) اور حرام مغز (Spinal Cord) ہوتے ہیں۔ دماغ کی حفاظت کے لئے تین پرتیں (Coats) ہوتی ہیں۔ سخت' نرم اور ان دونوں کو جوڑنے والے خلیات کی پرت (Connective Tissue)۔ دماغ سیاہی مائل سفید مادوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ خاکستری عضو (Gray Tissue) میں نسی خلیات (Nerve Cells) ہوتے ہیں۔ جو سفید عضو (Motor اور Sensory Fibers) کا آخری مقام اتصال ہوتے ہیں۔ (Medulla Oblongata) حسوں کے وصول کرنے اور نشر کرنے کے مرکز کا کام سرانجام دیتا ہے اور Pons کے ذریعے انہیں دماغ کے اعلیٰ مراکز تک پہنچانے کا بندوبست کرتا ہے۔ (Cerebellum) توازن برقرار رکھنے' عضویات کے باہمی رابطے اور اعلیٰ حرکات کا مقام ادائیگی بن جاتا ہے۔ مقام بصارت جسے (lobe Occipital) کہا جاتا ہے دماغ کے پچھلے حصے میں ہوتا ہے۔ سننے اور چکھنے کے

عضویات سر میں اس جگہ ہوتے ہیں جنہیں (Temporal lobe) کہتے ہیں۔ دماغ میں سب سے اہم حصہ (Massive Cerebrum) کہلاتا ہے۔ اس کی بیرونی پرت (Cerebral Cortex) خاکستری رنگ کی ایک تہہ ہوتی ہے جو کہ نسی خلیات (Cells Nerve) پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کے نیچے سفید پٹھا (White Tissue) ہوتا ہے۔ جس کے آغاز پر مٹیالے رنگ کا ایک مادہ ہوتا ہے جسے (Basal Ganglion) کہا جاتا ہے۔ "مٹیالا مادہ" سفید سے برتر نہیں ہے' بلکہ تحرکات (Impulses) کی تقسیم سے متعلق ہوتا ہے جبکہ سفید مادہ خلیاتی ریشوں میں تحرک (Impulse) پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔ یہ دونوں مل کر نفسیاتی افعال اور مشروط حسی روعمل (Conditional Reflex) کی تخلیق کا باعث بنتے ہیں۔

ایک عام انسانی دماغ کا اوسط وزن تیرہ سو سے چودہ سو پچاس گرام تک ہوتا ہے اور اس میں ۱۴ بلین سے ۱۵ بلین تک خلیات موجود ہوتے ہیں۔

جانوروں کے پاس ایسے اوزار ہوتے ہیں جو کہ انسانوں کے بنائے ہوئے آلات سے کہیں زیادہ مضبوط اور موثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ پرندوں کی روشنی' گھاس کے ٹڈے کا جھانجھ (Violin) جھینگروں کا مجیرا (Cymbal) نیز پھندوں' جالوں' رنگوں اور ترکیبوں کا مکمل مجموعہ۔

آندرے تیتری نے اس پر مکمل کتاب لکھی ہے اس کا نام (Qutils Les Chez les etres Vivantz) ہے۔ یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ارتقاء اندھادھند میکانیت کا مرہون منت نہیں۔ جیساکہ ڈارون کا خیال ہے۔{۳۹} "کھڑکھڑاہٹ کرنے والا سانپ (Rattle Snake) زیریں سرخ شعاعوں (Infra-red Rays) کو محسوس کرنے

{۳۹} Lucian Cuenot : Invention et. Finalite en Biologie (Paris : Masson et. cie Editerus 1951).

کی صلاحیت رکھتا ہے۔ امریکہ میں کولوریڈو یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے ثابت کر دیا ہے کہ جب زیریں سرخ شعاعوں کی شناخت کرنے والا آلہ سانپ کے سر پر رکھا جاتا ہے تو بہت باریک خلیات کا پتہ لگتا ہے جو کہ اس سانپ کے اندر موجود ہیں اور جب ان پر یہ روشنی پڑتی ہے تو وہ چمکنے لگتا ہے۔ تجربات نے ثابت کیا ہے کہ شعاعوں کے بھیجے جانے کے بعد ایک سیکنڈ کے پینتیس ہزارویں حصے میں یہ سانپ رد عمل ظاہر کر دیتے ہیں۔ آج تک حیاتیاتی نظاموں میں رد عمل کا جو وقت معلوم ہوا ہے اس میں یہ ایک ریکارڈ ہے"۔

"اسی طرح شارک مچھلیاں اپنی ناک پر انتہائی حساس برقی آلہ (Electric Senstive Antenna) رکھتی ہیں' جو سمندر کی تہہ میں موجود ریت کے درمیان خوراک تلاش کرنے میں ان کا مددگار ثابت ہوتا ہے۔ سمندر کے اندر موجود تمام جاندار کمزور برقی لہریں خارج کرتے ہیں جنہیں مخصوص آلے کی مدد سے شارک مچھلیاں منقطع کر دیتی ہیں"۔

ڈاکٹر الیگزینڈر گورسکی جو کہ سوویت اکیڈمی برائے سائنس کے ممبر ہیں' انہوں نے وہی پرانا نظریہ اختیار کیا ہے جس کی تائید آئن سٹائن کرتے رہے ہیں کہ کائنات کے ڈھانچے میں کچھ لاینحل چیستان (Enigmatic Traits) ہیں۔ اس کی کتاب کے کچھ دلچسپ ابواب میں یہاں بیان کروں گا۔

ہزاروں کی تعداد میں دیمک اپنے چھتے کی تعمیر میں جتی رہتی ہیں۔ جب یہ تعمیر ہو جاتا ہے تو یہ انتہائی پیچیدہ ڈھانچے کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں کم و بیش سو مربع میٹر تک لمبائی کے خانے پھیلے ہوتے ہیں' جہاں خوراک کے ذخیرے جمع ہوتے ہیں' انڈوں کے لئے جگہ ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ایک بار ایک چھتے پر تجربہ کیا گیا جس کی تعمیر ابھی شروع ہوئی تھی اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تاکہ چھتے کے خانے الگ الگ ہو جائیں لیکن اس کے باوجود دونوں حصوں میں خانوں' کمروں' راستوں اور ذخیرہ گھروں کی تعمیر مکمل ہو گئی اور ان کا باہمی رابطہ بھی

حسب معمول مکمل تھا۔

ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ہر چھتہ دوسرے چھتے میں ہونے والے کام سے باخبر تھا کیونکہ دونوں میں ایک جیسا کام ہوا تھا۔ تاہم اسے اپنے ہمسائے میں ہونے والے کام کی اطلاع نہیں تھی' کیونکہ ان کے درمیان رابطہ نہیں تھا۔ آیئے اس کی وضاحت کریں :

یہ بات تو ظاہر ہے کہ ایک دیمک کو تن تنہا یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اکیلے کس طرح ایک چھتہ تعمیر کرنا ہے۔ کمال یہ ہے کہ چھتے کا ہر فرد اپنے طور پر جانتا ہے کہ اسے اجتماعی کام میں سے کیا ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ اسی طرح ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ چھتے کی پوری آبادی اجتماعی طور پر اپنے کام سے آگاہ ہوتی ہے۔ اگرچہ انفرادی طور پر انہیں کسی چیز کا علم نہیں ہوتا۔

طویل عرصے تک یہ خیال کیا جاتا رہا کہ موسم گرما میں پرندوں کے غول سرد علاقوں کی طرف کوچ کرجاتے ہیں اور بوڑھے پرندے ان کی راہنمائی کرتے ہیں' لیکن تحقیق کی گئی' تو یہ بات ثابت نہ کی جا سکی۔ پروفیسر جاموتوہیروس جاپان کا ایک ماہر علم الطیر (Ornithologist) ہے۔ اس نے بیان کیا کہ پرندوں کا غول جب اڑ رہا ہوتا ہے تو کوئی دوسرا پرندہ ان کی راہنمائی نہیں کر رہا ہوتا۔ اگر کوئی پرندہ ان کے آگے ہو یا آگے آجائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ان کی راہنمائی بھی کررہا ہے۔ کبھی کبھار انتہائی کم عمر اور چھوٹے پروں والا پرندہ سب سے آگے ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا پرندہ روایتی راستے سے آگاہ نہیں ہوتا اور نہ ہی دوسروں کی اس راستے کی طرف راہنمائی کرسکتا ہے{۴۰}۔

گوربوسکی آگے لکھتا ہے۔ :

"یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ علم الحیات کے نقطہ نظر سے نوزائیدہ

{۴۰} Alexander Gorbovsky.

بچوں' لڑکوں اور لڑکیوں میں ایک قدرتی تناسب ہوتا ہے لیکن اگر کسی وجہ سے معاشرے میں کسی نوعیت کی خرابی آجائے تو یہ تناسب بھی بگڑجاتا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں عورتوں کی تعداد کم ہو تو وہاں مرد زیادہ تعداد میں میں پیدا ہونگے اسی طرح اگر مردوں کی تعداد کم ہو تو عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوجائے گا اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک فطری تناسب قائم نہ ہوجائے"۔

یہ حقیقت ہے کہ کوئی تنہا جاندار اپنی ہی صنف کے دوسرے فرد پر اثرانداز نہیں ہوسکتا۔ دوسرے الفاظ میں ہمارے سامنے ایک ایسا لائحہ عمل آتا ہے جس کے اپنے قوانین ہیں۔ ماہرین آبادی اسے "جنگی سالوں کا عمل" قرار دیتے ہیں۔ جنگوں کے دوران اور بعد میں بہت سے مرد قتل کردیئے جاتے ہیں۔ لیکن جنگ کے فوراً بعد مردوں کی تعداد (پیدائش) بڑھنے لگتی ہے یہاں تک کہ تناسب قائم ہوجاتا ہے{۴۱}۔

یہ مثالیں حیاتیات کی اولین کتاب سے لی گئی ہیں۔ تمام سائنسی معجزات کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ یہ حقیقتیں خدا ہی کی طرف اشارہ کررہی ہیں۔ انسان کے وجود اور تخلیق ہی پر غور کیا جائے تو خدا کا وجود ثابت ہوجاتا ہے جو اس سے سچائی کے منکر ہیں وہ خام فکر ہیں۔ انسانی آنکھ اور دماغ کو پیچیدہ بھی تسلیم کرنا جیسا کہ یہ ہیں اور ان کی پیدائش کو اتفاقی بھی قرار دینا نادانی ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص سے کہا جائے کہ وہ یونانی دیومالائی کہانیوں کو آنکھیں بند کرکے سچ مان لے۔

عظیم مسلم فلسفی محمد الغزالی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ تمام معجزات فطری ہیں اور تمام فطرت معجزاتی ہے۔ کچھ لوگ سوال اٹھائیں گے کہ ایسا ہے تو پھر' خود بخود منظم

{۴۱} .Alexander Gorbovsky

ہونے والے مادے اور خود بخود تخلیق ہونے والے ان تمام پیچیدہ نظاموں کے بارے میں کیا کہا جائے گا جو اس زندہ و تابندہ دنیا میں موجود ہیں اور کراں تا کراں پھیلے ہوئے ہیں۔

آیئے البومن (Albumen) کے ایک مالیکیول کی خود بخود تنظیم و تخلیق کے بارے میں دیکھیں جو تمام جانداروں کا لازمی جزو ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے ماہر جسمانی سائنس چارلس یوجین گائی نے پروٹین کے مالیکیول کی حادثاتی پیدائش کے امکان کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بات معلوم و معروف ہے کہ پروٹین کے ایک مالیکیول میں کم از کم چار مختلف مالیکیول ہوتے ہیں۔ اعداد و شمار کو مختصر کرتے ہوئے گائی کہتا ہے کہ "البومن کا ایک مالیکیول دو ہزار ایٹموں کے دو عناصر پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کا ایٹمی وزن دس ہوتا ہے اور اس کی Molecular Dissymetry' 0٫9 ہوتی ہے۔ ان مختصر شرائط کے ساتھ پروٹین کے پیدا ہونے کا اتفاقی ہونا ممکن ہے جس میں مالیکیولوں کی تعداد 2٫02X10^{-231} ہو سکتی ہے اور یہ تخمینہ گائی کا ہے۔ اگر اس تخمینے کو ہم بنیاد بنائیں اور اپنی کائنات اور سیارے کے سائز اور حجم کو بھی ملحوظ خاطر رکھیں تو اس قسم کے ایک مالیکیول کی تخلیق ۱۰۲۴۳ بلین سال لے گی بشرطیکہ ہر سیکنڈ میں ۱۰۱۴۵٫ ارتعاش ہوں۔ نتیجۃً" اس چیز کا کوئی امکان نہیں ہے کہ زندگی اتفاقی طور پر پیدا ہوئی ہوگی جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ساڑھے چار بلین سال میں دنیا وجود میں آئی ہے۔

میکس پلانک انسٹی ٹیوٹ برائے بائیو فزیکل کیمسٹری جو کہ گوٹنگن جرمنی میں واقع ہے' کے ایک سائنس دان مینفرڈ آئیگن نے انہی اعداد و شمار کو دہرایا اور اسے ۱۹۶۸ء میں کیمیا و کیمسٹری کا نوبل انعام بھی ملا۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ ہمارے سیارے کا سارا پانی بھی پروٹین کے ایک مالیکیول کو پیدا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ اگر ساری کائنات بھی کیمیائی مادوں سے بھر جائے جو مستقل طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تعامل کرتے ہیں تب بھی پروٹین کے کسی قسم کے مالیکیول کا دس بلین سالوں میں پیدا ہونا ممکن نہ ہوگا۔

اس حقیقت کو مدنظر رکھ کر آئیگن نے ''ارتقاء قبل حیات'' کا نظریہ متعارف کرایا' یعنی زندگی' زندگی سے پہلے جیساکہ عمومی طور پر اسے کہا جاتا ہے۔

جب دو برطانوی سائنس دانوں' فریڈرک ہائل (جوکہ برطانیہ کی رائل سوسائٹی برائے فلکیات کا صدر تھا) اور چندرا وکرا (جس کا تعلق کارڈف یونیورسٹی سے تھا) نے اس مسئلے کا مطالعہ کیا تو انہوں نے اپنے نظریے کو اس طرح بیان کیا کہ زندگی کا ظہور زمین پر نہ ہوا تھا ' بلکہ زمین سے باہر گرد وغبار کے کچھ بادل کائنات کی گہرائی سے اٹھے اور زمین کے اوپر آگئے۔ ان کے خیال میں زمین پر زندگی کے آغاز سے پہلے حیاتیاتی عمل کا آغاز ہو گیا تھا۔

روسی سائنس دان بلاندن لکھتا ہے :

> ''اگر زمین پر دس لاکھ تجربہ گاہیں قائم کردی جائیں اور ان تجربہ گاہوں میں ٹسٹ ٹیوب کیمیائی عناصر کو جوڑنے کا کام کئی لاکھ سال تک ہوتا رہے تب بھی زندگی کے پیدا ہونے کی شرح بعید از امید ہی رہے گی۔ بلاندن کا خیال ہے کہ ۳۱۰ اٹسٹ ٹیوبوں میں سے صرف ایک میں زندگی پیدا ہونے کا امکان رہے گا{۴۲}''۔

پروٹین کے ایک مالیکیول اور زندہ جاندار کی تخلیق کے بارے میں آپ نے دیکھ لیا' یہ تو ایسا ہی اندازہ ہے جیساکہ ایک عظیم الشان عمارت کی تعمیر کا جائزہ لینے کے لئے صرف ایک اینٹ کی پیدائش کا جائزہ لیا جا رہا ہو۔

سائنس خصوصاً مالیکیولر حیاتیات نے بڑے پیمانے پر زندہ اور مردہ اجزاء کے درمیان حائل خلیج کو گھٹانے کی کوشش کی' لیکن یہ خلیج ابھی تک تو پاٹی نہیں جاسکی ہے۔ ہم مالیکیولر حیاتیات کو گھٹانے کی کوشش نہیں کررہے ہیں' لیکن اس سے مادہ پرستی کی

{۴۲} Blandin

اصلی شکل سامنے آتی ہے۔

اس تضاد کی کس طرح وضاحت کی جائے؟ اگر آثار قدیمہ کے کسی نمونے میں ہمیں دو پتھر ملیں جو کہ ایک ترتیب سے رکھے گئے ہوں یا کسی مقصد سے کاٹے گئے ہوں تو عموماً ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ پرانے وقتوں کے کسی شخص نے یہ کام سرانجام دیا ہے۔ اگر انہی پتھروں کے نزدیک ہمیں کوئی ایسی کھوپڑی ملے جو پتھر کے اوزاروں سے بھی زیادہ مکمل اور پیچیدہ ہو' تو ہم میں سے کچھ لوگ سوچیں گے کہ یہ کام کسی باشعور ہستی کا ہے۔ وہ اس مکمل کھوپڑی یا ڈھانچے کے بارے میں بھی سوچیں گے کہ آیا یہ اتفاقی طور پر وجود میں آئے ہیں یا منصوبے کے تحت پیدا ہوئے ہیں۔ کیا انسان خدا کا انکار کرتے ہوئے عجیب و غریب محسوس نہیں ہوتا؟

موجودہ دور کے انسان کی تنگ نظری کا اظہار اس خیال سے ہوتا ہے کہ انسان سمجھتا ہے کہ اب اس کے سامنے کوئی "پہیلی" باقی نہیں رہ گئی ہے جبکہ حالت یہ ہے کہ جس چیز کو انسان کا علم قرار دیا جاتا ہے وہ دراصل انسان کی معلومات اور عدم معلومات کا مجموعہ ہے۔ انسان اسی حقیقت سے ناواقف ہے اور اسی خام مجموعے کو وہ علم سمجھتا چلا آ رہا ہے۔ وہ بڑے سے بڑے اسرار اور نظام کو دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد کا مظاہرہ کرتا ہے' اگرچہ اس کو مسئلے کا علم ہی نہیں ہوتا۔ اس طرح اس کی کم علمی اور غفلت مجسم شکل اختیار کر لیتی ہے۔

موسم خزاں میں ابابیلیں یورپ سے افریقہ کا سفر اختیار کرتی ہیں۔ موسم بہار میں وہ اپنے تیار کردہ گھونسلوں میں دوبارہ واپس لوٹ آتی ہیں۔ انہیں کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اب انہیں اس علاقے میں ٹھہرنا ہے اور اب لوٹ جانا ہے؟ اور بڑے بڑے شہروں کے ہزاروں لاکھوں گھروں میں انہیں کس طرح یاد رہتا ہے کہ ان کا گھونسلہ اس چھت میں ہے؟ اس سوال کا ہمارا "بھولا انسان" یہ جواب دیتا ہے کہ پرندوں کی راہنمائی ان کی "حس" کر رہی ہوتی ہے یا کہتے ہیں کہ یہ سوال فطری انتخاب (Natutral

(Selection) کا ہے۔ کیونکہ صرف وہ پرندے زندہ رہ جاتے ہیں جو گرم خطوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ دوسرے پرندے جو اس کو نہیں "سمجھ پاتے" مرجاتے ہیں۔ ہجرت کرنے کی حس ہزاروں نسلوں کے تجربے کا حاصل ہے۔

سوال زیر بحث کا یہ جواب بڑا کھوکھلا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ "جھگڑالو انسان" کا خیال ہے کہ چونکہ اس نے جواب دے دیا ہے اس لئے سوالات ختم ہوگئے ہیں۔ حالانکہ سوالات ہی تو دنیا کو کھنگالنے اور دریافت کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ آئن شائن کے نظریہ اضافیت (General Theory of Relativity) دریافت کرنے کا سبب ہی یہ ہے کہ اس نے ایسے مسئلے پر تحقیق کی جو کہ بظاہر طے شدہ اور واضح نظر آرہا تھا۔

ادب و فن' فلسفہ اور مذہب انسان کی توجہ اسراروں' پہیلیوں اور سوالات کی طرف مبذول کرواتے ہیں۔ یہ ہماری راہنمائی کبھی کبھار ایسے علم کی طرف کرتے ہیں جس سے ہم اپنی عدم واقفیت کے سبب لاعلم رہتے ہیں۔ دانا اور احمق کے درمیان لکیر اسی نکتے سے کھنچتی ہے کہ کبھی کبھار دونوں ایک خاص بات کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں' لیکن احمق شخص اپنی کم علمی کو علم سمجھ کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے مطابق طرز عمل اختیار کرتا ہے' لیکن دانا جستجو جاری رکھتا ہے اور حقیقت تک پہنچ جاتا ہے۔

انسان زندگی کی اکثر حقیقتوں سے ناواقف ہے اور عملی زندگی میں کبھی کبھار اس سے المناک نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ ناواقف اشخاص اپنی کم علمی کو علم سمجھ کر اسی پر اصرار کرتے ہیں اور صاحبان علم شیکسپیئر کے مذبذب ہیرو ہیملٹ کی طرح مشتبہ رائے اختیار کرتے ہیں اور اس طرح دو ٹوک رائے رکھنے کے باعث پہلے گروہ کو فوقیت حاصل ہوجاتی ہے۔ غور و فکر کا معاملہ روزمرہ کے معاملات سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اگر ہر چیز واضح ہے تو پھر غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے اور ہمارے عوام الناس کا فکری رویہ یہی ہوتا ہے۔ اس قسم کے انسان کسی چیز کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے کا بوجھ اپنے اذہان پر نہیں ڈالتے۔ اگر ان کا سامنا کسی نامعلوم چیز یا علم یا سوال سے ہوجائے تو وہ بالکل حیرت

زدہ نہیں ہوتے۔ اگر کوئی مسئلہ اٹھ کھڑا ہو تو وہ اس سے نظر بچا کر زندگی گزارتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح مسئلہ حل ہوگیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ طرز عمل اہل دانش کے لئے ناقابل قبول ہے۔ زندگی کے حقائق کو سمجھنے کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ہم سائنسی ذرائع سے زندگی کی وضاحت نہیں کرسکتے کیونکہ زندگی ایک عمل بھی ہے اور ایک معجزہ بھی' مسلسل غور و فکر زندگی کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

❑ انسان دوستی کا مفہوم :

دو بڑے مادہ پرست مفکرین نے نہ صرف انسانی زندگی' بلکہ حیوانات کی زندگی کے اصول اس اصول کی روشنی میں وضع کئے ہیں کہ دونوں ہی غم اور مسرت کا احساس رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسرت کے حصول کے لئے جدوجہد کی جائے اور غم والم سے دور بھاگا جائے۔قدماء میں سے ا یپی کیورس اور جدید دور میں ہالباخ اس نظریے کے علمبردار ہیں۔ مادہ پرستی اس چیز کو مدنظر رکھتی ہے کہ انسانوں اور جانوروں میں مشترک چیز کیا ہے جبکہ مذہب اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان اختلاف کی باتیں کیا ہیں۔ مذاہب نے جو پابندیاں عائد کی ہیں ان میں سے اکثر کا مطلب یہی ہے کہ ان اختلافی خصوصیات کو واضح کیا جائے۔

انسانی فطرت کے حیوانی پہلو کی وضاحت کرتے ہوئے مادہ پرست کبھی کبھار بہت آگے نکل جاتے ہیں۔{۴۳}ڈارون نے انسان کو حیوان مطلق تو قرار نہ دیا' لیکن اس نے

{۴۳} مثال کے طور پر مادہ پرست اس بات پر بار بار زور دیتے ہیں کہ زمانہ قبل از تاریخ میں صنفی تعلقات مکمل طور پر آزاد تھے اور ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ہر فرد ہر عورت کی ملکیت اور ہر

انسان کو حیوانی جبلت سے روشناس کرانے کی بھرپور کوشش کی اور اس "روشناسی" سے دیگر مادہ پرست مفکرین نے کچھ اور نتائج اخذ کرنے شروع کیے۔ ان نتائج کا تعلق سیاست سے بھی تھا اور اخلاقیات سے بھی۔ انہوں نے کہا کہ انسانی معاشرہ ایک تہذیب یافتہ ریوڑ ہے۔ نیز تمدن انسان کی ذہنی بیداری کا نام ہے اور یہ پابندیوں کے انکار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا ہے اور اس کی اصل حواس پر مبنی ہوتی ہے۔ روح پر مبنی نہیں ہوتی۔

یہ نظریہ پیش کرکے ان مفکرین نے انسانوں اور حیوانوں کے درمیان تسلسل قائم کیا جس کے بعد نظریہ ارتقاء نے فطرت اور ثقافت کے درمیان امتیازات کو بھی جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا' جبکہ مذہب نے بالکل دوسرا نقطہ نظر اختیار کرکے اس فرق کو از سرنو قائم کیا۔ اس طرح تخلیق کے عمل کے آغاز ہی سے انسان اور اس کی ثقافت کے ارتقاء کے تمام مدارج کو رد کردیا ہے' چنانچہ اسی مقام سے تمدن اور تہذیب کے درمیان اختلافات کا آغاز ہوا۔ کاموس کا کہنا ہے کہ : "انسان جانور ہے اور اسی لئے وہ اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتا" (۴۴)۔

وائٹ ہیڈ نے اس انکار میں مذہبی رویے کی روح کارفرما دیکھی۔

اس کا کہنا ہے کہ :

"اس "کھلے انکار" سے مذہب اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ انسانوں اور جانوروں کے طرز عمل کا جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ جانور کیا کرتے ہیں اور گر جانوروں کے برخلاف طرز عمل اختیار کرلیا جائے (۴۵)

عورت ہر مرد کی ملکیت تھی۔ اینجلز نے اس کو صراحتاً قبول کیا ہے کہ اس بات کا براہ راست ثبوت تو کوئی نہیں ہے' تاہم اپنی کتاب میں وہ اس بات پر زور دیتا ہے دیکھئے

The Origin of the Family Private Property and the state Serbo Creatian trans. (Zagreb : Naprijed 1945).

حاشیہ (۴۴) اور (۴۵) آگے ہے۔

تو کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے مثلاً جانور غیر محتاط انداز اور بے ڈھنگے طریقے سے کھاتے ہیں۔ انسانوں کو چاہیے کہ وہ ایسا طرز عمل اختیار نہ کریں۔ اگر مناسب خوراک نہ ملے تو روزہ رکھ لیں۔ اسی طرح جنسی تعلق قائم رکھنے میں انسانوں کو چاہیے کہ وہ جانوروں کا رویہ اختیار نہ کریں۔ جانور گلے بنا کر رہتے ہیں اور جنسی تعلق قائم کرنے میں کسی طرح کی احتیاط ملحوظ نہیں رکھتے۔ انسانوں کو چاہیے کہ وہ ایسا نہ کریں۔ جانور بہرحال خواہش کی تکمیل اور مسرت کی تلاش میں رہتے ہیں اور تکلیف سے دور بھاگتے ہیں۔ انسانوں کو عقل کے تابع رہنا چاہیے۔ وہ پریشانیوں کو خندہ پیشانی سے قبول کریں اور مسرت کے مواقع پر بے قابو نہ ہوں۔ مختصر یہ کہ جانور محض اپنے جسموں کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن انسان جسم اور روح دونوں کی پرورش کا پابند ہے اس لئے انسانوں کو چاہیے کہ وہ زیادہ تر اپنی روح کے ساتھ زندگی گزاریں"۔

اس سرزمین پر انسانی زندگی کا المیہ یہی "صنفی خواہش" ہے جس کی وضاحت ڈارون کے نظریات اور دیگر مادہ پرستوں کے نظریات سے نہیں کی جاسکتی۔ ہوسکتا ہے کہ اس سے انسان کا کوئی خصوصی استحقاق ثابت ہوتا ہو' لیکن اس "صنفی خواہش" کے حد اعتدال میں رہنے پر ہی انسان کے انسان ہونے کا انحصار ہے۔

ویسے حقیقت تو یہ ہے کہ انسانوں اور جانوروں کے درمیان ایک مکمل مشابہت اور تسلسل موجود ہے۔ ہمیں جو چیز مشترک نظر آرہی ہے وہ حیاتیاتی یا میکانکی پہلو ہے لیکن

{۴۴} Camus: I' Homme Re'Volte'

{۴۵} Alfred Whitehead: Science and the Modern World

(New York Macmillen 1920)

دوسری طرف ان دونوں میں گہری اور حقیقی مشابہت کا وجود ہی نہیں ہے کیونکہ جانور جبلی طور پر بس چند افعال پر ہی قادر ہوتا ہے۔ وہ انسان کی طرح لامحدود قوت عمل نہیں رکھتا۔ وہ نہیں جانتا کہ کون سی بات اخلاق کے مطابق ہے اور کون سی اخلاق کے مطابق نہیں۔ جبکہ انسان اس طرح کا کبھی نہیں ہو سکتا اور نہ ہی انسان کسی لمحے یہ پسند کرے گا کہ وہ معصوم جانور بن جائے۔ انسان کو روز اول سے آزادی عمل دی گئی ہے اور اسے مقام انسانیت اور آزادی سے فروتر ہونے کی اجازت نہیں دی گئی' اس لحاظ سے فرائیڈ کا پیش کردہ ہر حل اس بحث سے خارج ہے۔ انسان کبھی بھی جانور نہیں بن سکتا تاہم یہ سوال ہر دور میں باقی رہے گا کہ اس کا طرز عمل انسانی ہے یا غیر انسانی؟

اگر یہ کہا جائے کہ انسان مکمل ترین جانور ہے تو اس کی زندگی سادہ اور پیچیدگیوں سے پاک ہونی چاہیے' لیکن چونکہ انسان "زمین کا باسی اور جنت کا قدیم باشندہ" ہے اور چونکہ اس کی تخلیق ہوئی ہے اس لئے اس کا وجود ہم آہنگ نہیں ہے۔ چنانچہ اقلیدس جس قسم کا توافق چاہتا ہے وہ ناممکن ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہماری جڑ بنیاد' بلکہ ہمارے اعمال و افعال سب کے سب تخلیق کی حقیقت کے ساتھ منسلک ہیں۔

ہماری انسانی عظمت' اخلاقی جدوجہد' ہمارے مصائب و آلام' عدم اطمینان' ناکامی' ظلم اور حسد و رشک وغیرہ سب کا تعلق اسی بنیادی چیز سے ہے {۴۶} جبکہ حیوان ان میں سے کسی چیز سے بھی آگاہ نہیں ہوتا۔ یہ تو انسان ہے' جس کے اندر تاریخ ساز لمحے کی حقیقت پوشیدہ ہے۔

انسانی تخلیق کا سوال اصل میں انسانی آزادی کا سوال ہے۔ اگر کوئی شخص یہ بات تسلیم کر لیتا ہے کہ انسان کو آزادی حاصل نہیں ہے اور اس کے تمام اعمال پہلے سے طے شدہ ہیں تو از خود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خدا کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسان سے اس کے

{۴۶} دیکھیے قرآن سورہ الشمس آیت ۸-۷

اعمال کی وضاحت طلب کرے۔ لیکن اگر یہ مانا جائے کہ انسان کو آزادی عطا کی گئی ہے اور اسے ذمہ دار بنا کر پیدا کیا گیا ہے اور وہ خدا کے وجود کو بھی پہچانتا ہے۔ چاہے وہ اس کا اعتراف کرے یا نہ کرے' البتہ یہ ضرور مانے کہ صرف خدا ہی ایک آزاد انسان کو پیدا کر سکتا تھا اور انسان کو آزادی ملی بھی تخلیق کے عمل ہی سے ہے۔ {۴۷} یہ آزادی عمل ارتقاء کا نتیجہ یا اس کی پیداوار نہیں ہے۔

آزادی اور پیداوار دو متضاد چیزیں ہیں۔ بنانا اور تعمیر کرنا خدا کی صفات ہیں محاورے کے طور پر یہی بات ہم آرٹسٹوں کے متعلق کہتے ہیں۔ لیکن آرٹسٹ صرف تصویر بناتا ہے وہ صاحب تصویر کی شخصیت کی تخلیق نہیں کرتا' بلکہ وہ اس انسان کی نقل تیار کرتا ہے جو پہلے سے موجود ہے اور جسے خدا نے پیدا کیا ہے۔ آرٹسٹ تو لاکھوں سال کی مسلسل جدوجہد اور تہذیب کے سفر کے نتیجے میں اس قابل ہوا کہ انسان کی نقل تیار کر سکے چاہے وہ روبوٹ کی شکل ہو یا کوئی دوسری ارتقائی شکل۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل انسان ہی جیسا نظر آنے والا وجود ہو' لیکن اس بارے میں یہ بات تو یقینی ہے کہ اسے انسان جیسی آزادی عمل حاصل نہ ہوگی۔ وہ تو بس وہی کچھ کر سکے گا جس کی اسے ہدایت دی گئی ہوگی یا جو بات اس کے کمپیوٹر پروگرام میں درج کر دی گئی ہوگی۔

اس پہلو سے خدا کی تخلیق کی عظمت کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی تیار کردہ تخلیق کو نہ تو از سر نو تیار کیا جا سکتا ہے نہ ہی اس کا موازنہ کسی اور چیز سے کیا جا سکتا ہے چاہے وہ کائنات میں کسی بھی زمانے میں تخلیق ہوئی ہو۔ اگر یہ مان لیں کہ تاریخ کے ایک گوشے میں ایک آزاد وجود نے از خود اپنے سفر کا آغاز کیا اور خدا کے وجود کو شامل بحث نہ کیا جائے تو تخلیق کا نتیجہ انسان کی صورت میں نکل ہی نہیں سکتا۔ وہ تو صرف اور صرف

{۴۷} کارل جیسپر کہتا ہے۔ جب انسان آزادی کا اعتراف کرتا ہے تو دراصل وہ خدا کے وجود کا اقرار کر رہا ہوتا ہے اور اگر خدا کے وجود کا انکار کیا جائے تو دراصل وہ آزادی کا انکار کر رہا ہوتا ہے۔

ایک ترقی یافتہ جانور' یا ایک ایسا وجود ہوتا جس میں ذہانت نام کی کوئی چیز نہ ہوتی' نہ اس کے پاس دل ہوتا' نہ دماغ' نہ قوت تخلیق۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کا وجود کائنات کے کسی دوسرے سیارے سے وارد ہوا ہوگا۔ کچھ اور لوگ اسے ترقی کے دور میں ہماری ہی تہذیب کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ گوئٹے نے اپنے ناول "فاؤسٹ" میں ایسے ہی وجود کا ذکر کیا ہے' لیکن وہ انسان نما حیوان یا بظاہر آدمی (Homunculus) ہے۔ یہ بات مدنظر رہے کہ اس آدمی نما حیوان اور کسی بدترین مجرم میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ انسان کو یہ آزادی حاصل ہے کہ اگر چاہے تو مسلمہ قوانین کے خلاف عمل کرے' لیکن ایک مافوق الفطرت وجود بن کر وہ اخلاقی دائرے سے باہر ٹھہر نہیں سکتا۔ نہ ہی اچھائی اور برائی سے ماوراء رہ سکتا ہے۔ نیز اپنے آپ کو الگ تھلگ بھی نہیں رکھ سکتا۔

عملی اخلاقی مشاہدوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کا نیکی کرنے کی نسبت برائی کرنے کی طرف رجحان زیادہ ہے۔ وہ نیکی کی بلندیوں میں پرواز کرنے کی نسبت' گناہوں کی پستیوں میں گرنے کی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے۔{۴۸} منفی صلاحیتوں کی حامل مثبت صلاحیتوں کی حامل شخصیات سے زیادہ معتبر محسوس ہوتی ہیں۔ مثلاً شاعر جو منفی صلاحیتوں کو بیان کرتا ہے اس شخص کی نسبت زیادہ پسند کیا جاتا ہے جو بڑے لوگوں (Heroes) کے حالات بیان کرتا ہے{۴۹}۔

انسان اچھے ہوتے ہیں یا برے' بالکل معصوم کوئی نہیں ہوتا۔ مسیحیت میں اول روز

{۴۸} ان النفس لامارۃ بالسوء۔ سورۃ یوسف:۵۳

{۴۹} ہنگری میں' وزارت تعلیم نے سماجی ورثے کے مطابق بچوں کی درجہ بندی کرائی۔ اور ان کو چھ درجوں میں تقسیم کیا گیا' لیکن عوام الناس کی طرف سے اس کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور امتیازی سلوک قرار دیا گیا۔

ہے' پیدائشی گناہ کی جو کہانی سنائی جاتی ہے اس کے پس منظر میں بھی یہی نکتہ کارفرما نظر آتا ہے۔ جنت سے نکلنے کے بعد کے لمحے سے آدم کبھی بھی خودرائی سے نجات حاصل نہ کرسکا نہ اس زمین ہی سے فرار اختیار کرسکا نہ وہ جانور یا فرشتہ بن کر اس زمین سے لاتعلق ہوا۔ انسان کو انتخاب کرنا ہوتا ہے اپنی آزادی کا۔ اس کی عظمت یا پستی کا انحصار اس فیصلے پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ آزادی عمل کے حق کو کس طرح استعمال کرتا ہے اور دراصل یہ آزادی ہی اسے دیگر مخلوق سے ممتاز کرتی ہے۔

باصلاحیت جسم کے ساتھ انسان کی ایک روح ہے' لیکن علم نفسیات روح کی سائنس نہیں ہے۔ روح کے بارے میں تو کوئی سائنس ہو ہی نہیں سکتی' علم نفسیات اندرونی زندگی کے چند ظاہری پہلوؤں کے مطالعے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نفسی فزیالوجی' نفسی علم الصحت' نفسی شماریات اور نفسی فزکس کا مطالعہ بھی ممکن ہوچکا ہے۔ مقداری نفسیات ثابت کرتی ہے کہ بیرونی، میکانکی اور مقداری نفسیات کا مطالعہ بھی ممکن ہے۔ اس سے مراد روح سے محروم فکر و خیال ہیں۔

حیوانی اور انسانی نفسیات ایک دوسری کا جزء بن سکتی ہیں۔ چونکہ نفسیات کا روح سے کوئی تعلق نہیں ہے' بلکہ اس کا تعلق صرف اور صرف نفسیاتی مظاہر سے ہے۔

جان واٹسن لکھتا ہے :

"انسانی نفسیات کی تعبیر جیسا کہ نظریہ چلن (Behaviourism) سے سمجھا گیا ہے۔ جانوروں کی علمی نفسیات کی مثال پر ہونی چاہیے جس میں مشاہدے اور مطالعے کے طریقے کو اختیار کیا گیا ہے۔ اپنی اصل شکل میں نفسیات کی دو قسمیں (انسانی اور حیوانی) تو ہر حال میں پائی جائیں جو ایک دوسرے سے الگ الگ ہوں اور جن کے درمیان آہنی پردہ آویزاں ہو' جو ایک دوسرے سے متعارف نہ ہوں جن کے مقاصد' مراحل اور طریقے مختلف ہوں' بلکہ اس کے برعکس صرف ایک قسم کی نفسیات پائی جاتی ہے جو کہ فطری

سائنس سے وجود میں آتی ہے"{۵۰}۔

ہم نے جو پیراگراف نقل کیا ہے اس پر مزید کسی تبصرے کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر ہم اسلامی اصطلاحات استعمال کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ علم نفسیات 'نفس' کی سائنس کا نام ہے۔ 'روح' کی سائنس کا نام نہیں ہے۔ یعنی یہ ایسی سائنس ہے جس کی بنیاد حیاتیات ہے۔ اس کے تین درجے ہیں' یعنی میکانکی' حیاتیاتی اور ذاتی۔ اور یہ حقیقت کے تین درجوں کے مطابق ہیں اور یہ درجے: مادہ' زندگی اور شخصیت ہیں۔ فکر کے اس دائرے سے باہر نہیں نکلا جاسکتا۔

انسانوں کے درمیان مساوات اور بھائی چارہ اسی وقت ممکن ہے جب تصور یہ ہو کہ انسان کی تخلیق خدا نے کی ہے۔ انسانوں کے درمیان برابری ایک روحانی مسئلہ ہے۔ فطری' جسمانی یا ذہنی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کا وجود انسان کی اخلاقی خصوصیت' انسانی وقار اور انسانی شخصیت کی اہمیت کے طور پر باقی رہتا ہے۔ اس کے برعکس گروہوں' معاشرتی درجوں اور سیاسی جتھہ بندیوں اور جماعتوں کے طور پر لوگ جسمانی' ذہنی اور سماجی طور پر ہمیشہ برابر رہتے ہیں۔ اگر انسان کی مذہبی حقیقت اور روحانی حیثیت کو تسلیم نہ کیا جائے تو انسانی مساوات کی بنیاد منہدم ہوجاتی ہے۔ اس صورت میں مساوات صرف ایک محاورہ بن جاتی ہے جس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ عدم مساوات اور دوسروں پر حکومت کرنے کی خواہش کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو یہ اور بھی غیراہم بن جاتی ہے۔ جیسے ہی مذہبی زاویہ فکر ہٹتا ہے دماغ نسلی' قومی' سماجی اور سیاسی عدم مساوات کی مختلف النوع شکلوں سے بھر جاتا ہے۔

انسانی عظمت حیاتیات، نفسیات یا کسی اور قسم کی سائنس سے دریافت نہیں کی جاسکتی۔ انسان کی عظمت سراسر ایک روحانی معاملہ ہے۔ عام "مشاہدات" کے بعد

{۵۰} Watson P:15

سائنس کے لئے یہ آسان ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان عدم مساوات کی تصدیق کرے۔ اس طرح "سائنسی نسل پرستی" ممکن بھی ہو جاتی ہے اور منطقی بھی بن جاتی ہے{۵۱}۔

سقراط' فیثاغورث اور مینیکا کی پیش کردہ اخلاقیات 'یہودیت' نصرانیت اور اسلام کے اخلاقی نقطہ نظر سے بہت زیادہ اجنبی نہیں تھیں اگرچہ ان میں ایک واضح تفریق نظر آتی ہے۔ دراصل صرف آسمانی مذاہب نے بغیر کسی تفریق اور الجھن کے واضح کر دیا کہ تمام انسان خدا کی مخلوق ہونے کے سبب برابر ہیں۔ البتہ افلاطون کو اس بات پر اصرار تھا کہ تمام انسان برابر نہیں ہیں۔اس کے برعکس تمام الہامی مذاہب کا اعلان رہا ہے کہ تمام انسانوں کی اصل ایک ہے اور اس لحاظ سے تمام انسانوں میں مساوات ہونی چاہیے۔ بعد کے ادوار میں روحانی' اخلاقی اور سماجی طور پر جو تبدیلیاں واقع ہوئیں ان پر اسی تصور کا عکس رہا ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ اخلاقیات سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کے درمیان مساوات اور حیات جاودانی کا تصور ہر دور میں جڑواں رہا ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کا ابھی تک تفصیلی مطالعہ نہیں کیا گیا جو مذاہب اخلاقی نظام اور حیات جاودانی کے بارے میں پیچیدہ خیالات کا شکار رہے ہیں وہ انسانی برابری کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ جب یہ مان لیا جائے کہ خدا موجود نہیں تو انسان لازمی طور پر اور بے چارگی کی حد تک غیر برابر ہونگے۔

نطشے نے دعویٰ کیا کہ مذاہب کمزور لوگوں کی ایجاد ہیں تاکہ طاقتور لوگوں کو گمراہ کر سکیں۔ مارکس نے اس سے متضاد رائے اختیار کی۔ اگر ہم یہ نظریہ تسلیم کر لیں کہ مذاہب کو گھڑا گیا ہے تو نطشے کی وضاحت زیادہ قابل اعتماد محسوس ہوتی ہے کیونکہ کمزور لوگ مذہب کی بنیاد پر ہی برابری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ سائنس اور مذہب کے علاوہ

{۵۱} ارتقائی نظریے کو مساوات یا انسانی فطری حقوق کے ساتھ نہیں جوڑا جانا چاہیے۔ بنیادی طور پر تو فرانسیسی انقلاب بھی مذہبی نوعیت کا تھا۔

دیگر نظریات نے عدم مساوات کے فیصلے پر ہمیشہ مہر تصدیق ثبت کی ہے۔

مساجد' گرجاگھروں اور دیگر عبادت گاہوں کے باہر معذور اور اپاہج لوگوں کا ہجوم کیوں ہوتا ہے؟ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس کھانے پینے اور سر چھپانے کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ جو جسمانی اور مالی طور پر کمزور ہیں' جن کا دنیا کی ایسی ہر ضیافت میں داخلہ ممنوع ہے جہاں ہر شخص سے اس کی شہرت 'اس کے خاندان' اس کی ذہنی صلاحیتوں اور اس کے علم کے متعلق پوچھا جاتا ہے ان سب کے لئے خدا نے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیئے ہیں {۵۲}۔

جو لوگ غیر تعلیم یافتہ اور بیمار ہوتے ہیں وہ فیکٹریوں کے دروازوں کے باہر قطاریں بنائے کھڑے رہتے ہیں جبکہ تعلیم یافتہ اور صحت مند لوگ ان فیکٹریوں میں داخل ہو کر اپنی جگہ بنا لیتے ہیں۔

خدا کے گھر میں ایک غریب یا نابینا شخص ایک بادشاہ یا شہزادے کے پہلو بہ پہلو کھڑا ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ غریب شخص اس بادشاہ سے بہتر ہی ہو {۵۳}۔

عبادت گاہوں کا ایک اہم تہذیبی اور انسانی پہلو یہ ہے کہ یہ انسانوں کی مساوات کو عملی طور پر ثابت کرتی ہیں۔ ادب و فن کا مطلب بھی یہی ہے کہ انسانوں کے اندر ان انسانی خوبیوں کو تلاش کیا جائے جن کو زندگی کے عام رویوں سے حقیر بنادیا گیا ہے۔ انسانی عظمت کو چھوٹی چھوٹی چیزوں اور لوگوں کی زندگی میں تلاش کیا جائے تو ایک انسان کا سماجی

{۵۲} ملاحظہ کیجئے قرآن مجید میں سورہ عبس کی آیت: ۹-۱

{۵۳} یہ مذہب یا عبادت گاہوں کی کمزوری نہیں ہے کہ وہ کمزوروں اور ناکارہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیں' بلکہ ان کی حیثیت ایسے لوگوں کے لئے آخری سہارے کی ہے۔ خدا ناشناس انسان تو کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے' لیکن خدا پرست ان کی امداد کرتا ہے اور یہ کام اس کے لئے فرض کا درجہ رکھتا ہے { ادارہ }

درجہ جس قدر کمتر ہوگا اس کی شان کی تلاش اتنی ہی اہم ہوگی۔ کلاسیکل موسیقی کی قدروقیمت بھی اسی چیز میں پوشیدہ ہے۔ {۵۴} فرانسیسی ادب نے اسی چیز پر توجہ مرکوز کی ہے۔ کازی مودو، فانتین اور جین والجین کے افکار کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔

محض صدقہ، معافی اور رواداری انسان دوستی کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ مظاہر انسان دوستی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسان دوستی کا اولین مطلب یہ ہے کہ انسان کو تسلیم کیا جائے۔ اس کی تصدیق کی جائے اس کو آزادی دی جائے اور بطور آزاد انسان اس کی قدر کی جائے۔

ہر وہ چیز جو انسان کی شخصیت کو حقیر بنا کر پیش کرتی ہو اس کا مرتبہ گھٹا کر اس کو "ناچیز" بنا دیتی ہو، غیر انسانی ہے۔ مثال کے طور پر یہ سراسر انسانی فعل ہے کہ انسان کو اس کے اعمال کا ذمہ دار بنایا جائے اور اس کو سزا بھی دی جائے۔ اس کے مقابلے میں یہ فعل غیر انسانی ہے کہ اس سے کہا جائے کہ وہ اپنے افعال پر افسوس کرے، اپنا ذہن تبدیل کرے، اپنے آپ کو بہتر بنائے تاکہ اسے معاف کردیا جائے۔ یقیناً یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کے خیالات و افعال کی بناء پر کسی شخص کو سزا دی جائے بہ نسبت اس کے کہ اسے اپنے خیالات و نظریات سے ہٹانے کی کوشش کی جائے اور اس کے "مخلصانہ رویے کو مدنظر رکھ کر" اسے اصلاح کا ایک موقع اور دیا جائے۔ تعزیرات سراسر انسانی فعل ہیں اور معذرتیں سراسر غیر انسانی فعل ہیں۔

مسیح علیہ السلام کے زمانے میں تحقیقی عدالت کے ججوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے روح کو بچانے کے لئے جسم کو جلا دیا ہے۔ موجودہ دور میں جو لوگ انسانوں کی تحقیق سے متعلق ہیں (Inquisitors) وہ اس کے برخلاف کام کر رہے ہیں وہ جسم کو بچانے کے

{۵۴} Virginia Wolf, The Common Reader

(New York: Harcourt Brace & Co. 1925)

لئے روح کو جلائے دے رہے ہیں -- انسان کی حیثیت کو صرف خریدنے والے اور بیچنے والے کی حد تک محدود کر دینا بہت بڑی زیادتی ہے' جبکہ بیع و شریٰ کے تنہا عمل میں اس کا اپنا کردار متعین ہے یہ انسان پروری کی نہیں انسان دشمنی کی مثال ہے۔ اسی طرح کسی خاص نظریے کی پیروی کروانے کے لئے اور منظم اور مکمل شہری پیدا کرنے کی کوشش اور لوگوں کو مشقیں کروانا (Drill) بھی غیر انسانی کام ہیں۔

اگر تعلیم یک طرفہ ہو' خدائی الہام سے محروم ہو اور سرکاری اہلکاروں کی ہدایات کے اندر ہو تو یہ بھی غیر انسانی بن جاتی ہے۔ تعلیم کے بعد اگر انسان آزادی سے سوچ نہ سکے' اگر وہ بنے بنائے جوابات ہی فراہم کرتا رہے' اگر تعلیم کا مقصد مختلف پیشوں اور شعبوں کے لیے ہنرمند تیار کرنا ہی ہو اور تعلیم کے ذریعے طلباء کی ذہنی سطح بلند نہ ہوتی ہو اور ان کی آزادی میں اضافہ نہ ہوتا ہو تو ایسی تعلیم سراسر بے مقصد' ضیاع وقت اور لایعنی ہے۔

انسانوں کی ملمع کاری چاہے ان کے اپنے مفاد ہی میں کیوں نہ ہو' سراسر غیر انسانی فعل ہے۔ دوسرے انسانوں کی جگہ خود سوچنا اور ان کو ان کے فرائض و ذمہ داریوں سے مبرا قرار دینا بھی غیر انسانی ہے۔ ہمیں اس بات پر یقین ہونا چاہیے کہ ہم انسان ہیں جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ صلاحیت بخشی ہے کہ وہ سوچے اور اس کو خوفناک سزاؤں سے بھی ڈرا دیا گیا ہے تو کسی دوسرے کی سوچ کا مطیع بن جانا عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ خدا نے تو انسان کو انسان بنا کر اس کے اعلیٰ ترین مقام کی تصدیق کر دی ہے۔{۵۵}

{۵۵} کیا ہم نے اس کے لیے آنکھوں کا جوڑا نہیں بنایا ہے اور زبان اور ہونٹ نہیں دیئے ہیں اور اسے دو راستے دکھا نہیں دیئے ہیں اور اسے ہموار راستے پر چلنے کے لیے مجبور نہیں کیا ہے؟ اور تمہیں کیا معلوم کہ ہموار راستہ کیا ہے؟ اس سے مراد غلاموں کا آزاد کرنا اور یتیم کو کھانا کھلانا اور بھٹکے ہوئے مسافر کو راہ دکھانا ہے۔ (قرآن کریم سورہ البلد آیت۔ ۸-۱۶)

مذہب ہو یا ہمہ وقت جدوجہد' انسانی روح کے بغیر بے معنی ہے۔ اس طرح کوئی نظریہ اعلیٰ ترین نہیں ہے اگر مذہب کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔ انسان پروری کا الحاد پرستانہ نظریہ ایک مہمل بات ہے' کیونکہ اگر خدا موجود نہیں ہے تو پھر انسان کا وجود بھی نہیں ہے {۵۶} اور اگر انسان موجود نہیں ہے تو انسان پروری کی بات ایک بے مقصد بات ہے۔ جو یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ انسان کی تخلیق کی گئی ہے وہ انسانیت اور انسان پروری کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب اس نے اپنا بنیادی معیار فراموش کر دیا ہے تو اس کے نزدیک انسانیت سے مراد مصنوعات کی تیاری اور ضرورت کے مطابق ان کی تقسیم کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ تمام لوگوں کے لئے خوراک فراہم کرنا بلا شک و شبہ بڑی اہمیت کا حامل ہے' لیکن ہمارے پر تعیش معاشرے کو دیکھ کر یہ یقین دہانی حاصل نہیں کی جا سکتی کہ اس طریقے سے ہم ایک زیادہ بہتر اور زیادہ انسان پرور دنیا وجود میں لا سکیں گے۔ اگر انسانوں کو برابر رکھنے کے چند انسانوں کے تخیل پر مبنی چند مصنوعی طریقے وجود میں لے آئے جائیں تو یہ ایک غیر انسانی فعل ہوگا۔ جیسا کہ آلڈس ہکسلے نے اپنی کتاب Brave New World میں بیان کیا ہے کہ اس دنیا میں سماجی مسائل نہ ہوں گے' عدم مساوات نہ ہوگی' انصاف ہوگا اور استحکام و خوشحالی کا دور دورہ ہوگا اور سارے انسان امن کی بانسری بجائیں گے۔

"انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہے" یہ وہ بنیادی مفروضہ ہے جس نے مادہ پرستی کیلئے بنیادی ستون کا کام دیا ہے۔ نیز قانون اور عمرانیات میں جس قدر غیر انسانی نظریات داخل ہوئے ہیں اور جنھوں نے انسان کی انسانیت کو مسخ اور رسوا کیا ہے۔ اس کے پس پشت یہی نظریہ کارفرما رہا ہے۔ خود ہمارے دور میں نازیت (Nazism) اور سٹالن ازم نے

{۵۶} Nikolai Berdyaev, The Beginning and the end. translated by R.M. French (New York: Harper 1857)

اس کی خوفناک تصویر پیش کردی ہے۔ اس طرح وہ تمام نظریات جن میں افراد کے اوپر معاشرے کو فوقیت دے دی گئی ہے اور فرد کی ذمہ داری لگادی گئی ہے کہ وہ معاشرے کی خدمت کرے' اسی زمرے میں آتے ہیں۔ انسان کسی دوسرے شخص کی خدمت پر مامور نہیں ہے۔ انسان انسان ہے کوئی چیز تو نہیں ہے۔ ہر چیز کو انسان کی خدمت پر مامور ہونا چاہیے اور انسان کو صرف خدا کی خدمت کرنا چاہیے۔ انسانیت کا یہی درست مفہوم ہے؟

باب دوم　　تہذیب و تمدن

رسوم اور رویے

انسان کے وجود کے ظہور سے ہی دو متضاد حقائق اس کے ساتھ رہے ہیں۔ ایک حقیقت کا نام "ذرائع معاش" ہے اور دوسری کا نام "عبادت کا طریقہ" ہے۔ متمدن زندگی کے آغاز میں لکڑی کے ٹکڑے یا بھدی شکل کے پتھر کو اوزار کا نام دیا گیا۔ اوزاروں کا بنایا جانا اور ان کا استعمال حیاتیاتی ارتقاء کے تسلسل کو ظاہر کرتا ہے۔ ابتدائی شکلوں سے مہذب انسان کے مکمل وجود کی صورت میں وقوع پذیر ہونے تک ارتقاء کا ظہور ہوتا رہا ہے۔ اس کا اظہار ہنر میں مہارت، زبان میں سلاست اور ذہانت وغیرہ میں ہوا۔ یہ وہ سیڑھیاں ہیں جو اپنی ماہیت کے لحاظ سے حیاتیاتی ہیں۔ ایک سخت پھل کو توڑنے کے لئے پتھر کا استعمال یا پتھر کے ہتھیار سے جانور کا شکار ایسے مظاہر ہیں جن کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ موجودہ انسان کے اجداد ایسے ہی طریقے استعمال کرتے تھے، لیکن پھر اسی انسان نے پتھر کو گھڑ گھڑا کر بت بنائے اور ان کو دیوتا کی شکل میں دیکھنا شروع کر دیا تو پھر یہ عمل تمام دنیا میں ناقابل انکار عادت کی شکل اختیار کر گیا۔ انسان کے ارتقاء میں یہ بہرحال ایک نئی بات تھی۔

اسی طرح ریت پر انسان نے جب اپنے سائے کو دیکھا اور اپنی انگلی سے سائے کے

اردگرد لکیر کھینچ دی تو پہلی انسانی تصویر وجود میں آئی۔ گویا انسان نے ایک ایسے کام کا آغاز کیا جو اس سے پہلے اور بعد میں بھی کوئی جانور انجام نہ دے سکا(۱)۔

انسانی زندگی کے ظہور کی حیاتیاتی توجیہہ گزری ہوئی تاریخ سے پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ کوئی خارجی شے اس کے ذہنی ارتقاء میں معاون بنی ہو یا انسانی روح سے پہلے وجود میں آئی ہو۔ انسان دوسری دنیا سے اس دنیا میں آیا مذہب کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ انسان آسمان سے زمین پر اترا۔

مذہب یعنی طریق عبادت اور اوزار یعنی طریق حصول معاش نے انسان کی دو متوازی تاریخوں کو مرتب کردیا ہے اور یوں انسانی تاریخ بھی ایک ڈرامہ محسوس ہوتی ہے جس کا آغاز "نغمہ بہشت" سے ہوتا ہے۔ جس کے بعد آزادی کے نظریے کی فتح ہوتی ہے اور جس کا اختتام آخری فیصلے (قیامت) پر ہوگا۔

حصول معاش کی ایک اور تاریخ ہے۔ یہ اشیاء کی تاریخ ہے اور اس کا اختتام درجہ بندی اور تقسیم سے پاک معاشرے کے قیام پر ہوگا جو کہ مادی دنیا کا نقطۂ زوال (Entropy) ہے (۲)۔ دونوں تاریخیں ایک دوسرے سے اسی طرح پیوست ہیں جس طرح مذہب اور معاش تہذیب اور تمدن کی صورت میں ساتھ ساتھ چلے آرہے ہیں۔

---

(۱) Leonardo da vinci : The Note books of Leonardo da vinci ed. Jean Paul Ritcher (New York : Dover Publications 1970).

(۲) George Hegel, Philosophy of History (Zagreb : Naprijed 1960).

سائنس دانوں کے نزدیک Entropy سے مراد ہر چیز کا لازمی طور پر ایک نہ ایک روز فنا ہو جانا ہے۔

{ مترجم }

□ زندگی کی دُوہری حیثیت کا عکس :

تہذیب اور تمدن کے متعلق ایک پیچیدگی عموماً پائی جاتی ہے۔

تہذیب کا آغاز "نغمہ بہشت" (Prologue in Heaven) سے ہوا اور اس کے بعد آرٹ' اخلاقیات اور فلسفہ ہمیشہ انسان کو اس جنت سے جوڑتے رہیں گے جہاں سے اس نے زمین کا رخ کیا تھا۔ تہذیب کی ہر چیز یا تو کسی بات کا اثبات کر رہی ہے یا اس کی نفی کر رہی ہے جس کا تعلق جنت سے ہو۔ ثقافت کا خاصہ یہی پیچیدہ بات ہے اور ہر دور میں اسی بات کو حل کرنے اور سمجھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

اس کے برعکس تمدن و حضریت یک رخی' حیاتیاتی زندگی کے تسلسل کا نام ہے یا یہ انسان اور فطرت کے درمیان مادی تبادلے کا نام ہے۔ یہ پہلو جانوروں کی زندگی سے مختلف ہے' لیکن اصل اختلاف درجے معیار اور تنظیم کا ہے۔ یہاں انسان کا سابقہ کراموسودی' ہملٹنی' اور کتابی مسائل سے پڑتا ہے۔ تنہا فرد معاشرے کی اچھائیوں کو اختیار کر لیتا ہے اور زمانے کو اپنی ضروریات کے مطابق تبدیل کرتا رہتا ہے۔

تہذیب سے مراد مذہب کے انسان پر اثرات یا انسان کے اپنی ذات پر اثرات ہوتے ہیں جبکہ تمدن سے مراد فطرت پر انسان کی ذہانت کے اثرات اور بیرونی دنیا پر اس کی کارکردگی کے اثرات ہیں۔ تہذیب کا مطلب ہے "انسان ہونے کا فن" جبکہ تمدن سے مراد سرگرم رہنے' حکومت کرنے اور چیزوں کو مکمل بنانے کا فن" ہے۔ تمدن تو زمانے کے ہمہ وقتی تبدیل ہوتے ہوئے عمل کا نام ہے۔ تمدن دراصل انسانیت بمقابلہ اشیاء (Chosism) ہے۔

مذاہب' عقائد' شاعری' کھیل' لوک گیت' لوک کہانیاں' (پرانے قصے کہانیاں) اخلاقی ضابطے' جمالیاتی زاویے' سیاسی اور عدالتی زندگی کے امور' آزادی' ربط باہم' فلسفہ' تھیٹر'

گیلریاں' عجائب گھر اور کتب خانے وغیرہ' یہ تمام پہلو انسانی تہذیب کی نہ ٹوٹنے والی لکیر ہیں۔ اس کا مطلب ہے "مقدس پہاڑ پر چڑھنا" جس کی چوٹی تک کبھی بھی پہنچا نہیں جاسکتا۔ تمثیل کے رنگ میں یوں کہیے کہ تاریکی پھیلی ہوئی ہے اور انسان کے ہاتھ میں ایک روشن شمع ہے اور وہ اس شمع کی روشنی میں تاریکی کو چیر بھی رہا ہے اور پہاڑی پر چڑھ بھی رہا ہے"۔{۳}

تمدن روحانی نہیں' بلکہ تکنیکی زندگی کے تسلسل کا نام ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ڈارون کا نظریہ ارتقاء انسانی ترقی کا ارتقاء نہیں' بلکہ حیاتیاتی تسلسل کا بیان ہے۔ تمدن ان مخفی قوتوں کی ترقی کا نام ہے جو ہمارے کم ترقی یافتہ آباؤاجداد میں موجود تھیں۔ تمدن فطری اور میکانکی عناصر کا تسلسل' ہمارے وجود کے لاشعوری عناصر کا ظہور اور اس کے تسلسل کا نام ہے۔ اس لحاظ سے اپنی ذات میں تمدن نہ اچھا ہوتا ہے نہ برا۔ انسان کو چاہیے کہ تمدن کو پیدا کرے جس طرح کہ وہ کھانا کھاتا ہے یا سانس لیتا ہے۔ یہ ہماری ضرورت اور ہماری محدود آزادی کا اظہار ہے۔ اس کے برعکس تہذیب و ثقافت' انسانی آزادی' ہمہ وقت موجود جذبہ انتخاب اور اس کے اظہار کا نام ہے۔{۴}

❏ تمدن کے میدان میں :

مادے پر انسان کا انحصار مستقل بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔ ایک سروے کے مطابق ہر امریکی مرد' عورت اور بچہ مختلف قسم کا اٹھارہ ٹن سامان سالانہ استعمال کرتا ہے۔ اس وجہ سے نئی نئی ضروریات پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں اور محروم لوگوں کی محرومیوں میں بھی

{۳} درخائم نے اشیاء کے ظاہری مطالعے کے لئے Chosism کا لفظ استعمال کیا۔

{۴} Andre' Malraux: Anti memoirs (Zagreb Naprijed 1969).

اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ تمدن انسان اور فطرت کے درمیان مادی تبادلے کو مزید سے مزید تر کردیتا ہے۔ ظاہری اور بیرونی زندگی کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھاتا ہے اور اس طرح اندر کی زندگی ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

مصنوعات سے منافع حاصل کرو اور پھر اس منافع کو فضول خرچی میں استعمال کرو۔ موجودہ تمدن کا یہ اصل الاصول ہے۔ اس کے برعکس تہذیب (اپنی مذہبی نوعیت کے حساب سے) انسانی ضروریات کو کم سے کم تر کرتی ہے یا ان کی فراہمی پر حد مقرر کردیتی ہے۔ اور اس طرح انسان کو ایک حد میں رکھ کر انسانی مرتبے پر فائز کرتی ہے۔

نفی ذات اور رہبانیت کی جتنی قسمیں مختلف تمدنوں میں متعارف رہی ہیں۔ ان کے پیچھے غیر متوازن فلسفہ کارفرما رہا ہے اور اس کی بھدی ترین تصویر آج بھی ہپیوں اور راہبوں میں پائی جاتی ہے جنھیں "گندگی کا شوق" ایک مختلف مخلوق ظاہر کرتا ہے۔

اسلام نے تو بہت وضاحت سے یہ نعرہ متعارف کرایا "خواہشات کو محدود کرو" اور وسائل کی تلاش میں کوشاں رہو۔ اس کے مقابلے میں موجودہ تمدن جس پر ایک متضاد فلسفہ حاوی ہے اس نے اس نعرے کا جھنڈا بلند کیا "نئی نئی خواہشات بار بار پیدا کرو اور انھیں ہمیشہ پیدا کرتے رہو"۔{۵} ان متضاد مطالبات کی حقیقت کو صرف اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں مظاہر اپنے ظہور میں اتفاقی نہیں ہیں۔ انسان ایک پیچیدہ وجود کا نام ہے جو انسانی فطرت کی ژولیدگی اور تہذیب اور تمدن کے اختلاف کے سنگم پر کھڑا ہے۔

انسان تہذیب کا علمبردار ہے' جبکہ معاشرہ تمدن کا علمبردار ہوتا ہے۔ تہذیب سے مراد ذاتی قوت اور تربیت ہے جو نشوونما سے حاصل ہوتی ہے۔ اس سے مراد سائنس کے ذریعے فطرت پر کنٹرول بھی ہے۔ سائنس ٹیکنالوجی' شہر اور ریاستیں تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ تہذیب کا دائرہ کار ہے فکر' زبان اور تحریر{۶}۔ تہذیب کا تمدن سے وہی ــــــ

{۵} نیویارک ٹائمز نے ایک تازہ ترین اشاعت میں اس کو نئے دور کا اولین اصول قرار دیا ہے۔

{۶} Mcluhan The Gutenberg Galaxy (Beograd: Nolit 1973) P.32.

تعلق ہے جو ماضی کی شہنشاہیت کا موجودہ دنیا سے اور ڈرامہ کا خیالی ریاست سے ہے۔

ٹیکی رس کا کہنا ہے کہ رومیوں کی نسبت دور جہالت کے وحشی اپنے غلاموں سے زیادہ اچھا سلوک کرتے تھے۔ {۷} عمومی طور پر سمجھا جاتا ہے کہ تہذیب اور تمدن کے درمیان لکیر کھینچنے کے لئے رومائے قدیم کی مثال کافی ہے۔ رہزنی اور جنگیں' ظالم حکمران طبقے' بے بس عوام الناس' غیظ و غضب سے بھرا ہوا درمیانہ طبقہ' جھوٹی جمہوریت' بے جان سیاسی ضابطے' مسیحیوں کے لئے سخت سے سخت سزائیں اور صرف دل بہلانے کے لئے انسانوں اور درندوں کے مقابلے وغیرہ' رومی تمدن' و ثقافت کے بھیانک خدوخال نمایاں کرنے والی باتیں تھیں۔ ان باتوں پر غور کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ کیا وہاں ثقافت نام کی کوئی چیز موجود بھی تھی؟۔

یونانی فلسفہ زندگی اور رومی ذہن میں نمایاں فرق ہے۔ رومیوں کے طرز عمل سے ان پر مہذب وحشیوں کا گمان ہوتا ہے۔ اس دور کا روم ایک ایسے تمدن کا مظہر ہے جو تہذیب سے محروم تھا۔

اہل میکسیکو کے تمدن کو اس کے برخلاف مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ قدیم جرمنوں اور سلاف (Slav) نسلوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ رومیوں کی نسبت زیادہ اعلیٰ درجے کے تمدن کے مالک تھے' بلکہ اس طرح جیسے مقامی ریڈ انڈین سفید فام نوآباد کاروں کے مقابلے میں زیدہ مہذب اور اعلیٰ تمدن کے علمبردار تھے۔

براعظم یورپ میں وقوع پذیر ہونے والی عظیم الشان تحریک نشاۃ الثانیہ (Renaissance) اس کی ایک تابندہ مثال ہے۔ تمدن و حضریت کا یہ دور انسانی تاریخ کا ایک درخشندہ دور ہے' لیکن تہذیبی حوالے سے یہ ماحول انتہائی زوال پذیر تھا۔ نشاۃ

{۷} Tacirus : Agricola and Germania trans. Maurice Hutton (Cambridge MA Harvard Univ. Press.).

الثانیہ کے بعد آنے والی صدی میں یورپ میں حقیقی معنوں میں ایک اقتصادی انقلاب برپا ہوا جس کے نتیجے میں مصنوعات کی پیداوار میں اضافہ ہوا، اشیاء کے استعمال میں اضافہ ہوا اور آبادی میں بھی قابل ذکر اضافہ ہوا۔

۱۳۵۰ء سے ۱۵۵۰ء تک کا زمانہ دور نشاۃ ثانیہ کہلاتا ہے اور اس انقلاب کی اکثر کامیابیاں اسی دور میں دریابرد ہوگئیں۔ نشاۃ ثانیہ نے نسل انسانی کے اجتماعی مسائل کو نظرانداز کرکے فرد کو زیادہ اہمیت دی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ نشاۃ ثانیہ حقیقت سے کاملاً نابلد ہے۔ مغربی تمدن کے عظیم الشان فنون لطیفہ بیشک اسی دور میں تخلیق ہوئے۔ لیکن مجموعی طور پر اعلیٰ انسانی قدروں کا زوال شروع ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سی یورپی ریاستوں میں آبادی میں کمی واقع ہونا شروع ہوگئی۔

چودھویں صدی کے نصف تک انگلستان کی آبادی چالیس لاکھ تھی۔ سو سال بعد اس کی آبادی اکیس لاکھ رہ گئی۔ اسی طرح چودھویں صدی میں شہر فلورنس کے باشندوں کی تعداد ایک لاکھ سے گھٹ کر ستر ہزار رہ گئی۔ گویا یورپ کی تحریک نشاۃ ثانیہ دو متضاد سمتوں میں "ترقی" کو ظاہر کررہی تھی"۔{۸}

❑ تعلیم اور تدبر :

تمدن علم کے پھیلانے اور تہذیب روشنی اور شعور کا نام ہے۔ پہلے کے لئے سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسرے کے لئے غور و فکر کی۔ اپنے آپ کو جاننے اور دنیا میں اپنا مقام پہچاننے کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ غور و فکر سیکھنے، علم حاصل کرنے اور معلومات جمع کرنے سے ہٹ کر ایک الگ چیز ہے۔ تدبر و استغراق دانائی، شائستگی، ذہنی

{۸} Bertrand Russel, History of Western Philosophy (London: 1948).

سکون اور یونانی الفاظ میں Catharsis (اندرونی تزکیہ) کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ تو اپنے آپ میں ڈوب جانے' اسرار حیات معلوم کرنے' نیز مذہبی اخلاقی اور جمالیاتی حقائق جاننے کی تڑپ کا نام ہے۔ تعلیم اور تربیت اُور کائنات کو جاننے اور بقاء کی حالتوں کو تبدیل کرنے کا نام ہے۔ سائنس کے مراحل میں مشاہدہ' تجزیہ' تقسیم اور عملی مطالعہ (Experiment) وغیرہ شامل ہیں' جبکہ تدبر کا مفہوم خالص فہم کے سوا کچھ بھی نہیں۔

نو افلاطونی فلسفے (Neo Platonism) میں اس سے مراد فوق الفطرت طریق فہم ہے۔ مشاہدہ غور و فکر، ارادے اور خواہش سے پاک ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا مشاہدہ ہے جس میں کوئی لالچ 'مضمر نہیں ہوتا۔ غور و فکر سائنس دان کا رویہ نہیں' بلکہ مفکر' شاعر' آرٹسٹ' یا گوشہ نشین کی سوچ کا نام ہے۔ ویسے ایک سائنس دان پر بھی ایسے لمحات آسکتے ہیں جن کو وہ غور و فکر کے لمحات قرار دے سکتا ہے لیکن یہ خیالات اس کے ذہن میں اس لئے نہیں آتے کہ وہ ایک سائنس دان ہے' بلکہ اس لئے آتے ہیں کہ وہ ایک انسان ہے یا ایک آرٹسٹ بھی ہے۔ (کیونکہ تمام انسان کسی نہ کسی طرح آرٹسٹ ہی ہوتے ہیں) تدبر انسان کو اپنی ذات پر اختیار دلا دیتا ہے' جبکہ سائنس فطرت پر اختیار دلا دیتی ہے۔

ہمارے تعلیمی ادارے ہمارے تمدن کو پروان چڑھاتے ہیں۔ یہ ہماری تہذیب کو پروان چڑھانے میں کوئی کردار ادا نہیں کرتے۔

ہمارے دور میں لوگ علم حاصل کرتے ہیں۔ پچھلے زمانوں میں لوگ غور و فکر کیا کرتے تھے۔ یونان کے دانا غور و فکر میں غرق رہا کرتے تھے اور وہ جب حالت استغراق میں ہوتے تو سوال کرکے نہ تو کوئی اپنی طرف انہیں متوجہ کر سکتا تھا نہ ان کی محویت کو توڑ سکتا تھا۔{۹}

{۹} Arthur Schopanhauer: The Works of Will durant

(Garden City NY. 1928).

گوتم بدھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تین دن اور تین رات دریا کے کنارے کھڑا رہا اور اپنی سوچوں میں مستغرق رہا۔ اسے وقت گزرنے کا پتہ ہی نہ چلا۔{۱۰}

سقراط کے متعلق ایسی ہی کہانی زینوفن نے بیان کی ہے :

"ایک روز وہ کسی ایسے مسئلے کے بارے میں غور و فکر کر رہا تھا جس کا اس کے پاس حل موجود نہیں تھا۔ آغاز صبح سے دوپہر تک وہ اسی حل کی تلاش میں مستغرق رہا۔ یہاں تک کہ اس کے اردگرد لوگ اکٹھے ہوگئے اور انہوں نے چہ میگوئیاں شروع کردیں۔ پھر شہر کے کچھ لوگ اپنے گھروں سے چٹائیاں لے آئے اور بیٹھ کر دیکھنے لگے کہ وہ کب تک اس حالت میں رہے گا۔ سقراط تمام رات کھڑا رہا یہاں تک کہ دوسری صبح آگئی اور سورج کے طلوع ہونے کے بعد اس کی محویت ٹوٹی اور اس نے عبادت کی رسم ادا کی"{۱۱}۔

ٹالسٹائی تمام عمر انسان اور اس کی منزل کے متعلق سوچتا رہا۔ گلیلو جو کہ یورپی تمدن کے لئے پیغمبر کی حیثیت رکھتا ہے' تمام زندگی اجسام کے زمین کی طرف گرنے کے مسئلے پر غور و فکر کرتا رہا۔

غور و فکر کرنا اور مطالعہ دو الگ الگ چیزیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دو توانائیاں دو مختلف سمتوں میں استعمال ہو رہی ہیں۔ پہلی توانائی کی بدولت بیتھوون نے "ناشنیدہ نغمگی" تخلیق کی اور دوسرے کی بدولت نیوٹن نے کشش ثقل اور حرکت کے قوانین دریافت کیے۔ سیکھنے اور تدبر کرنے کے درمیان جو مخاصمت ہے یہی مخاصمت فرد اور دنیا' روح اور دماغ اور تمدن و تہذیب کے درمیان ہے۔

{۱۰} Payet : The Art of Being Man. (Beograd : Rad 1960).

{۱۱} Xenophon: Hellenica Anahasis Apology and sympocium ed CL Brownson and o.J. todd (Cambridge MA : Harvard University Press)

□ غور و فکر کا موضوع کیا ہے؟ :

حقیقت تو یہ ہے کہ غور و فکر سے انسان کو اپنے "آپ" کے علاوہ ہر چیز مل جاتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو اپنی خودی کی طاقت سے دریافت کرتا ہے۔ یہ انسان کی خودی ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ حقیقت سے ملا ہوا ہے۔ صرف اور صرف اپنی خودی کی بدولت ایک شخص آزادی کو محسوس کرتا ہے اور اس کو بیرونی دنیا کا ادراک بھی حاصل ہوتا ہے۔ جس کا وہ بذات خود ایک عضو ہے۔کوئی فرد تنہائی ہی میں اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے کہ روح کی دنیا کا بھی وجود ہے۔ اس سوچ کے بغیر کوئی بھی فطرت سے باہر کی دنیا کے بارے میں نہیں جان سکتا کیونکہ ہر چیز کا وجود انسان کے وجود سے باہر ہے۔

تدبر اپنے اندر جھانکنے اور ڈوبنے کا نام ہے اس کے ذریعے انسان اپنی زندگی اور اپنے وجود کی تلاش سچائی کی مدد سے جاری رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غور و فکر میں وہ سوالات شامل نہیں ہوتے جن کا تعلق انسانیت یا معاشرے سے ہو' بلکہ یہ تو وہ سوال ہوتے ہیں جو انسان اپنے آپ سے کرتا ہے۔

محدود تعریف میں تدبر ذہانت کا حصہ نہیں ہے۔ ایک سائنس دان جو کسی جہاز کے لئے نیا نقشہ تیار کرتا ہے غور و فکر نہیں کرتا' سائنس دان تو سوچتا ہے' مطالعہ کرتا ہے۔ تخلیق کرتا ہے، تجربہ کرتا ہے' موازنہ کرتا ہے' لیکن یہ تمام کی تمام سرگرمیاں انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی تدبر نہیں ہیں۔ البتہ ایک شاعر' ایک راہب' ایک مفکر اور ایک آرٹسٹ تدبر کرتا ہے۔ یہ لوگ ایک عظیم سچائی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سچائی سے مراد سب کچھ بھی ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ روح کے لئے یہ سب کچھ ہے اور مادی دنیا کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔

اس لحاظ سے غور و تدبر ایک مذہبی سرگرمی ہے۔ ارسطو کے نزدیک عقل اور

غوروفکر کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا کہ انسان اور خدا کے درمیان ہے۔

بدھ مت میں عبادت صرف غوروفکر پر مبنی ہوتی ہے۔ مسیحیت میں ہمیں ایسے راہب ملتے ہیں جو غوروفکر کرتے رہتے ہیں۔ سپنوزا نے غوروفکر کو اخلاقیات کی سب سے اعلیٰ شکل اور مقصد قرار دیا ہے۔

تعلیم بذات خود انسان کو اوپر لے کر نہیں آتی نہ یہ انسان کو بہتر، آزاد یا زیادہ بہتر انسان ہی بناتی ہے۔ تعلیم انسان کو زیادہ باصلاحیت زیادہ مستعد اور معاشرے کے لئے زیادہ مفید بناتی ہے۔ تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ تعلیم یافتہ لوگ اور معاشرے بھی گمراہ ہوجاتے ہیں اور کبھی کبھار تو بگاڑ میں اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ ان پڑھ لوگوں کو بھی اپنی جہالت میں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

آمریت کی داستانیں پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ کس طرح متمدن لوگوں نے غیر منصفانہ' غیر عادلانہ' پرتشدد اور ظلم و ستم سے بھرپور جنگیں صرف اس لئے چھیڑیں کہ تعلیم یافتہ اور کم ترقی یافتہ لوگوں کی اینٹ سے اینٹ بجادیں جو اپنی آزادی کے دفاع کے لئے لڑ رہے ہوں۔ وہ لوگ جو دوسرے ملکوں پر دست درازی کرتے ہیں اعلیٰ تعلیم نے نہ ان کے ہاتھوں کو روکا' نہ ان کے قدموں کی رفتار کو سست کیا' بلکہ ان کی تعلیم نے ظلم و ستم جاری رکھنے میں ان کی معاونت کی۔ علم کی اعلیٰ ڈگریاں اور سائنس کی ایجادات زیر دستوں کے خلاف ان کا ہتھیار بن گئیں۔ انہی کی مدد سے اوروں کو زیر کرنے میں وہ کامیاب ہوگئے۔

❑ تکنیکی تعلیم اور مستند تعلیم :

موجودہ تعلیم کے متعلق تحقیق کی جائے تو ہمیں دو متضاد رجحانات کا علم ہوگا۔

* اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم دانش پر بھی مبنی ہوتی ہے اور اس میں انسانیت بھی

ہوتی ہے' لیکن اگر مروجہ اصطلاحات کو استعمال میں لایا جائے تو اس میں کلاسیکیت کی کمی اور تکنیکیت کی زیادتی محسوس ہوتی ہے۔{۱۲} آج کے ایسے نوجوانوں کے بارے میں تصور کرنا آسان ہے' جنھوں نے اسکولوں سے کالج تک تمام مراحل طے کر لئے ہیں اور اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کر لی ہیں۔ لیکن ان کو کبھی بھی نہیں بتایا گیا کہ انھیں ایک اچھا اور ایماندار آدمی بھی بننا ہے۔ آغاز میں انہوں نے حروف کی شناخت اور الفاظ کا استعمال سیکھا' پھر فزکس' کیمسٹری' جغرافیہ' سیاسی نظریات' عمرانیات' علم النسل اور دیگر بہت سے سائنسی علوم سیکھے۔ بہت سے حقائق اکٹھے کیے اور پھر سیکھا کہ کس طرح سوچا جائے' لیکن ان کو اندر کی روشنی نصیب نہ ہوئی۔ تاریخ' ادب' اخلاقیات' فنون لطیفہ اور قانون کے متعلق عموماً وہ کم ہی سنتے ہیں۔

* تمدن کے حوالے سے تکنیکی تعلیم' سبب اور نتیجے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس قسم کی تعلیم فرد کو معاشرے کے لئے تیار کرتی ہے اور اس کے دیگر تمام پہلو اسی پیمانے پر ناپے جاتے ہیں۔ اس تعلیم کی تکمیل اس پر ہوتی ہے کہ انسان عناصر فطرت پر غلبہ حاصل کر لے۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ جو تعلیم دی جاتی رہی ہے اس کا آغاز اور اختتام انسان پر ہوتا ہے۔ اعلیٰ انسانی قدروں پر نہیں۔

تعلیم اور مستند (Classical) تعلیم کے درمیان جو شدید خلفشار ہے یہ بناوٹ کا نہیں' بلکہ نظریے کا فرق ہے۔ اس کے پیچھے ایک باضابطہ فلسفہ موجود ہے۔ تعلیم کے ان دونوں نظاموں میں تہذیب اور تمدن کا فرق اپنے تمام نتائج کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔

صنعتی معاشروں' خصوصاً سوشلسٹ معاشروں میں تکنیکی اور فنی تعلیم پر خصوصی زور دیا جاتا ہے۔ اس چیز کو بطور ایک اصول کے اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے اندر بہت

{۱۲} کچھ لوگ "Exact" اور "Garammar" کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

سے انحرافات داخل ہو چکے ہیں' تاہم اصل دوڑ ابھی باقی ہے۔ روس' فرانس' چین اور جاپان میں تاریخ' قانون' اخلاقیات' ادب' لاطینی اور یونانی زبانوں کی تدریس کے لئے جو نصاب وضع کیے گئے ہیں ان سب کا مطالعہ و موازنہ بڑا مفید ثابت ہوتا ہے۔

تکنیکی تعلیم کا لازمی نتیجہ تخصیص ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ذہانت' سائنس اور صنعت ایک گروہ میں اور ایک قطار میں ہیں اور ان کا تعلق آپس میں سبب اور نتیجے کا ہے۔ ذہانت کا نتیجہ صنعت کی صورت میں نکلتا ہے اور صنعت ایک عملی سائنس ہے۔ کسی خاص میدان میں تخصیص انسانی معاشرے میں بہتر مقام کا سبب بنتی ہے۔ اگرچہ اس کے ذریعے انسان کا رتبہ کم تر ہوتا ہے تاہم اس سے معاشرے کو ترقی حاصل ہوتی ہے اور وہ زیادہ مستعد ہوجاتا ہے۔ معاشرہ تمام افراد کی صلاحیتوں کو حاصل کرلیتا ہے' لیکن سماجی میکانزم میں فرد کی حیثیت الٹی ہر لمحے کم اہم ہوتی چلی جاتی ہے۔ گویا کام کی اہمیت بے انتہا بڑھنے اور انسان کی اہمیت بے انتہا گھٹنے کے سبب انسان کام کے ماتحت ہو کر رہ گیا ہے اور اس مصنوعی طریقے سے خیالی ریاست (Uptopia) کو وجود میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تعلیم کے میدان میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی مثال دائرے میں ترقی کی ہے جہاں ترقی کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔ مثلاً ۱۹۰۰ء میں امریکہ میں چوبیس ہزار پروفیسر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تدریسی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں ان کی تعداد پچاس ہزار ہوگئی جبکہ اس صدی کے آخر میں یہ تعداد چار لاکھ اسی ہزار تک پہنچ جائے گی۔ اسی طرح امریکہ میں ۱۹۰۰ء میں تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم طلبہ کی تعداد دو لاکھ اڑتیس ہزار تھی۔ ۱۹۵۹ء میں سینتیس لاکھ ستر ہزار اور ۱۹۹۹ء میں یہ تعداد ایک کروڑ چھیالیس لاکھ تک پہنچ گئی۔

۱۹۰۰ء میں تعلیم پر امریکی حکومت مجموعی طور پر ۲۷ کروڑ ڈالر خرچ کرتی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں اس رقم کی مقدار ساڑھے بیالیس ارب ڈالر ہوگئی۔ (۱۳) سوشلسٹ ممالک میں بھی

تعلیم پر اخراجات میں اتنا ہی اضافہ ہوا' البتہ سوشلسٹ ممالک میں بہت کم خرچ سے اس کا آغاز ہوا اور ان کا گراف مغربی ممالک کے گراف کے برابر پہنچ گیا۔

دنیا کی دو بڑی سائنسی قوتیں امریکہ اور برطانیہ' دنیا کی سب سے بڑی فوجی قوت بھی ہیں' لیکن یہ دونوں ممالک دنیا کے سب سے بڑے تہذیبی ممالک نہیں ہیں۔ یہ دونوں ممالک تحقیق و تعلیم کے لئے سب سے زیادہ رقم خرچ کرتے ہیں۔ روس اپنی قومی آمدنی کا ۴ء۲ فیصد اور امریکہ ۸ء۲ فیصد خرچ کرتا ہے۔ وہ امریکی نوجوان جن کی اوسط عمریں پچیس سال ہیں وہ عموماً ساڑھے دس سال اسکول میں گزارتے ہیں' جبکہ برطانیہ کا ۲۵ سالہ نوجوان ساڑھے نو سال اور روسی نوجوان ۵ سال کا عرصہ اسکول کی تعلیم میں صرف کرتا ہے۔{۱۴} یہ کس قسم کی تعلیم ہے؟ تمدنی نقطہ نظر سے یہ مثالی (Typical) تعلیم ہے۔

اشتمالی (کمیونسٹ) ممالک میں تعلیم کا مرکز و محور ریاست کا نظریاتی اور سیاسی نظام ہوتا ہے اور یہ نظام ریاست کے مفادات کے تابع ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں سرمایہ دار ممالک میں تعلیم عموماً معاشی ضرورت کو ہم آہنگ بنانے' اور صنعتی نظام کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں تعلیم کا کردار جزوی ہے' یعنی دونوں نظاموں میں تعلیم ریاست اور نظام کی خدمت سرانجام دیتی ہے۔ یہ طریقہ ہائے کار آج تک مروج ہیں' اگرچہ دونوں طرز ہائے فکر کے حامل ممالک کی طرف سے دعوے کیے جاتے ہیں کہ انسانی شخصیت کی بہتری کے لئے اچھوتے اقدامات کیے جارہے ہیں۔

لینن نے بار بار زور دیا کہ تعلیم کو "غیر جانب دار" معروضی اور غیر سیاسی نہیں ہونا چاہیے۔ سوویت تعلیم کی پہلی کانگریس کا اجلاس ۱۹۱۸ء میں منعقد ہوا اور وہاں لینن نے یہ اصول وضع کیا :

{۱۳} Education office of the US Department of Health, Education and Welfare.

{۱۴} Data--U.S.S.R--1966

"ہمارے نزدیک تعلیم کا اولین مقصد یہ ہے کہ درمیانے طبقے کو ختم کر دیا جائے اور ہم اعلان کرتے ہیں کہ سیاست سے باہر کوئی اسکول نہیں ہے۔ یہ جھوٹ ہے' منافقت ہے" {۱۵}۔

آج تک روس کے نظام تعلیم میں' نظریاتی تعلیم بنیادی اصول کی طرح شامل ہے۔
معروف مفکر معاشیات اور آج کی دنیا میں صنعتی نظام کو نئے نئے نظریات سے متعارف کروانے والے جان۔ کے گالبرائتھ نے کہا ہے :

"جدید ہائی اسکول صنعتی نظام کی ضرورت کو مکمل طور پر پورا کر رہے ہیں ....ریاضی اور سائنس کی بنیادی اور تحقیقی تعلیم کو عرصہ دراز تک احترام حاصل رہا ہے اور یہ تکنیکی ڈھانچے کی ضرورت کی نمائندگی کرتے ہیں .... آرٹس اور معاشرتی سائنس کو کم اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کی اہمیت کم ہے .... تجارت اور تکنیکی تعلیم کے اسکولوں کو بہت زیادہ احترام حاصل ہے کیونکہ یہ معاشرے کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں .... صنعتی نظام نے تعلیم کے اندر ایک نئی روح بیدار کر دی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اسے خوش آمدید کہیں۔ اگر ان رجحانات کا جائزہ نہیں لیا جائے گا اور ان کی مزاحمت نہیں کی جائے گی' تو یہ نظام صرف جذباتی پہلوؤں کو ابھارنے اور ان کی خدمت کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کے مقاصد پر کبھی بھی بحث نہ کی جا سکے گی"۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ تمام اطراف میں پھیلے ہوئے تعلیمی نظاموں کے خواص کیا ہیں؟
سب سے پہلے یہ ایک محدود انتخاب ہے جس کی بدولت ایک تباہ کن مقابلہ پیش آتا

{۱۵}Vladimir I.Lenin: The Lenin Anthology. ed. Robert C. Tucker (New York: Norton 1975).

ہے۔ تمام علوم میں ایک مصنوعی "تخصیصی" زبان کو رواج دے دیا گیا ہے۔ اسکول بالعموم عمارت کی ضروریات اور صحت کے اصولوں کو پیش نظر رکھ کر تعمیر کیے جاتے ہیں۔ یہ دراصل ان لوگوں کی خدمت کرتے ہیں جو نوکرشاہی میں اعلیٰ تر مقام کے حامل ہوتے ہیں۔ پھر وہ سکول ہیں جو مروج صنعتی نظام کی خدمت بجالاتے ہیں اور ایسے ماہرین تیار کرتے ہیں جو ملک کے مطلوب صنعتی نظام کو اعلیٰ سے اعلیٰ قابلیت کے لوگ فراہم کرسکیں اور جو اس نظام کو اسی طرز پر برقرار رکھ سکیں۔

انسانیت کی تعلیم دینے والے اسکولوں کی بازگشت بار بار ہر جگہ سنائی دیتی ہے' لیکن یہ خوبصورت تقاریر کا حصہ ہیں اور بس۔

جو تعلیم آج کل دی جاتی ہے اگر اس کا اس نظر سے مطالعہ کیا جائے کہ اس میں تہذیبی عنصر کتنا ہے؟ تو ہم کہہ سکیں گے کہ اسکول زیادہ تر تمدن کا حصہ بن گیا ہے۔ تہذیب کا حصہ اس میں انتہائی کم ہے' چونکہ تہذیب تنقیدی سوچ پیدا کرتی ہے' اسے ترقی ملے تو انسان روحانی آزادی کے لئے سوچ بچار شروع کردیتا ہے۔

وہ اسکول جن میں بنے بنائے سیاسی اور اخلاقی ضابطوں کی تعلیم دی جاتی ہے تہذیب کے نقطہ نظر سے بنجر اور بے مقصد ہیں۔ اس قسم کی تعلیم سے آزاد ذہن رکھنے والے لوگ پیدا نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ پیدا ہوتے ہیں جو دوسروں پر انحصار کرتے ہیں۔۔۔۔ اس تعلیم سے تمدن کو تو جلا مل جاتی ہے' لیکن اس سے تہذیب و ثقافت کی روح مجروح ہوتی ہے۔

❑ عمومی تہذیب و ثقافت :

ان خیالات کی روشنی میں قاری خود اندازہ لگا سکتا ہے کہ عمومی تہذیب کا کیا مقام ہے اور آیا تہذیب تمدن کا مظہر تو بن کر نہیں رہ گئی۔ تہذیب کا اولین' مخاطب انسان

بحیثیت فرد کے ہے۔ تہذیب ایک ایسی شخصیت سے عبارت ہے جس کی انفرادیت دہرائی نہ جاسکتی ہو' جبکہ عمومی ثقافت کا مطلب عوامی آدمی ہوتا ہے۔ {١٦}انسان کا شرف اس کی آزاد روح سے ہے' لیکن عوام کی صف میں شامل ہوکر ضروریات زندگی اس کے لئے سب سے اہم بن جاتی ہیں۔ اس لئے حقیقی تہذیب و ثقافت انسان کی پرورش کرتی ہے جبکہ "عمومی ثقافت" اشیاء کی فراہمی کو مقصد زندگی بنا دیتی ہے۔ ثقافت کا رجحان انفرادیت کی طرف ہوتا ہے' جبکہ عوامی ثقافت روحانی یکجہتی سے متضاد سمت میں سفر کرتی ہے اور اس فرق سے اخلاقیات اور حقیقی ثقافت سے مختلف سمت اختیار کرلیتی ہے۔ بڑے پیمانے پر بے مقصد زندگی اور لادینی ادب کی تخلیق انسان کو نفی ذات کی طرف لے جاتی ہے۔ عمومی ثقافت انسان کی آزادی کو محدود کردیتی ہے کیونکہ آزادی تو یکسانیت کے خلاف مزاحمت کا نام ہے {١٧}۔

مقبول ثقافت کی بنیاد اتفاق رائے اور شرکت ہے جبکہ عوامی ثقافت کی بنیاد ساز باز ہے۔ اس میں رسوم ورواج' رقص' ترانے' گپ وغیرہ کسی بھی گاؤں' قبیلے یا خاندان کی مشترک متاع ہوتے ہیں اور سامعین بھی اس میں آسانی سے شریک ہوجاتے ہیں۔ جب محفل تفریح کا آغاز ہوتا ہے تو ہر شخص آکر اس میں دلچسپی لیتا ہے اور بہت رغبت سے اس میں شریک ہوجاتا ہے۔

جن ذرائع کو ذرائع ابلاغ کا نام دیا گیا ہے وہ دراصل انسانوں کی رائے کو بگاڑنے کے

{١٦} Jose Ortega Y. Grasset The Revolt of the masses (New York : W.W. Norton and Company 1932).

{١٧} Max Horkheimer : dialectic of Enlightenment trans. John Cumming (New York : Herder and Herder 1972).

اوزار ہیں' یعنی ریڈیو' ٹیلی ویژن کے پروگرام اور اخبارات' چند افراد ان کو تیار کرتے ہیں اور پروگرام لاکھوں افراد دیکھتے ہیں اور غیر شعوری طور پر ان کے مطابق ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔

۱۹۷۱ء میں کیے گئے ایک سروے سے معلوم ہوا کہ ایک عام انگریز ایک ہفتے میں سولہ سے اٹھارہ گھنٹے ٹیلی ویژن کے پروگرام دیکھتا ہے۔ {۱۸} ٹیلی ویژن نے ادب کو پیچھے ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لی ہے۔

اسی طرح ہر تیسرا فرانسیسی کتاب کا کبھی مطالعہ نہیں کرتا اور پوری فرانسیسی قوم اپنا فارغ وقت ٹیلی ویژن کے پروگرام میں صرف کرتی ہے۔ {۱۹} اس سروے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یورپ کی آبادی کا ستاسی فیصد ٹیلی ویژن دیکھنے کو ایک اہم ثقافتی فریضہ سمجھتا ہے {۲۰}۔

۱۹۷۶ء میں اسی قسم کا ایک سروے کرایا گیا' تو معلوم ہوا کہ جاپان کی صورت حال بھی ایسی ہی ہے۔ یاد رہے یہ سروے اس زمانے میں کرایا گیا تھا جب ملک میں ہفتہ کتب منایا جا رہا تھا۔ تیس فیصد جاپانی سرے سے کتابیں پڑھتے ہی نہیں ہیں' جبکہ ان میں سے ہر شخص ڈھائی گھنٹے روزانہ ٹیلی ویژن دیکھتا ہے۔

پروفیسر ہوری کاوا' جن کا تعلق سان فرانسسکو یونیورسٹی سے ہے ان کا کہنا ہے کہ نوخیز نسل کا تعلیم کی طرف رجحان یونیورسٹی کے معیار سے کافی گرا ہوا ہے۔

ہوری کاوا وضاحت کرتے ہیں کہ ادبی کتابوں کی جگہ ٹیلی ویژن نے لے لی ہے اور اس رجحان کے سبب علمی سرگرمیاں کم ہو گئی ہیں! اس طرح زندگی کے ہر مسئلے کے بارے

{۱۸} Society Trends. A Statiscal annual of the British Government.

{۱۹} Le point inquiries -- 1975.

Naoyshi Horicawa Gendai masu

{۲۰} Komyuni Keshon ron (1974). Naoyoshi Horikawa.

میں بنے بنائے جواب فراہم کردیئے جاتے ہیں اور ہمارے زمانے میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

ریڈیو' فلم اور ٹیلی ویژن بالعموم سرکاری سرپرستی میں ہوتے ہیں اور اپنے مخصوص عمل سے لاکھوں انسانوں کو گمراہ کرکے ان کی رائے بدل دیتے ہیں۔

آخر اس وحشیانہ کوشش کی کیا ضرورت ہے کہ لوگوں کے اوپر ان کی مرضی کے خلاف حکومت کی جائے؟ لیکن اس دور جدید نے یہ کام آسان کردیا ہے اور قانونی طور پر اس کا حل تلاش کرلیا گیا ہے۔ لوگوں کی رائے کو مفلوج کردیا جاتا ہے انہیں آدھے پونے مسخ شدہ حقائق دکھائے اور سمجھائے جاتے ہیں اور یوں انہیں اپنی رائے قائم کرنے، اپنے مسائل کے حل خود تلاش کرنے اور درست نتائج اخذ کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔

عوام الناس کی نفسیات اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ وہ باتیں جن کا حقائق اور سچائی سے کوئی بھی تعلق نہ ہو' انہیں بار بار دہرانے سے لوگوں کے خیالات پر گہرا اثر ڈالا جاسکتا ہے۔ {۲۱} ٹیلی ویژن کے پس پردہ یہی فلسفہ کارفرما ہے کہ یہ انسانوں کے شعور ہی نہیں' بلکہ لاشعور پر بھی اپنی گرفت مضبوط کرتا ہے۔ مخصوص نظریات ناظرین پر اس طرح لادنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ انہیں کسی نوعیت کا پروپیگنڈا نہیں سمجھتے بلکہ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہی ان کی اپنی طے شدہ رائے ہے {۲۲}۔

اس دور کے منفعت پرست (Totalitarian) معاشرے' ٹیلی ویژن میں اپنے

{۲۱} ۱۹۴۵ء تک جاپانیوں کا خیال تھا کہ میکاڈو سورج کی دیوی کا بچہ ہے اور تمام کائنات میں جاپان کو سب سے پہلے پیدا کیا گیا۔ اور اس بات کو یونیورسٹی کے اعلیٰ دماغ پروفیسر بھی تسلیم کرتے تھے۔ سٹالن ماؤزے تنگ اور کم ال سنگ کے پیروکاروں نے بھی اسی فلسفے پر عمل کیا۔

{۲۲} Ojura SusnJid Fisherman for Human Souls Belgrade: 1977

لئے بڑی خبر دیکھتے اور اس سے بہت ہوش مندی سے کام لیتے ہیں اور یوں یہ میڈیا انسان کی آزادی رائے کے لئے ایک خطرہ بن گیا ہے۔ اس کا غلط استعمال تو پولیس کے غلط رویے سے بھی زیادہ خطرناک ہے یہ تو حوالات' تھانے' جیل اور تعذیب خانے سے بھی زیادہ نقصان رساں ہے۔

میرا خیال ہے کہ اگر ہم نے اپنی آنے والی نسلوں کی ذہنی نشوونما کو نظر انداز کر دیا اور ان کو اپنے طور پر سوچنے کا موقع فراہم نہ کیا تو سنگین جرم کے مرتکب ہونگے۔ وہ افکار کی تازگی سے محروم ہونگی اور انہیں اپنی محرومی کا سبب بھی معلوم نہ ہوگا۔

دستور اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ حکمرانوں کے اختیارات کو محدود رکھا جاسکے اور اب اس چیز کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ ایسا دستور بنایا جائے جس میں ذہنی غلامی کو روکنے کے لئے اقدامات تجویز کئے گئے ہوں کیونکہ ذہنوں کو غلام بنانا جسموں کو غلام بنانے سے بدتر فعل ہے۔

جوہان ہوئزنگزا عمومی ثقافت کو "بچگانہ" قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ موجودہ انسان کا رویہ بچپنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ فرحت بخش مزاح کی کمی' سرسری تفریح' ذہنی بالیدگی کا فقدان' عوامی جلسوں اور بڑے بڑے جلوسوں کا شوق' شدت سے نفرت اور محبت' تعریف اور تنقید میں مبالغہ وغیرہ اس میں شامل ہیں۔

مشین اور ٹیکنالوجی کے بارے میں ہمیں متفرق رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تہذیب ہمیشہ "مشینوں کے خوف" کا شکار رہتی ہے۔ یہ ہمیشہ ٹیکنالوجی سے الگ تھلگ رہتی ہے۔ تمدن کا اولین گناہ مشین ہے {۲۴}۔ اس تصور کے پس پردہ یہ خیال مستور ہے کہ اولین مرحلے میں مشینوں کے ذریعے اشیاء کو قابو کیا جاتا رہا ہے اور اب ان مشینوں نے انسانوں

{۲۴} Nikolai Berdyaev: the Modern Crisis of Culture, Serbo Creatian trans. (Beograd: Hriscanska Biblioteka 1932).

کو استعمال کرنا شروع کردیا ہے۔ ٹیگور' ٹالسٹائی' ہائیڈیگر' نیزو لیتنی' فا کنر ہمیں یہی یاد کراتے رہے ہیں۔ اس کے بر عکس مارکسٹ ہنری لیفیبور کا دوسرا خیال ہے۔ وہ کہتا ہے :

"آزادی کا سب سے اعلیٰ درجہ اس وقت حاصل کیا جاسکے گا کہ جب کمیونسٹ معاشرے میں توانائی کی قوت اپنی انتہا کو پہنچ جائے گی" {۲۴}۔

ایسا معاشرہ جس کے اندر خیالی ریاست سے براہ راست یا بالواسطہ کمالات کی امید کی جاتی ہو۔ اس میں مشینوں اور ٹیکنالوجی کے بارے میں بڑے خیر خواہانہ' بلکہ دوستانہ خیالات پائے جاتے ہیں' جبکہ مشینیں انسانوں کا استحصال ہونے سے نہیں روک سکتیں' بلکہ انسانوں کا استحصال کرنے میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ جیساکہ ہم دیکھ رہے ہیں' اب تعلیم اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے یکجہتی اور یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی شخص کیا کہہ رہا ہے' کیا سن رہا ہے' کیا دیکھ رہا ہے مشینوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

☐ مضافات اور شہر :

شاعر حضرات شہروں کی زندگی کو "جہنم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ حضرات مضافاتی زندگی کے بارے میں مخصوص رائے رکھتے ہیں۔ خاص ذہنی فضا کے باعث شہروں کی زندگی کے بارے میں ان کا ردعمل ایک فطری بات ہے۔ شہروں اور شہری زندگی کے بارے میں اس ردعمل کا اظہار مذہب' ثقافت اور فنون لطیفہ کے حوالوں سے ہوتا

{۲۴}Henrilefebvre: Everyday life in the Modern World trans. Sacha Rabinovitch (New York: 1971).

ہے۔ اولین دور کے مسیحیوں کے نزدیک روم "شیطان کی بادشاہت" تھا۔ ان کا خیال تھا قیامت تک اس کی یہی حالت رہے گی' لیکن شہر کی وسعت کے ساتھ ساتھ اس نوعیت کے جذبات کم ہوتے چلے گئے۔ شہری زندگی میں انسان کو جو سہولتیں میسر آتی ہیں ان کے باعث ان کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ درس گاہوں اور صنعتی مراکز کے سبب شہر تہذیب و تمدن کے مراکز بنے اور دیہاتی زندگی کے سلسلے میں بات صرف مناظر فطرت تک رہ گئی {۲۵}۔

دیہات میں رہنے والے شخص کو یہ موقع حاصل رہتا ہے کہ وہ تاروں بھرا آسمان ' سرسبز کھیت' پھول' دریا' پودوں اور جانوروں کو جی بھر کر دیکھے۔ ایسا انسان فطرت اور عناصر فطرت کے قریب رہتا ہے۔ دیہات کے لوگ ان کی شادی بیاہ کی رسمیں' دیہاتی گیت اور تفریح کے طریقے اپنے اندر ایسے پہلو چھپے ہوئے رکھتے ہیں جن سے شہر کا رہنے والا لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

دیکھا گیا ہے کہ "شہروں" کے اندر انسان ایسے ماحول میں رہتا ہے' گویا چھوٹی چھوٹی بیرکوں میں فوجی بند ہوں یا باڑوں میں جانور قید کر دیئے گئے ہوں۔ اس کے اردگرد منافع خور صنعتوں کی تیار کردہ فضولیات کا ڈھیر لگا ہوتا ہے اور ذرائع ابلاغ کے انوکھے بلیٹن اس کی رائے کو مسلسل متاثر کر رہے ہوتے ہیں۔

یہ کہنا بہت بڑا مذاق ہے کہ ہمارے دور کا انسان پچھلے انسانوں کی نسبت فطرت' مناظر فطرت' ادب اور فنون لطیفہ کا زیادہ علم رکھتا ہے۔ اگر کچھ لوگ بڑے شہروں میں اپنے ذوق سے مجبور ہو کر عجائب گھروں کے نام سے نمائشوں اور دیگر (ادبی اور تہذیبی) محافل

{۲۵} Karl Marx and Friedrich Engels : The Communist Manifesto Princip es of Communism Trans. Paul M. Sweezy (New York: Monthly Review Press 1964).

کا اہتمام کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پورے شہر کی ضرورت پوری ہو گئی ہے۔ اس اہتمام سے وہ طلوع سحر یا طلوع سحر کے بعد زندگی کی بیداری کے منظر سے اس طرح لطف اندوز نہیں ہوسکتے جیسے کہ دیہات اور مضافات کا رہنے والا شخص ہوتا ہے۔ شہری زندگی میں تفریح کے طریقے اور ذرائع بالعموم مصنوعی ہیں' جیسے اکثر شہری فٹ بال اور باکسنگ کے میچ دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ دیہاتی آدمی زندہ ہے اور اپنی اصل کے ساتھ جڑا ہوا ہے' جبکہ شہری صنعتی کارکن مردہ ہے اور مشین کی مانند ہے۔

شہری اور دیہاتی زندگی کا ایک نمایاں اور قابل ذکر فرق یہ بھی ہے کہ دیہات میں روح کی نشوونما کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں شہروں کے باشندے اپنے تعلیمی مراکز اور تہذیبی اداروں کی فراوانی کے باوجود ایک طرح کی مشینی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس زندگی میں روحانیت کی بجائے الحادی رجحان ترقی پاتا ہے۔

❑ محنت کش طبقہ :

اس "خاص تمدن" کے اثرات سب سے زیادہ محنت کش طبقے پر مترتب ہوئے ہیں۔ فیکٹریوں میں ہونے والا کام انسان کی شخصیت کو تقریباً ناکارہ بنا دیتا ہے۔ ایک ماہر عمرانیات کا کہنا ہے :

> "صنعتی کارکن چونکہ سخت نظم و ضبط کے پابند ہوتے ہیں اور اپنی تمام صلاحیتوں کو انتظامیہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں' نیز انہیں کافی وقت ایک خاص ماحول میں ان چیزوں کے درمیان گزارنا پڑتا ہے جو فیکٹریوں میں تیار ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی عادات تقریباً مشینی بن جاتی ہیں اور یہ صورت حال سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں معاشروں میں یکساں ہے"۔ {۲۶}

ہربرٹ مرکیوس کا کہنا ہے کہ وہ ممالک جہاں اشتراکی نظام جڑیں پکڑ چکا ہے' جہاں ٹیکنالوجی غالب آچکی ہے اور انتظامیہ کا استبداد ہے وہاں کے صنعتی کارکن ایک انقلابی قوت ہونے کی صلاحیت سے محروم ہوچکے ہیں۔ استحصال زدہ طبقوں کی مثال میں سب سے پہلے صنعتی معاشرہ آتا ہے۔ جس کے افراد کو بار بار دھوکہ دیا جاتا ہے۔ اس طبقے کا تذکرہ تو کیا جاتا ہے' لیکن نہ اس سے مشورہ کیا جاتا ہے اور نہ اس کے حقوق کی درست طور پر نگہداشت ہوتی ہے۔ دنیا کے دو سب سے بڑے صنعتی طبقے' یعنی روسی اور امریکی صنعتی محنت کش' طبقے اپنے ممالک میں نہ سیاسی نظاموں میں عمل دخل رکھتے ہیں اور نہ نافذ ہونے والے فیصلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں{۲۷}۔

مذہب اور فنون لطیفہ سے الگ ہونے کے ساتھ ساتھ اس صورت حال کا ایک اور نتیجہ یہ ہے کہ اس طبقے کی سوچ تقریباً منجمد ہوچکی ہے اور محنت کش طبقے کی فکری اڑان کے سوتے خشک ہوچکے ہیں۔ اس حقیقت کو اشتراکی ادیبوں گورز''گرادی' باسو اور مالے نے تسلیم کیا ہے۔ معروف اشتراکی ادیب جیورجی لوکاکس نے ۱۹۶۵ء میں اطالوی اخبار IL-Contem poraneo کے رپورٹر سے ایک انٹرویو میں کہا :

''مارکس کے بعد لینن کے سوا کسی نے بھی سرمایہ دارانہ ترقی کے بارے میں فکری مواد مہیا نہیں کیا ہے''۔

سٹالن کے دور کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے لوکاکس کہتا ہے :

''ہر آزاد فکری رو کو دبادیا گیا اور نظریاتی قوانین پر ذاتی آراء کو فوقیت دی گئی''۔

{۲۶} امریکہ کے اداروں میں تو مافیا کی تنظیموں کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔

{۲۷} Herbert Marcuse. A Critique of Pure Tolerance (Boston : Beacons Press 1969).

حقیقت تو یہ ہے کہ مارکس کے بعد (اور مارکس کا تعلق بھی محنت کش طبقے سے نہیں تھا' بلکہ وہ بھی درمیانے طبقے سے تعلق رکھتا تھا) ہمیں نہیں معلوم کہ کوئی توانا نظریہ محنت کش طبقے کی جانب سے پیش کیا گیا ہو یہاں تک کہ پوری ایک نسل اس طرح گزر گئی کہ انہوں نے ایک بھی نیا نظریہ متعارف نہ کرایا' تاہم یوگوسلاویہ میں متعارف کرایا جانے والا نظریہ "ذاتی تنظیم" محنت کش طبقے کی پیش کش ہے جس کی وضاحت میں کچھ مشکلات حائل ہیں' تاہم یہ ایک خاص اور اصلی نظریہ ہے۔ اس نظریے کا مطلب یہ ہے کہ مروجہ نعروں سے آزادی اور نجات کا راستہ کھلا ہوا ہے۔

سرمایہ دارانہ معاشروں میں جو ہڑتالیں ہوتی ہیں وہ عموماً معاشی مسائل کے اردگرد گھومتی ہیں اور ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ کوئی نیا فارمولا وضع کردیا جاتا ہے جس میں تنخواہوں کے اضافے کا ذکر بھی موجود ہوتا ہے۔

چونکہ معاشی اصلاحات کے بعد کارکن طبقے کی مزید غربت کا آغاز نہیں ہوتا جیساکہ مارکس کو خدشہ لاحق تھا' اس لئے مختلف معاشی طبقات کے درمیان ربط باقی رہا اور مختلف معاشی گروہوں کے درمیان طبقاتی جنگ نہ ہوئی' بلکہ مختلف گروہ اپنے فرائض ایک ہی معاشرے میں ادا کرتے رہے {۲۸}۔

محنت کش طبقے کی تاریخی شکل تو یہ تھی کہ استحصال زدہ فیکٹری مزدوروں کا خاتمہ ہوجائے اور مارکس کے خیال میں استحصال زدہ طبقے کا خاتمہ اسی وقت ممکن تھا' جب

{۲۸} بظاہر تو ہڑتالوں کی بڑی اہمیت محسوس ہوتی ہے' لیکن ایسا معاملہ نہیں ہے۔ سویڈن کے ایک انسٹی ٹیوٹ نے ۱۹۷۸ء میں اعداد و شمار جمع کیے۔ دنیا کے بڑے سرمایہ دار ممالک امریکہ' برطانیہ' اٹلی اور کینیڈا میں پچھلے پانچ برسوں (۱۹۷۳-۷۸ء) میں ہڑتالیں کل وقت کے ایک فیصد حصے میں ہوئیں' گویا سویڈن میں مزدور ایک سال میں صرف چھ منٹ ہڑتال میں صرف کرتا ہے' جبکہ سوئٹزرلینڈ میں گراف اس سے بھی نیچے ہے۔

طبقات کا ہی خاتمہ ہو جاتا' لیکن مارکس کا یہ نظریہ شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ ہاتھ سے کیے جانے والے کام پر مشینیں غلبہ پا رہی ہیں اور انسانوں کی سرگرمیاں بڑی بڑی خودکار مشینوں کے تابع ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے ارتقاء اور "صنعتی مصنوعات کے اضافے" سے محنت کش طبقے کی قوت میں اضافہ نہیں ہوا' بلکہ اس سے محنت کش طبقے کا خاتمہ ہونے لگا۔ صنعتی ترقی نے مزدور کو قوت عطا نہیں کی' بلکہ پیداوار کی فیصلہ کن قوت کی حیثیت میں سماجی اہمیت ٹیکنیکل ذہن کو حاصل ہو گئی۔ انقلابی رومانویت اور فکری خیال پرستی کی جڑیں غائب ہو چکی ہیں۔ ٹیکنوکریسی جو کہ ایک خالص عقلی اور دل سے محروم قوت ہے اور جو مشینی تمدن کا حاصل ہے منظر پر آ رہی ہے۔

مذہب اور انقلاب :

تہذیب' معیشت' معاشرے اور سیاست کے دائروں میں اچانک انقلاب کبھی بھی نہیں آیا۔ ہر حقیقی انقلاب ایمان' انصاف' خواہشات' قربانی' محنت اور قوت کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ تمام جذبات منافع اور مادی شکل سے محروم ہوتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو انقلاب میں حصہ لیتا ہے یا جو انقلاب کے مراحل کو ترتیب سے وقوع پذیر ہوتے دیکھتا ہے وہ انقلابی تصورات کو عملی شکل میں بھی وہاں موجزن دیکھتا ہے۔ حکومت کی برطرفی یا حکومت کے کارندوں کی تبدیلی اسے انقلاب محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے آپ کو تاریخی انقلابی عمل میں شریک ہی نہیں پاتا۔ اس چیز کی بدولت سمجھا جا سکتا ہے کہ آج کا سرمایہ دارانہ معاشرہ انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت سے محروم کیوں ہے' جبکہ شعراء' فنکار اور مذہبی گروہ اپنے اعلانات میں اس کا اعادہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر اندر سے جائزہ لیا جائے تو انقلاب اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے جس طرح مذاہب اثرانداز ہوتے ہیں اور

اس کے کچھ دیگر مقاصد بھی ہوتے ہیں۔

ایسا معاشرہ جس کے اندر قربانی اور یکجہتی کے جذبات اور یکساں منزل کا شعور ہو' وہ "حالت مذہب" میں ہوتا ہے' جس کی وجہ سے لوگ محسوس کرتے ہیں کہ وہ بھائی' بہنوں کی طرح ہیں۔

وہ معاشرہ جو مذہب کے لئے جگہ نہیں نکال سکتا انقلاب کے لئے بھی موزوں نہیں ہے۔ وہ ممالک جہاں مذہبی جوش و جذبہ پایا جاتا ہے وہی ممالک انقلاب کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ بھائی چارے' اعتماد' اتحاد اور انصاف کے جذبات اصل کے لحاظ سے تو مذہبی ہیں' لیکن اس دنیا کے انقلاب نے ان کو دنیاوی انصاف اور دنیاوی جنت تک محدود کردیا ہے۔

مذہب اور انقلاب دونوں کی ابتداء انتہائی ناموزوں' ناموافق اور شدید حالات میں ہوتی ہے اور ان کا خاتمہ سہولت اور سکون کے ماحول میں ہوتا ہے اور مذہب و انقلاب کی جدوجہد جتنی شدید ہوتی ہے ان کی زندگی بھی اتنی ہی طویل ہوتی ہے۔ دراصل مذہب اور انقلاب حقیقی بننے کے مرحلے میں ایسے ادارے اور نظام بھی تیار کرتے جاتے ہیں جو ان کا گلہ گھونٹنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ سرکاری ادارے نہ مذہبی ہوتے ہیں نہ انقلابی۔

اگر انقلاب کے کچھ دشمن مذہب میں موجود ہوں تو وہ عموماً سرکاری مذہب میں ہوں گے' یعنی کلیسا اور کلیسا کے منتظمین۔ (۲۹) اسی طرح نوکر شاہی مذہب کے اندر اپنے مخالفین کی بو سونگھتی ہے' یعنی جس مذہب کی صرف ہڈیاں باقی رہ گئی ہوں نوکر شاہی

---

(۲۹) فاضل مصنف کے پیش نظر اس دور کا یورپی عیسائی معاشرہ ہے جس میں کلیسا اور بادشاہت کا اس طرح گٹھ جوڑ تھا کہ عوام کو لوٹنے اور کچلنے میں دونوں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ عمل صالح سے خالی ہمارا مذہبی معاشرہ بھی اس کی مثال ہوسکتا ہے۔ حقیقی مذہبی معاشرہ نہ سرکاری ہوتا ہے نہ فلاح انسانیت کے کاموں سے محروم۔ (ادارہ)۔

اس میں سے اپنے معاون تلاش کرتی ہے۔ ایک غلط انقلاب ہی ایک جھوٹے مذہب کے ساتھ باقی رہ سکتا ہے۔

❑ ترقی --- انسان کے خلاف سرگرم :

امریکی سائنس دان جولیس رابرٹ اوپن ہائمر امریکی ہائیڈروجن بم کا موجد ہے اس کا کہنا ہے کہ انسان نے پچھلے چالیس برسوں میں اس قدر مادی اور تکنیکی ترقی کرلی ہے جتنی کہ اس نے سابقہ چالیس صدیوں میں نہیں کی تھی۔ ۱۹۰۰ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک انسان جو فاصلہ طے کرچکا ہے اس کی نسبت $۱۰^{۱۰}$ سے $۱۰^{۴۰}$ تک پہنچ گئی ہے۔ درجہ حرارت $۱۰^{۵}$ سے $۱۰^{۱۱}$۔ فضائی دباؤ $۱۰^{۱۰}$ سے $۱۰^{۱۶}$ تک پہنچ گیا ہے ...... تیس برسوں میں پرانے پسٹن انجن کی جگہ نیوکلیائی کشتیوں سے چلائے جانے والے ماڈلز لے لیں گے۔ وہ دن قریب آرہا ہے جب بجلی کی تاریں زیر زمین نہ بچھائی جائیں گی بلکہ برقی گاڑیاں سڑکوں پر دوڑتی نظر آئیں گی {۳۰}۔

جین روستان نے حیاتیات کی جادوئی قوتوں کے متعلق گوہرافشانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں : بے انتہا ذہین لوگوں کے مادہ توارث کو الگ کرکے اور اس کا استعمال کرکے انسانیت میں انقلاب --- برپا کردیا جائے گا۔ اگر سائنس دان مصنوعی طور پر ڈی این اے (DNA) (کروموسومز کے اندر پایا جانے والا توارثی شناخت کا کیمیکل) تیار کرنے پر قابو پاگئے تو لامحدود نئے مواقع پیدا ہوجائیں گے۔ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق بچہ حاصل کرسکے گا۔ دماغ جس میں اب تک تو دس ارب خلیوں کا پتہ لگایا گیا ہے۔ ان میں

{۳۰} Julius Robert Oppenheimer "On Science and culture: Encounter (October 1962).

چند ارب اور خلیوں کا اضافہ کیا جاسکے گا چاہے ان کو کہیں سے حاصل کیا جائے یا مصنوعی طریقے سے تیار کیا جائے۔ مرنے والے افراد کے اعضاء اور جسم کے مختلف حصوں کی دوسرے افراد میں پیوند کاری ایک معمول کا کام بن جائے گا اور جب یہ دریافت ہو جائے گا کہ ایک خاص مدت کے بعد دماغ کام کرنا کیوں بند کر دیتا ہے' تو قدیم دور کے انسانوں کی یہ تمنا پوری ہو جائے گی کہ نیند کا دورانیہ کم کر کے زندگی کو طوالت بخش دی جائے۔ ترقی یافتہ ممالک میں اقتصادی امکانات کے سبب یہ ممکن ہو جائے گا کہ ایک ہفتے کی طوالت میں کمی کر دی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک ہفتے میں کام کا دورانیہ تیس گھنٹے تک محدود کر دیا جائے' جبکہ سال صرف نو ماہ پر مبنی ہو۔

امریکہ میں ۱۹۶۵ء میں چھ کروڑ نوے لاکھ کاریں تھیں۔ چھ کروڑ ٹیلی ویژن سیٹ تھے اور ستر لاکھ بجرے اور کشتیاں تھیں۔ امریکہ میں صرف اس سال (۱۹۶۵ء) میں تیس ارب ڈالر چھٹیوں کی تفریحات پر خرچ کر دیئے گئے۔ امریکہ میں لوگوں کے پاس جو چیزیں موجود ہیں اس کا چالیس فیصد سامان تعیش پر مبنی ہے۔ ایک اور جائزے سے پتہ چلا ہے کہ امیر ممالک جو دنیا کا ایک تہائی ہیں سامان زیبائش پر پندرہ ارب ڈالر سالانہ خرچ کرتے ہیں= ان ممالک میں جو معیار زندگی ۱۸۰۰ء میں تھا آج یہ معیار اس سے پانچ گنا زیادہ بلند ہو چکا ہے اور اگلے سات برسوں میں یہ آج کی نسبت پانچ گنا اور بلند ہو جائے گا اور اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اس صورت حال کے بعد ہم اپنے آپ سے پوچھ سکتے ہیں کہ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی پانچ گنا زیادہ پر مسرت اور پر سکون ہوگی؟ اور اس کا فیصلہ کن جواب ہے کہ نہیں۔

امریکہ جو دنیا کا امیر ترین ملک ہے' ۱۹۶۵ء میں یہاں پچاس لاکھ جرائم کیے گئے' جبکہ آبادی میں اضافے کی نسبت خطرناک جرائم میں اضافے کی شرح چودہ گنا زیادہ تھی۔ جرائم میں اضافے کی شرح ایک سو اٹھتر فیصد تھی' جبکہ آبادی میں اضافے کی شرح تیرہ فیصد تھی۔

اس امیر ترین ملک امریکہ میں ہر بارہ سیکنڈ کے بعد کوئی نہ کوئی جرم سرزد ہوتا ہے' ہر ایک گھنٹے بعد ایک قتل ہو جاتا ہے' ہر پچیس منٹ کے بعد زنا کا واقعہ ہو جاتا ہے' ہر پانچ منٹ کے بعد ایک ڈاکہ پڑتا ہے اور ہر ایک منٹ کے بعد ایک کار چوری ہوتی ہے (۳۱)۔

اس ملک میں جرائم کی رفتار اور رجحان میں خطرناک اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں ایک لاکھ باشندوں میں تین اعشاریہ ایک قتل ہوتے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں پانچ اور ۱۹۶۷ء میں نو قتل۔ گویا سولہ سال کے اندر اندر قتل ہونے والوں کی تعداد تین گنا بڑھ چکی ہے۔

مغربی جرمنی میں ۱۹۶۶ء میں بیس لاکھ جرائم درج ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں چوبیس لاکھ تیرہ ہزار۔ پچھلے دس برسوں میں عملاً قتل کیے جانے والے افراد کی تعداد میں پینتیس فیصد اضافہ ہوا' جبکہ سکاٹ لینڈ میں اسی مدت کے دوران میں خوفناک جرائم کی شرح میں سو فیصد اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک قتل کی وارداتوں میں ۹۸ء۲ فیصد اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں پھانسی کی سزا کے خاتمے کے بعد بھی اس شرح پر کچھ اثرات مرتب ہوتے نظر نہیں آتے۔

عوام الناس کی آراء سے مرتب کیے جانے والے چند گوشواروں سے معلوم ہوا کہ اہل فرانس اپنی روزانہ مصروفیات میں دنگے فساد کو سرفہرست رکھتے ہیں۔ جرائم خصوصاً نوجوانوں سے سرزد ہونے والے جرائم میں بے انتہا اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک فرانس میں چوریوں کی تعداد میں ایک سو ستر فیصد اضافہ ہوا۔ اسی طرح بلجیم میں ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۸ء تک جرائم کی رفتار میں دگنا اضافہ ہو گیا۔

ستمبر ۱۹۷۳ء میں ماہرین جرائم کی ساتویں بین الاقوامی کانفرنس بلغراد میں منعقد ہوئی۔ اس میں متفقہ طور پر اعتراف کیا گیا کہ تمام علاقوں میں جرائم کی تعداد میں ناقابل فہم حد تک اضافہ ہوا ہے۔ اس صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے امریکہ کے ماہرین جرائم

---

(۳۱) FBI Report 1965.

نے یہ رائے دی کہ ہمارا معاشرہ گناہگاروں کا سمندر ہے اور ہر شخص کم یا زیادہ گناہگار اور مجرم ہے اور اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

۱۹۷۰ء میں اقوام متحدہ نے دنیا کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی۔ اس میں بیان کیا گیا کہ ایک ترقی یافتہ صنعتی معاشرے میں (ملک کا نام نہیں دیا گیا) اٹھارہ سال سے کم عمر کے مجرموں کی تعداد (جن کا پولیس سے سابقہ پڑتا رہتا ہے) ۱۹۵۵ء میں دس لاکھ تھی اور ۱۹۶۵ء میں چوبیس لاکھ ہو گئی {۳۲}۔

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل نے اپنی ایک رپورٹ میں بتایا کہ "چند ترقی یافتہ ممالک کو جرائم کا شدت سے سامنا ہے۔ مادی ترقی کے موجودہ دور میں کہ انسانی زندگی ہر لحاظ سے پر آسائش ہے مختلف قسم کے ذاتی اور گروہی جرائم' چوریاں' دھوکے بازیاں' بدعنوانی اور منظم ڈکیتیاں' وقوع پذیر ہو رہے ہیں' جنہیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو ترقی کے جدید طریقے اپنانے کی سخت قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔

روسی ماہر نفسیات' ہداکوف نے گوشوارے شائع کئے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں جنگ عظیم دوم کے بعد شراب نوشی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۶۰ء کے عرصے میں شراب اور نشہ آور اشیاء کے استعمال میں دوگنا اضافہ ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں اضافہ تین گنا کے قریب تھا' ۱۹۷۰ء میں ۳ء۴ گنا اور ۱۹۷۳ء میں ۵ء۵ گنا۔ اس کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ عورتوں اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں شراب کے استعمال میں اضافہ ہو رہا ہے {۳۳}

برطانیہ کے ایک خیراتی فلاحی ادارے "Offered Help" نے جو اعداد و شمار شائع

{۳۲} UN Report: The Situation of the World in 1970 (Paris: UNESCO).

{۳۳} UN S.G. Report Prevention and Fighting against Criminality (Paris--1972).

کیے ہیں۔ ان کے مطابق برطانیہ میں' ۱۹۷۳ء میں چار لاکھ شرابی تھے اور ان میں اسی ہزار عورتیں تھیں۔ رپورٹ کے مطابق نشہ کرنے والی ہر دوسری عورت نفسیاتی ہسپتال کی مریض بن جاتی ہے اور ہر تیسری عورت کا انجام خودکشی ہوتا ہے۔ یورپ میں شراب کا سب سے زیادہ استعمال فرانس میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد اٹلی اور روس میں۔ شراب نوشی کے نتیجے میں واقع ہونے والی اموات کے گراف میں مغربی برلن سب سے آگے ہے جہاں ہر لاکھ افراد میں ۴۴٫۳ کی موت شراب نوشی کی وجہ سے ہوتی ہے جبکہ فرانس میں ہر لاکھ افراد میں سے ۳۵ افراد شراب نوشی کی کثرت سے مرتے ہیں۔ آسٹریا میں ہر لاکھ افراد میں سے ۳۵ شراب نوشی سے مرجاتے ہیں (۳۴)۔

ہماری صدی میں شراب نوشی دولت مند اور ترقی یافتہ ممالک کے لئے ایک عظیم مسئلہ بن چکی ہے۔ پہلے لوگ شراب نوشی کا رشتہ جہالت' قدامت اور غربت سے جوڑتے تھے اور امید کی جاتی تھی کہ شاید کچھ بہتری ہوجائے لیکن اب کچھ ایسے مسائل پیدا ہوگئے ہیں کہ نہ جن کی شناخت ہی ممکن ہے اور نہ ان کا ذکر ہی کیا جاسکتا ہے اور ان سماجی برائیوں کی علامات کسی بھی دوسرے ملک کی نسبت سویڈن میں سب سے زیادہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ رائے ایک سویڈش ماہر کی ہے۔ سویڈن والوں کو یہ مسئلہ درپیش ہے کہ ہر دسواں شخص خواہ وہ مرد ہو یا عورت کثرت سے شراب نوشی کا عادی ہے۔ حکومت سویڈن نے الکحل کے استعمال پر بھاری ٹیکس اور اضافی سرچارج عائد کیے' لیکن اس کے اثرات بہت معمولی تھے۔

عریانی اور برہنگی (Pornography) کی بھی یہی بنیادیں ہیں۔ فرانس' ڈنمارک اور مغربی جرمنی جو اپنے آپ کو سب سے زیادہ مہذب کہتے ہیں ـــــ عریانی اور برہنگی میں

---

(۳۴) Hodakov. Lydia Hodakova: Sociology of work (Bratislava: SPN 1968).

بھی ان کا نام سرفہرست ہے۔ ۱۹۷۵ء سے فرانسیسی سینما گھروں میں جو فلمیں دکھائی جاتی ہیں ان کا نصف برہنہ فلموں پر مبنی ہوتا ہے صرف پیرس شہر میں دو سو پچاس سینما گھر ان فحش فلموں کے لئے مخصوص ہیں۔ جو لوگ سدھار چاہتے ہیں وہ اس صورت حال سے پریشان ہیں۔

معروف ماہر نفسیات پروفیسر بلانکرڈ نے اس صورت حال کی وضاحت اس طرح کی : ''مختلف ممالک میں جو نظریہ اپنالیا گیا ہے وہ انسانوں کے شریفانہ جذبات کو بڑی تیزی کے ساتھ کچل رہا ہے۔ اس نظام میں سونے' جاگنے اور سفر کرنے وغیرہ کے جو طریقے وضع کیے گئے ہیں عام لوگ بے جان مشینوں کی طرح ان کی پیروی کرتے ہیں --- اس طرح ظاہری زندگی میں تھوڑا سا سٹینڈرڈ تو حاصل ہوجاتا ہے لیکن انسان اپنے اصلی شرف سے یکسر محروم ہوجاتا ہے۔ ہر چیز پہلے سے ہی تیار ملتی ہے حتیٰ کہ ایام تفریح اور تعطیلات بھی پہلے سے طے شدہ اور پروگرام کا حصہ ہوتی ہیں۔ کوئی انہیں تبدیل کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے اکثر لوگ چاہتے ہیں کہ اس جکڑ بندی سے بھاگ نکلیں 'نئے تجربات کریں اور یہ مقصد برہنہ فلمیں دیکھ کر حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ {۳۵} حتیٰ کے وہ کھیل جن میں کامیابی یا ناکامی اتفاق پر مبنی ہوتی ہے وہ بھی اس ناقص تمدن کا شکار ہوگئے ہیں۔ ان کے اندر بھی شراب نوشی برہنگی اور دیگر قباحتیں داخل ہوگئی ہیں۔ دنیا کے جو بڑے بڑے تمدنی و ثقافتی مراکز ہیں وہ جوئے کے مراکز بھی ہیں۔ مثلاً : داؤول' مونٹ کارلو' میکاؤ اور لاس ویگاس وغیرہ۔ بحراوقیانوس کے اردگرد کسی بھی شہر میں ایک بڑے جوئے خانے (Casino) میں چھ ہزار افراد تک سما سکتے ہیں۔ سرکاری

{۳۵} Kenneth H. Blanchard and Paul Hersey : Management of Organizational Behaviour. Utilizing Human Resources (Engle wood Cliffs 1972).

اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں فرانسیسیوں نے ایک سو پندرہ ارب فرانک رقم اتفاقی انعام کی سکیموں میں لگائی جب کہ امریکہ میں پندرہ ارب ڈالر اس کام میں خرچ کیے گئے۔ ہنگری کا ہر تیسرا باشندہ لاٹری کے ٹکٹ خرید تا ہے۔ اتفاقی انعام اور لاٹری وغیرہ میں سب سے زیادہ دلچسپی سویڈن کے لوگ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اسرائیل اور ڈنمارک اس کے عادی ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان معائب کا گراف تھوڑے فرق کے ساتھ تہذیبی گراف کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ نیویارک پولیس نے جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں۔ ان کے مطابق ۱۹۶۳ء میں اس شہر میں تیئس ہزار نوجوانوں کو ہیروئن اور دیگر نشہ آور اشیاء کا عادی پایا گیا' جبکہ اصل تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔ تیئس ہزار کو پولیس نے رجسٹرڈ کیا تھا۔ نیویارک کے ہنٹر کالج میں طلبہ کی نصف تعداد میری جوانا (Marijuana) کا استعمال کرتی ہے اور اس کا استعمال زیادہ خطرناک نشے کے آغاز کی علامت ہوتا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ان آباد اور خوشحال ممالک میں ایک اداس نسل ابھر آئی ہے جن کے پاس ہر چیز موجود ہے' کسی چیز کی کمی نہیں۔ یہ لوگ عرف عام میں "دھتکاری ہوئی نسل" (ٹھکرائی ہوئی نسل) کہلاتے ہیں جنہوں نے بے مقصدیت کے فلسفے کو پھیلایا۔ ہپی' کانوں کے ہڑتالی کارکن اور ایسے ہی دوسرے لوگوں نے تمام اصولوں اور تمام نظاموں کا مذاق اڑایا اور ان کی سوچ اور طور طریقے دنیا کے تمام بڑے شہروں میں پھیل گئے۔

یہ خیال کرنا غلط ہے کہ نوجوانوں نے جو بغاوتیں کی ہیں وہ سیاسی یا نظریاتی ہیں۔ مثال کے طور پر امریکہ اور فرانس میں جو بغاوتیں ۱۹۶۸ء میں ہوئیں۔ امریکہ میں جو بغاوت ہوئی' وہ "امریکی نظام" یا "امریکی نوکرشاہی" کے خلاف تھی' جبکہ فرانس میں ہونے والی بغاوت فرانس کے قواعد اور ضوابط کے خلاف تھی۔ غرض دونوں صورتوں میں یہ بغاوت تمدن کے بہتر پہلوؤں کے خلاف تھی۔

یوگورا مالقا کے مطابق یہ دراصل صنعتی معاشرے کی پیداواری اخلاقیات کے خلاف مزاحمت تھی۔ کچھ اور لوگوں نے اسے "بلا سبب بغاوت" قرار دیا۔ مالروکس نے اسے نوجوانوں کی غیر منطقی "لڑائی" قرار دیا۔ اگر اخلاقی نقطہ نظر سے غور کیا جائے تو حقیقتاً یہ غیر منطقی لڑائی ہی ہے۔

جدید امریکہ کے ایک ممتاز جج آرتھر ملر کا کہنا ہے:

"نوجوانوں کے جرائم شہروں تک محدود نہیں رہے ہیں' بلکہ قصبوں تک پھیل گئے ہیں۔ یہ صرف سرمایہ دارانہ معاشرے کا ہی نہیں' بلکہ اشتراکی معاشرے کا بھی المیہ ہے۔ یہ مسئلہ غربت سے ہی پیدا نہیں ہوتا' بلکہ خوشحالی اور دولت مندی کے باوجود موجود ہے' یہ نسلی مسئلہ نہیں ہے نہ ترک وطن ہی کا نتیجہ ہے اور نہ خالصتاً امریکی مسئلہ ہی ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اپنی موجودہ شکل میں یہ ٹیکنالوجی کا نتیجہ ہے جو کہ انسان کا مرتبہ بحیثیت انسان گرا دیتی ہے اور اسے حقیر بنا دیتی ہے"(۳۶)۔

مختصر یہ کہ لگتا ہے جیسے انسانی وجود سے روح شرافت غائب ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دو بڑی جنگوں کی وحشت نے انسانوں کو بے راہرو بنا دیا ہو یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ٹیکنالوجی نے انسان کو ایک مشین بنا کر رکھ دیا ہو۔

خود کشیوں کا تناسب اور نفسیاتی امراض کا گوشوارہ اس ثقافت و تمدن کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ نفسیاتی طریقہ علاج کے مطابق یہ عجیب بات سامنے آئی ہے کہ زندگی کے معیار کے بہتر سے بہتر ہونے کے ساتھ انسان کا اطمینان قلب روبہ انحطاط ہے اور یہ شکایت ایک امریکی ماہر نفسیات نے کی ہے۔ جن ممالک نے زیادہ ترقی نہیں کی وہاں خود کشیوں اور نفسیاتی امراض کے مریض بھی کم تعداد میں ہیں۔ یہ بات ہمیں یہ سوچنے پر

---

(۳۶) امریکہ میں ہائی اسکول کا طالبعلم اسکول کی تعلیم ختم ہونے سے پہلے ٹی وی پر قتل کی اٹھارہ ہزار وارداتیں دیکھ لیتا ہے۔

مجبور کر رہی ہے کہ ترقی آخر کس مرض کی دوا ہے۔

امریکہ میں ہر ہزار میں سے چار افراد نفسیاتی و دماغی امراض کے ہسپتالوں میں داخل ہیں۔ نیویارک سٹیٹ میں دماغی ہسپتالوں میں داخل ہونے والے مریضوں کی تعداد ۵ء۵ فی ہزار ہے اور تمام امریکی ہسپتالوں میں نصف بستر دماغی امراض کے مریضوں کے استعمال میں ہوتے ہیں۔ ہالی وڈ میں دماغی امراض کے مریضوں کی تعداد دنیا کے کسی بھی شہر سے زیادہ ہے۔

امریکی پبلک ہیلتھ سروس نے ۱۹۷۸ء میں ایک سرکاری رپورٹ شائع کی۔ اس کے مطابق ہر پانچواں امریکی شدید ذہنی و اعصابی صدمے (Break Down) کا شکار ہے یا اس کے قریب پہنچنے والا ہوتا ہے اس نتیجے کی بنیاد معقول شواہد اور تجزیے ہیں۔ ۱۹ سے ۷۹ سال کی عمر کے بالغ امریکیوں کا تجزیہ کیا گیا تو ان کی تعداد لاکھوں میں تھی اور یہ گیارہ کروڑ دس لاکھ امریکیوں کے نمائندے تھے {۳۷}۔

سویڈن میں خودکشی کرنے والے' شراب پینے والے اور ذہنی امراض کا شکار لوگ بہت بڑی تعداد میں ہیں' جبکہ قومی آمدنی' شرح تعلیم ' روزگار اور سماجی تحفظ کے معیار کے لحاظ سے بھی یہ ملک سب آگے ہے۔

۱۹۶۷ء میں سویڈن میں ایک ہزار سات سو دو خودکشیاں رجسٹر ہوئیں۔ ۱۹۶۶ء کے سال سے یہ اضافہ نو فیصد زیادہ تھا اور ۱۹۶۰ء سے تیس فیصد۔

۱۹۶۸ء میں عالمی ادارہ صحت نے مختلف ممالک کے درمیان خودکشی کی شرح کے تناسب کے گوشوارے جنیوا سے شائع کیے۔ اس فہرست میں پہلی آٹھ پوزیشنیں مغربی جرمنی' آسٹریا' کینیڈا' ڈنمارک' فن لینڈ' ہنگری' سویڈن اور سوئٹزر لینڈ نے حاصل کیں۔

{۳۷} ۱۹۷۷ میں تین کروڑ انیس لاکھ مریضوں کا ذہنی علاج ہوا۔ ایک کروڑ امریکی شراب پینے کی وجہ سے مختلف بیماریوں کا شکار ہوئے۔

ان آٹھ ممالک میں ان مردوں کی فوتیدگی کی تیسری وجہ خودکشی ہے جن کی عمر ۱۵ اور ۴۵ سال کے درمیان تھی' پہلی وجہ دل کی بیماریاں تھیں اور دوسری وجہ کینسر کا مرض۔ عالمی ادارہ صحت کی ۱۹۷۰ء کی رپورٹ میں واضح طور پر کہا گیا کہ یہ سلسلہ صنعتوں میں اضافے' شہری زندگی میں اضافے اور خاندانی نظام کے ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اگر کسی ایک معاشرے یا ایک قوم میں اس عمل کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ جس قدر تعلیم پھیل رہی ہے اور ترقی ہو رہی ہے یہ معائب بھی اسی تناسب سے پھیل رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یوگوسلاویہ میں سب سے زیادہ سلووینیا ترقی یافتہ ہے جہاں شرح تعلیم اٹھانوے فیصد ہے' لیکن وہاں ہر لاکھ میں سے ۲۵ء۸ افراد خودکشی کرتے ہیں' کم ترقی یافتہ کوسوو میں جہاں شرح تعلیم ۵۶ فیصد ہے۔ خودکشی کی شرح ۳ء۴ فی لاکھ ہے۔ گویا دونوں جگہ کا تناسب سات نسبت ایک کا ہے۔ یہ صورت حال ۱۹۶۷ء میں تھی۔

عوامی صحت کے انچارج ڈاکٹر انتھونی رائل کے مطابق برطانیہ کی یونیورسٹیوں میں خودکشی کی شرح قومی شرح سے چھ گنا زیادہ ہے اور برطانیہ کے نوجوان جس شرح سے خودکشی کرتے ہیں' کیمبرج میں اس کی شرح دس گنا زیادہ ہے۔ اس معاملے پر بھی غوروخوض کی ضرورت ہے کیونکہ برطانیہ کے طالب علم عموماً دولت مند خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر وہ سرکاری وظائف پر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

یہ کہنا تو بہرحال ناانصافی ہوگا کہ یہ مظاہر صرف مغربی ثقافت کے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید تمدن نے جس صورت میں جس جگہ بھی ترقی کی ہے اس کا نتیجہ بہرحال یہی برآمد ہوا ہے۔ امریکہ' جرمنی' برطانیہ یا سویڈن کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ جاپان کے متعلق بھی صحیح ہے اگرچہ وہ دنیا کے نقشے میں دوسری سمت پر واقع ہے اور اس کا منطقہ بالکل الگ ہے۔ جاپان کے معاملے میں اعداد و شمار اگر کچھ الگ ہیں تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہاں معاشرتی روایات اور خاندانی نظام کسی حد تک باقی ہے {۳۸}۔

یہ صورت حال جس کا ساری دنیا کو سامنا ہے اس کی تمام وجوہات پر روشنی ڈالنا تو

ناممکن ہے' تاہم نوجوانوں میں نشے کی وجوہات کا سلسلہ والدین سے جاملتا ہے۔ ڈاکٹر ولاد تاجوروک جو کہ یوگوسلاویہ کے ماہر نفسیات ہیں لکھتے ہیں : "ایک خاندان جو مکمل طور پر تباہ ہوگیا ہو یا جو تباہی کے دہانے پر ہو ایک نوجوان کے دماغ میں ایسے عارضے پیدا کردیتا ہے کہ وہ ذہنی دباؤ سے نجات حاصل کرنے کے لئے "حفاظتی طریقوں" کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ والد اور والدہ کی تقسیم یا بٹی ہوئی محبت اور خاندان کا انتشار جوکہ تمام دنیا میں عام ہورہا ہے ایک ایسا ماحول پیدا کردیتا ہے جس سے اندرونی طور پر ناراضگی پروان چڑھتی ہے اور بیرونی دنیا میں اس کا اظہار بغاوت یا ناراضگی کی صورت میں ہوتا ہے پھر ایسی منفعل' مضمحل اور قابل رحم حالت آجاتی ہے کہ انسان منشیات کا استعمال کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

راجہ راول ہاورڈ کے عمرانیاتی تحقیقی مرکز کے منتظم اعلیٰ ہیں انہوں نے تجویز دی کہ امریکہ کی سینیٹ میں ایک خصوصی کمیٹی تشکیل دی جائے جو جائزہ لے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے انسان اور معاشرے پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ حالات میں انسان کی زندگی تیس سال تک بڑھائی جاسکے گی' لیکن یہ ایک خشک اور بے مزہ زندگی ہوگی"۔

مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے ہٹ کر انسانی زندگی میں پر آسائش لمحات گزارنے کا تصور دھندلا ہے۔ مثال کے طور پر پراٹسٹنٹ ممالک کی نسبت کیتھولک ممالک میں سماجی گروہ زیادہ فعال ہیں {۳۹}' جبکہ خودکشیوں اور جنسی بیماریوں کی تعداد کا گراف بھی اس کے برعکس ہے۔

جس "مادہ تولید" سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے یہ وہ نہیں ہے جس کا سائنس اور

{۳۸} Anasaki: The Crisis of Japanese Culture (1969).

{۳۹} برطانیہ کی نسبت فرانس میں تنخواہیں دوگنی ہیں اس طرح ہالینڈ میں تین گنا ہیں۔

ارتقائی حیاتیات نے انیسویں صدی میں تذکرہ کیا ہے۔ انسان صرف اپنے حواس کے بل پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ {۴۰} آسائشیں اور ان کے ساتھ پیدا ہونے اور بڑھنے والی ذہنیت کسی بھی نظام اخلاق سے وابستگی کو یا تو کم کردیتی ہیں یا بالکل ختم کردیتی ہیں۔ {۴۱} تمدن نے ہماری زندگی کو شعور عطا نہیں کیا' بلکہ یہ تو ہمارے وجود کی امنگوں کا مظہر ہے اور یوں بعض ادوار میں حقیقی انسانی شعور سے متصادم بھی ہوتا ہے' یعنی صحیح اور نفع رساں انسانی تمدن نہیں ہوتا۔

تہذیب کے ہاتھوں انسان کبھی بھی اتنا مجبور نہیں ہوا ہے جتنا کہ وہ اس معاملے میں مجبور ہوا ہے کہ وہ آلات اور اوزار تباہ نہیں کیے جاسکتے جو انسانوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کی تباہی و بربادی اور ہلاکت کے لئے تیار کیے ہیں۔ انسان اپنے ہی ہاتھوں اپنے جیسے انسانوں کو تباہ و برباد کرتا ہے اور تہذیب و ثقافت کی علامتوں کو اجاڑ دیتا ہے یہ فرق زندگی اور مشین کا ہے۔ یہ فرق زندگی کے مصنوعی اصولوں اور سچے اصولوں کا ہے۔

تمدن کی یلغار کے سبب برازیل کے جنگلوں کا دس سے پندرہ مربع کلومیٹر رقبہ ہر سال نئی سڑکیں بنانے کی وجہ سے غائب ہوجاتا ہے۔ سرسبز و شاداب مقامات کو ریگستان نگل رہے ہیں۔ فیکٹریوں کے استعمال شدہ پانی اور کچرے سے امریکہ میں صاف پانی کا اسی فیصد خراب ہوجاتا ہے۔ ٹینیسی میں تانبے کی ایک بہت بڑی فونڈری ہے جس کے دھوئیں نے بیس ہزار ایکڑ زمین کو صحرا میں بدل دیا ہے۔ تانبے کے بخارات اور کالک کی چادر نے برطانیہ میں ۱۹۵۲ء میں چار ہزار افراد کو صرف ایک دن میں ہلاک کردیا تھا۔ امریکہ میں فیکٹریوں کی دھوئیں کی چمنیاں اور گاڑیاں ۲۳ کروڑ ٹن سالانہ مختلف قسم کے گیسی مواد فضا میں بھردیتی ہیں۔ فرانسیسی بجلی گھروں نے ۱۹۶۰ء میں ایک لاکھ چودہ ہزار ٹن سلفر گیس

{۴۰} Schopenhauer.

{۴۱} دیکھئے قرآن کریم سورہ الفرقان آیت ۔ ۷۷

اور آٹھ کروڑ بیس لاکھ ٹن کوئلے کی راکھ خارج کی اور ۱۹۶۸ء میں یہ اعداد و شمار دگنے ہوگئے ہیں، اگرچہ بہت سے حفاظتی اقدامات کیے گئے تھے۔ مغربی جرمنی کے رہرعلاقے میں ستائیس ہزار ٹن سالانہ صنعتی گرد و غبار ہر قصبے میں پھیل جاتا ہے۔ برطانیہ اور سوئٹزرلینڈ کے شہروں میں جہاں شہروں پر ہروقت دھند چھائی رہتی ہے پچھلے برسوں میں شریانوں کے کینسر میں بیس گنا اضافہ ہوچکا ہے۔ اسی طرح امریکہ میں بھی شریانوں کے کینسر میں بیس گنا اضافہ ہوچکا ہے۔ ٹوکیو میں پاناگاچوراہے کے تجزیے سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں سے گزرنے والے مسافروں میں ہرانچاس میں سے دس کے خون میں جست کی مقدار میں دو گنا سے سات گنا اضافہ ہوچکا ہے اور اس کی اہم ترین وجہ وہ دھواں ہے جو گاڑیوں سے خارج ہوتا ہے۔

اپنی ایجاد کے بعد سے کاروں نے حادثات میں اتنے زیادہ انسانوں کی جان لی ہے جتنے کہ تمام جنگوں میں بھی قتل نہیں ہوئے {۴۲}۔

یہ ناممکن ہے کہ موجودہ مادی تمدن کو چھوڑے بغیر ان تمام آفات کا مقابلہ کیا جاسکے۔ حقیقی انسانی تمدن جن اقدار سے متعارف ہے ان میں سے کوئی بھی عریانی اور الکحل کے استعمال کی اجازت نہیں دیتی۔ حقیقت یہ ہے کہ سماجی برائیوں کا فروغ اخلاق سے عاری اور اعلیٰ انسانی اقدار کو نظرانداز کردینے والے تمدن کا عطیہ ہے اس تمدن کو راہ راست پر لانے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ عقل و شعور سے مزین تہذیب ہے۔ چونکہ مادی تمدن کے نقطہ نظر سے سائنس مذہب کی طرف رجوع نہیں کرسکتی اس لئے اصلاح احوال کے مواقع میسر نہیں آتے۔

{۴۲} Norbert Timan at the International Conference on Roadway Security Paris 1976.

❑ ادب کی کوتاہ نظری :

ابسن' ہیدگر' میلر' پنٹر' بیکٹ' اونیل' برگمان' کامس' انتونینی جیسے مغربی ادیبوں نے جن کا تعلق نام نہاد ترقی یافتہ اور تہذیب یافتہ ممالک سے ہے ایک نئے فلسفے کو متعارف کرایا ہے۔ لیکن اس طرح کہ گویا کسی خطرے کو متعارف کرا رہے ہوں۔ وہ سائنس دان جو اشیاء کی بیرونی ماہیئت پر یقین رکھتے ہیں وہ کچھ وجوہ کی بنیاد پر بہت زیادہ پرامید نظر آتے ہیں' جبکہ دوسرے مفکرین اور اہل فن عموماً مشکلات کا شکار رہتے ہیں۔

سرسری مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ مروجہ تعلیم' سماجی فلاح کی ضمانت تو ہے' اس نے فی کس آمدنی کے مناسب ذرائع بھی پیدا کیے ہیں' لیکن اس کا ایک نمایاں نقص یہ ہے کہ اس نے قنوطیت کو پروان چڑھایا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں سکنڈے نیویا کے ممالک کی پالیسی یاسیت پر مبنی رہی ہے۔ قنوطیت سے مراد یہ احساس ہے کہ انسان کا انجام بڑا المناک ہے ۔ انسان کی کوششوں کا نتیجہ تاریکی اور ضیاع کی صورت ہی میں نکلے گا۔ یہ فلسفہ ان علاقوں میں بھی اختیار کیا گیا جہاں اس صدی کے آغاز میں پڑھے لکھے لوگ موجود نہ تھے' بلکہ یورپ کا جنوبی حصہ تو اس وقت جہالت کا شکار تھا۔ ۱۹۰۶ء میں بلغاریہ اور سربیا میں ان پڑھ لوگ ستر فیصد تھے۔ اٹلی میں ۴۸ فیصد' ہسپانیہ میں ۳۶ فیصد' ہنگری میں ۴۳ فیصد اور آسٹریا میں ان پڑھ لوگوں کی تعداد ۳۹ فیصد تھی۔ ہمیں حیرت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ سویڈن کے اندر معاشرتی فلاح کے لئے جو پروگرام ہیں وہ دنیا بھر میں سب سے بہتر ہیں' لیکن پھر بھی وہاں ذہنی بیچارگی کی عجیب حالت ہے اور یقیناً یہ اس وجہ سے ہے کہ مسرت کا احساس روحانی اطمینان کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔

معاشی اور سیاسی زندگی کی سرگرمی سے قطع نظر موجودہ ثقافت حقیقی روحانی سکون

دینے سے عاری ہے۔ آج کے زمانے کے انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں انسانی زندگی کی اس بے چارگی کو "لغو ڈراموں" (Absurd Plays) میں عموماً پیش کیا جاتا ہے۔

تمدن کے اندر سہولت زندگی کا بیرونی اظہار اور بے مقصدیت اندرونی اظہار ہوتی ہے۔ فلسفے کے الفاظ میں گفتگو کی جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر نعمتیں آرام اور آسائشیں میسر ہوں گی' انسان اندرونی طور پر اتنا ہی کھوکھلا اور مایوس ہوتا چلا جائے گا۔ اس کے برعکس ابتدائی ادوار کے معاشرے غریب بھی تھے اور ان کے اندر معاشی استحکام بھی نہ تھا' لیکن ان زمانوں کے انسان کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زندگی مسرتوں اور مستحسن جذبات سے آراستہ تھی۔ ابتدائی معاشرے کے لوگوں نے جو ادب تشکیل دیا ہے جسے "لوک ورثہ" کہا جاتا ہے۔ اس کے اندر انسان صحیح انسانی جذبات سے محروم نہیں' بلکہ غیر معمولی جذبات واحساسات کا مالک نظر آتا ہے۔ بے چارگی اور لاپروائی اور عدم اطمینانی کے جذبات ان غریب معاشروں میں عنقا تھے {۴۳}۔

تھیٹر اور ڈرامے کے ذریعے زیادہ تر ہماری مہذب دنیا کے "انسانی المیے" دکھائے جاتے ہیں' جبکہ مزاحیہ کھیلوں اور پرانی طرز کے نغموں میں ابھی تک امید کی روشنی باقی ہے۔ سنجیدہ ڈرامے ناامیدی پھیلاتے ہیں یوں تو انسان نے اپنے گرد پردہ تان لیا ہے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ ہر لحاظ سے مکمل ہو چکا ہے' لیکن موجودہ ڈرامے اس ہالۂ نور کو چاک کرتے رہتے ہیں۔

سائنس بڑے بڑے اعداد و شمار کے ذریعے مصنوعات کی بڑھتی ہوئی ترقی' پیداواری شرح میں اضافے' توانائی اور انسانی قوت کے استعمال وغیرہ پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہے' لیکن ادب و فنون انسان کے ذہنی اور اخلاقی قحط' تشدد' بہیمیت اور کھوکھلے پن کا اظہار کرتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں بھی امیر و کبیر ممالک کے طاقتور اور دولت مند خاندانوں کے

{۴۳} Galupo's Inquiry "The Whole Mankind's Opinion" 1976.

اندر لاچار' بے کس اور بے بس ہزاروں انسان ملتے ہیں جو اپنی سزا بھگت رہے ہوتے ہیں۔

ڈرامے کی طرح شعر و نغمہ کے خالق شاعر بھی انسانیت کے لئے منفی (Sensor) کردار ادا کرتے ہیں۔ شعراء اپنے خوف اور اپنے جذبات کے ذریعے واضح کرتے رہتے ہیں کہ انسان کا سفر انسانیت کی طرف نہیں' بلکہ کھلم کھلا عدم انسانیت اور تنہائی کی طرف ہے۔

یاسوناری کواباتا نے ۱۹۶۸ء میں جاپان کا ادبی نوبل انعام حاصل کیا اور ۱۹۷۱ء میں اس نے خودکشی کر لی۔ ۱۹۶۹ء میں ایک اور عظیم جاپانی ناول نگار یوکیو مشیما نے خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کیا۔ ۱۸۹۵ء کے بعد سے تیرہ جاپانی ناول نگاروں اور ادیبوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ خودکشی سے کیا ہے۔ ان میں "Rashoman" کا مصنف رائیونوسوکو اکوتگاوا بھی شامل ہے جس نے ۱۹۲۷ء میں خودکشی کی۔۔ جاپانی معاشرے کے ساتھ یہ المیہ روایتی جاپانی ثقافت کے بتدریج خاتمے اور مغربی مادہ پرستانہ خیالات کے بتدریج ابھرنے کے ساتھ چل رہا ہے۔

شعراء اور المیہ نگاروں کے نزدیک اس کی جو بھی حیثیت ہو' لیکن یہ سچائی ہے کہ موجودہ تمدن کا پروردہ انسان مائل بہ تنزل اور حقیقی اطمینان سے محروم رہے گا اور اس کے عدم اطمینان سے انسانیت کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا۔

اپنی موت سے ایک سال قبل کواباتا نے لکھا "انسان دوسرے انسانوں سے گویا ٹھوس دیوار کے ذریعے الگ ہو گئے ہیں اور ان کے درمیان محبت کی ترسیل بند ہو چکی ہے۔ ترقی کے نام پر فطرت کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔

اپنے ناول "برف کی سرزمین" میں جو ۱۹۳۷ء میں چھپا کواباتا نے اپنے احساسات و تصورات کو بیان کرتے ہوئے موجودہ دنیا میں انسان کی تنہائی اور علیحدگی کو کئی بار بیان کیا ہے۔

تہذیب کے عام بڑے بڑے نمائندے تمدن کی صورت میں انسانیت کی ناکامی اور انسانیت کی موت دیکھتے ہیں۔ آندرے مالراکس انیسویں صدی کی امیدوں اور آسوں کو مدنظر رکھتا ہے اور کہتا ہے :

"یہ یورپ ہے جو انسانی خون کے دھبوں سے بھر گیا ہے اور تباہ ہوگیا ہے۔ یورپ نے انسان کا وہی خون آلود نقشہ تیار کرلیا ہے جو وہ تیار کرنا چاہتا تھا" (۴۴)۔

اسی قسم کی تصویر پال ویلری نے جنگ عظیم اول کے بعد کھینچی تھی :

یورپ کی ثقافت کے بارے میں کوئی چیز واضح نہیں رہی ہے۔ علم بھی ایسا ہے جو کسی بھی چیز کو بچانے میں ناکام رہا ہے۔ یہاں سائنس ہے جس نے اخلاقی قدروں کو تباہ کردیا ہے۔ انسانیت کو ذبح کرنے کے بعد جو نظریہ باقی رہ گیا ہے وہ شکوک و شبہات' جرائم اور حرص و ہوس کا ملغوبہ ہے۔ مذاہب تک خالص نہیں رہے اور اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔ صلیب' صلیب کے خلاف اور ہلال' ہلال کے خلاف صف بستہ ہے۔ شکوک و شبہات پھیلانے والے لوگ معتبر ہیں۔ وہ بداعتمادی پھیلانے والے واقعات کو ہوا دے رہے ہیں۔ وہ ہمارے جذبات کے ساتھ اس طرح کھیلتے ہیں جس طرح بلی چوہے سے کھیلتی ہے۔ شکوک و شبہات کے مارے ہوئے یہ لوگ بھی اپنا اعتماد کھو دیتے ہیں اور کبھی دوبارہ بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ اس تخریب کاری میں اپنے دفاع کی صلاحیتوں اور حواس کو استعمال کرتے ہیں (۴۵)۔

دنیا کے انتہائی تہذیب یافتہ اور امیر ممالک میں انکار مذہب اور فلسفہ لغویت (Absurdism) کے آثار ظاہر ہوچکے ہیں۔ اس فلسفے میں کائنات بے مقصد' انسان

---

(۴۴) UNESCO Conference 1954. Maulrax's Speech.

(۴۵) Paul Valery: Collected Works. ed. Jackson.

ٹوٹ پھوٹ اور زوال کا شکار اور مخلوق خدا گونگی بہری ہے۔

اپنی اصل میں یہ ایک مسموم فلسفہ ہے جیساکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے۔ یہ دراصل رد عمل ہے ان کمزوریوں کا جو روحانی یا مذہبی دائروں میں پیدا ہوگئی تھیں۔ یہ انسان کی مزاحمت کا اظہار ہے۔ انسان کے اس دنیا کے ساتھ عدم تعلق کی علامت ہے اور یہ ایک ایسی صورت میں آگے بڑھ رہا ہے جس میں اس کے وجود کی شناخت ہی نہیں ہے۔ یکسمتی جدوجہد کے خلاف یہ انسان کی بغاوت کا نام ہے {۴٦}۔ انہی وجوہات سے کچھ لوگ موجودہ لامذہبیت کو بھی مذہب کا حصہ سمجھتے ہیں اور ہمارے خیال میں یہ بات بے بنیاد نہیں ہے۔

لغویت (Absurdism) اور انکار مذہب (Atheism) دونوں ہی حقیقت پسندانہ طرز فکر کی نفی کرتے ہیں۔ یہ دونوں نظریے بتاتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں اجنبی ہے۔ انکار مذہب نجات کا راستہ تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے' جبکہ مذہب نے زندگی کا راستہ تلاش کرلیا ہے۔

تمدن نے سائنس' اقتدار اور دولت کے ذریعے انسانی مسرت کا راز دریافت کرنے کی کوشش کی' یہ راز تو دریافت نہ ہوسکا' لیکن یہ ثابت ہوگیا کہ جب تک انسان کو سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے گی انسانیت کا مسئلہ لاینحل رہے گا۔

☐ ترک و انکار مذہب (NIHILISM) :

ترک مذہب کو خدا کی نفی نہ سمجھا جانا چاہیے۔ اگرچہ اہل مغرب نے اپنے تمام

{۴٦} Mathews, vol. 10: History and Politics

(New York: Pantheon Books 1956)

نظاموں سے خدا کو خارج کر رکھا ہے' لیکن دراصل ترک مذہب کا یہ نظریہ خدا کی تلاش کا ایک دوسرا طریقہ ہے۔ انکار مذہب کا رویہ سائنس کی نہیں' بلکہ مذہبی طرز فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ بیکٹ کے الفاظ میں : "ترک مذہب انسان کی عدم موجودگی کے خلاف احتجاج ہے"۔ ژاں پال سارتر کا مشہور فقرہ ہے کہ "انسان ایک بے مقصد وجود ہے"۔ مادہ پرستی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر جذبات نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اس لئے ہر چیز بے مقصد بن جاتی ہے جیساکہ سارتر کے جملے سے محسوس ہو رہا ہے۔

مادہ پرستوں نے انسان کی حیاتیاتی حقیقت کو تسلیم کرلیا ہے' لیکن ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اس کائنات میں انسان کا کوئی خصوصی منصب اور کردار نہیں ہے اور جب انسان بے مقصد ہے تو پوری کائنات بھی بے مقصد بن جاتی ہے۔

اس کے برعکس مذاہب انسان کا اور کائنات کا مقصد تخلیق سب سے پہلے بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد مذہب اور کائنات میں ہم آہنگی ثابت کرتے ہیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ خدا کی تلاش کا جذبہ بذات خود مذہبی جذبہ ہے' لیکن ہر تلاش کا نتیجہ خیز ہونا لازمی نہیں ہے۔ مادہ پرست' زمانہ پرست اور دہریے سمجھتے ہیں کہ انسان کے مرنے کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوجاتا ہے' جبکہ مذہب حیات بعد الموت کو اہم ترین عقائد میں شمار کرتا ہے۔

موجودہ زمانے کے ایک اہم ترین فلسفے لغویت (Absurdism) کی طرف دیکھئے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر چیز بے مقصد اور فضول ہے حتی کہ زندگی' کائنات اور انسان بھی بے مقصد پیدا کیے گئے ہیں۔ اس نظریے کے پس پشت یہ چیز کارفرما نظر آتی ہے کہ انسان اپنے آپ کو اتنی بڑی کائنات میں تنہا اور اجنبی محسوس کرتا ہے۔ اسلام نے انسان کے اس مسئلے کو سمجھ لیا ہے اور بامقصد زندگی' نیز اگلی دنیا کے لئے تیاری کا مقصد پیش کرکے انسانی زندگی کو بامقصد بنا دیا ہے۔

البرٹ کامس کے خیالات ایک مایوس شخص کے خیالات ہیں جو کہتا ہے :

"ایک ایسی دنیا میں جس سے روحانی روشنی کو خارج کردیا جائے۔ انسان اپنے آپ کو اجنبی ہی محسوس کرے گا۔ تب انسان ایک ایسے راستے پر نکل کھڑا ہوتا ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی مجھ سے پوچھ گچھ نہ کرے گا اور میں اپنے ہر کام میں آزاد ہوں کیونکہ میں مر کے مٹی جاؤں گا" {۴۷}۔

قارئین محسوس کریں گے کہ یہ آواز مایوسی کی آواز ہے۔

فلسفہ وجودیت (Existentialism) نے اخلاقی آزادی کے بارے میں وہی راستہ اختیار کیا ہے جو مذہب نے اختیار کررکھا ہے۔ سارتر لکھتا ہے :

"آغاز میں انسان کسی بھی قدروقیمت کا حامل نہیں ہوتا۔ یہ تو اس کے انفرادی طرزعمل پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو اچھا بناتا ہے یا برائی میں ڈھال لیتا ہے اور اس کا انحصار بھی اس چیز پر ہے کہ وہ آزادی عمل تسلیم کرتا ہے' یا اس کا انکار کرتا ہے۔ بہرحال انسان کی آزادی کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ موت بھی نہیں"۔

جن لوگوں نے ہپیت والے طرز زندگی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے وہ دراصل فلسفہ وجودیت ہی کا تسلسل ہیں" {۴۸}۔

{۴۷} Jean Paul Sarter The Emotions of a Theory

(New York Citadal Press 1971).

{۴۸} تمدن کے اوپر تنقیدی محاسبے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسے رد کردیا جائے۔ اگر ہم چاہیں بھی تب بھی تمدن کو ختم نہیں کرسکتے۔ جس چیز کو ختم کرنے کی ضرورت ہے وہ اس تمدن کے بارے میں دوہکلا تصورات ہیں۔ اس معیار کو توڑ دیا جائے تو دنیا انسانیت سے زیادہ ہم آہنگ ہوجائے گی۔

باب سوم اخلاقیات

ذمہ داری اور نفع اندوزی

ذمہ داری اور منفعت اگرچہ ایک دوسرے کے ساتھ متصادم ہیں لیکن زندگی کی جدوجہد میں دونوں ہی قوت متحرکہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان دونوں کا موازنہ بہرحال نہیں کیا جاسکتا۔ ذمہ داری منفعت سے ہٹ کر ایک عنصر ہے اور اس کا معروف معنوں میں اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اخلاقیات فنی یا منطقی چیز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ایک جلتے ہوئے گھر میں داخل ہو کر مردہ بچے کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لاتا ہے تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے غیر ضروری کام کیا؟ کیونکہ بچہ تو مر ہی چکا تھا۔ اخلاقیات اسی چیز کا نام ہے کہ بظاہر جو چیز بے مقصد قربانی محسوس ہوتی ہو' اس کو قدر و قیمت کا حامل بنایا جائے۔ بالکل اس طرح جیسے "فن تعمیر کا مقصد تباہ شدہ کھنڈرات کو دوبارہ تعمیر کرنا ہوتا ہے"۔

انصاف کی شکست ہم پسند نہیں کرتے' چاہے شکست خوردہ کے ساتھ ہماری ہمدردیاں بھی ہوں۔ اس شخص کو ہیرو کا درجہ دیا جاتا ہے جو بے انصافی کے لئے لڑ رہا ہو۔ اس دنیا سے مراد زمان و مکان کی دنیا ہے اور اس میں فطرت انصاف و بے انصافی سے لاتعلق نہیں رہتی۔ ہیرو کا قربانیاں دینا بھی بے مقصد محسوس ہوتا ہے۔ کسی موقع پر اس

قانون فطرت کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو خدا کی وحی کا ظہور ہوتا ہے اس میں ایسی دنیا کی باتیں بتائی جاتی ہیں جو کہ اس دنیا سے مختلف ہے اور دائمی ہے۔ اگرچہ اس دنیا کے معاملات ہم عقلی طور پر نہیں سمجھ سکتے' لیکن ہم اس سمجھ میں نہ آنے والی دنیا کی دل سے تصدیق کرتے ہیں۔

عاقبت' یعنی دوسری دنیا ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے' ہم اس کی توضیح کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن نفاذ انصاف کے لئے اس کی ضرورت ہمیں محسوس ہوتی ہے۔ بہادری کا کارنامہ سرانجام دینے والے ہیرو کی شکست ہمیں پسند نہیں ہے۔ اس لئے ایک دوسری دنیا ہمارے لئے ضرور ہونی چاہیے جس میں ظاہری طور پر ناکام نظر آنے والے افراد کو پورا پورا انصاف ملے۔ جن لوگوں نے اپنی مسرت' اپنی آزادی حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی اعلیٰ مقصد کے لئے گنوادی لیکن اس دنیا میں ناکام رہے ایسے لوگوں کا اجر اس دوسری دنیا میں دیا جائے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا مطلب ہوگا حق مغلوب ہوگیا اور انصاف نافذ نہ ہوسکا۔

حقیقی انسانی زندگی کو مدنظر رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اخلاقیات اور اخلاقی امور کی عقلی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ وحی کی رہنمائی قبول کرنا لازمی ہے اور اس کے اندر مذہب کی عملی دلیل چھپی ہوئی ہے۔ عقل کہتی ہے اخلاقی رویہ یا تو بے مقصد ہے یا اس کا کوئی اور مطلب ہے دراصل اس کا معنی اور اصل مفہوم تو خدا کے وجود میں چھپا ہوا ہے۔ کوئی تیسرا جواز ممکن نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ یا تو اخلاقیات کو توہمات کا مجموعہ قرار دے دیں یا یہ سچائی قبول کرلیں کہ انسان ازلی و ابدی خدا کے ساتھ دائمی طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ اس طرح انسان کا اخلاقی رویہ بامعنی اور بامقصد ہوسکتا ہے۔

ہماری دنیا میں کم تعداد میں ایسے لوگ ہیں جو نیکی کے قانون کے مطابق عمل کرتے ہیں، یہ مختصر سی اقلیت ہی انسانیت کے لئے باعث احترام ہے۔ ہماری زندگی میں بھی بہت کم لمحات گزرتے ہیں جن میں ہم اپنے قانونی فرائض تمام کے تمام ادا کرتے ہوں گے'

لیکن وہی لمحات، جب ہم اپنے منافع اور معلوم فوائد کو پس پشت رکھ دیتے ہیں ' ہماری زندگی کا حاصل ہوتے ہیں اور کبھی فراموش نہیں کیے جاسکتے۔

اخلاقی طور پر کوئی بھی شخص غیر جانبدار نہیں ہوسکتا۔ ہم اخلاقی طور پر یا تو غلط ہوتے ہیں یا صحیح' اور یہ ایک عام مشاہدہ ہے۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ گو لوگ مختلف طرز عمل اختیار کرتے اور مختلف رویے اپناتے ہیں' لیکن انصاف' سچائی' مساوات اور آزادی کے متعلق وہ ایک ہی انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔

ذہین اور دانا لوگ تو سچائی اور اخلاص کی وجہ سے یہ انداز اختیار کرتے ہیں' لیکن سیاستدان نیز جذباتی نعرے لگانے والے منافقانہ طور پر اپنے مفادات کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ اس موقع پر منافقوں اور جعلی راہنماؤں کے طرز عمل پر بحث مطلوب نہیں ہے نہ ہی ہم ان کی مصنوعی اخلاقیات' اخلاقی نقاب (Mask) نیز انصاف' مساوات اور انسانیت کے الفاظ کے ساتھ ان کی بازیگری کو سامنے لائیں گے' کیونکہ اخلاقی طرز عمل اور اصولوں نے ثابت کردیا ہے کہ فتح سچے اخلاقی اصولوں ہی کی ہوتی ہے۔

سیاسی تاریخ خصوصاً موجودہ دور کی تاریخ ان مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ کس طرح آزادی کے دشمنوں نے ظلم و زیادتی کے آلات کو استعمال کرتے ہوئے گلے پھاڑ کر انصاف اور آزادی کے نعرے بلند کئے اور کس طرح ان مقدس الفاظ کو بازیچہ اطفال بنا دیا' تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ منافقت اور جعلی اخلاقیات سے حقیقی اخلاقیات کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب جعلسازی کے ذریعے کسی سے کوئی چیز ہتھیا لی جاتی ہے تو اس پر اس طرز عمل کی برائی پوری کراہت سے ظاہر ہوتی ہے۔

❑ ارادہ و عمل :

ہماری دنیا میں اشیاء معروضی طور پر پائی جاتی ہیں' زمین' سورج کے گرد گھومتی ہے

چاہے ہم اس سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ چاہے ہم اسے پسند کریں یا ناپسند۔ ہم اس سے نفرت کا اظہار کرسکتے ہیں' لیکن اسے نظرانداز نہیں کرسکتے' نہ اسے تبدیل ہی کرسکتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے حقائق کسی دلیل کے محتاج نہیں ہوتے' یہ تو اپنی دلیل آپ ہیں۔ اسی طرح ان کے اچھا ہونے یا اچھا نہ ہونے پر بحث نہیں کی جاسکتی' کیونکہ ان کی اچھائی مسلمہ ہے۔ اس کے برعکس ہماری اندر کی دنیا کی اشیاء معروضی نہیں ہیں۔ اس دنیا میں ہم براہ راست شریک ہوتے ہیں اور اس دنیا سے ہماری نظر کا براہ راست تعلق ہے۔ اسی گوشے میں انسان کو مکمل آزادی حاصل ہوئی ہے۔

اس دنیا میں ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں کرلیتے ہیں' اس دنیا میں امیر بھی ہیں' غریب بھی ہیں۔ عقلمند بھی ہیں' احمق بھی ہیں۔ تعلیم یافتہ بھی ہیں اور غیر تعلیم یافتہ بھی ہیں' کمزور بھی ہیں اور طاقتور بھی ہیں اور یہ تمام حالتیں وہ ہیں جن کا ہمارے ارادے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہماری یہ دنیا آزادی اور مساوی مواقع سے مزین ہے۔ یہ آزادی مکمل ہے' کیونکہ اس آزادی پر فطرت یا مادے کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر چاہے تو ہر شخص اپنے ضمیر کے ساتھ ہم آہنگ رہ سکتا ہے اور اخلاقی قوانین کی پابندی کرسکتا ہے۔

ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کے لئے یہ ممکن نہ ہو' لیکن ہر شخص راست روی کی تعریف کرتا ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگ ہیں جو ناانصافی کو ختم کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں پاتے' لیکن بے انصافی کو ختم کرنے کی تمنا ان کے دلوں میں بھی ہے۔ اسی طرح "توبہ" کا مفہوم دلوں میں پنہاں ہے۔

اخلاقیات اپنی ذات میں تو موجود نہیں ہے' لیکن یہ راست روی کے ساتھ رہنے کی خواہش کا نام ہے اور جدوجہد کرکے نجات کی تلاش کا نام ہے۔ یہ کوئی لازمی خوبی نہیں ہے کہ انسان تمام گناہوں سے پاک اور ہر لحاظ سے مکمل ہو۔ گناہ کرنا بشریت کا تقاضا ہے' البتہ گناہ پر اصرار ناروا بات ہے۔ عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی گناہ ہوجائے تو توبہ

کرکے اس کا ازالہ کردیا جائے۔

ہر انسان اپنے طور پر مخالف راہ پر چل رہا ہے' لیکن پھر بھی آج ہر شخص پریشان اور پژمردہ ہے کیوں؟ کیونکہ اس بارے میں سارتر نے کہا ہے کہ ہر شخص مکمل طور پر ذمہ دار ہے اور عملی زندگی میں ہماری حالت یہ ہے کہ نہ معصوم مجرم ہوتے ہیں اور نہ ہی معصوم مظلوم ہوتے ہیں۔

❏ مشق' تربیت اور نشوونما :

پرانی کتابوں میں سب سے زیادہ متاثر کن اور حیران کن وہ کہانیاں ہیں جن میں تبدیلی کا ذکر اور اخلاقی یاددہانی پائی جاتی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسانوں کے کردار اور عمل میں تبدیلی آتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خطرناک مجرم اور بدترین بدمعاش توبہ کے بعد انصاف کے محافظ اور انصاف کے لئے جانیں قربان کرنے والے بنتے نظر آتے ہیں اور یہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔پھر اصلاح اور تبدیلی کے لئے کوئی خودکار نظام بھی موجود نہیں۔ ضرورت صرف اس چیز کی ہوتی ہے کہ روح کی گہرائیوں میں کوئی بات اتر جائے اور انسان کے اندر ایک ایسی روشنی پیدا ہوجائے جو اس کو مکمل طور پر تبدیل کردے۔ اس تبدیلی کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لئے منطقی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس عمل کی اصلی روح آزادی اور تخلیقی طرز و انداز ہے۔

برائی اور اچھائی دونوں انسان کے اندر موجود ہیں۔ انسان کو "بہتر بنانے" کے لئے قوانین' مشقیں' قوت یا کوئی بیرونی دباؤ مؤثر نہیں ہوتا' صرف اس کا رویہ تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ نیکی اور برائی گنے اور گندھک کے تیزاب کی قسم کی چیزیں نہیں ہیں کہ ان کو پیدا کیا جاسکے۔ ٹالسٹائی نے اپنے ناول Resurrection میں لکھا ہے کہ قیدیوں کی "ازسرنو

تعلیم" ان کی اصلاح نہیں کرتی' بلکہ یہ تو ان کے اوپر ایک لیپ چڑھا دیتی ہے۔ حقیقی تبدیلی خود بخود واقع ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی دراصل روح میں آنے والا انقلاب ہے۔

مذہبی نقطہ نظر سے صرف تشدد کے ذریعے گناہ کو ختم کرنے کی ہر کوشش لاحاصل ہوتی ہے۔ مسیحیوں اور بدھوں کی اس بات کو اب سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ کیوں "برائی کے خلاف مزاحمت نہیں کرتے"۔

اسی طرح تربیتی مشقیں بھی انسان کے اخلاقی رویے پر کوئی پائیدار اثر مرتب نہیں کرتیں۔ آپ فوجی کو مشقیں کراسکتے ہیں جن کے ذریعے وہ مضبوط، فن سپہ گری میں ماہر اور چست ہوجاتا ہے' لیکن مشقوں کے ذریعے آپ اسے باوقار' ایماندار' محنتی' سچا' بہادر اور غیرت مند نہیں بناسکتے۔ یہ خالصتاً روحانی خصوصیات ہیں۔ قانون' تشدد' دباؤ یا قوت کے استعمال سے کبھی بھی کوئی عقیدہ نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ بہت سی ایسی مثالیں مل سکتی ہیں کہ اگر بچوں کی ایک ہی سمت میں راہنمائی کی جائے تو وہ اس کے خلاف مزاحمت شروع کردیتے ہیں اور وہ صراحتاً اس کے برخلاف طرز عمل میں دلچسپی ظاہر کرکے اسے اختیار کرلیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کے اندر خود رائی کی "خصوصیت" ہوتی ہے۔ انسان کو جانوروں کی طرح سدھایا نہیں جاسکتا۔ جسمانی مشقوں اور تعلیم کے غیر یقینی نتائج سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ انسان حیوان تو ہے' لیکن حیوان مطلق نہیں ہے۔ وہ روح بھی ہے اور آزادی بھی ہے۔ اس لئے اس کے اندر جو رویہ بھی پروان چڑھتا ہے اس لئے پروان چڑھتا ہے کہ انسان نے اس کو اپنے اندر جگہ دی ہوئی ہے۔

نگہداشت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک انسان کو بالکل بدل کر رکھ دیا جائے' بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے اندر جذبات کو ابھارا جائے جو اس کو نیکی کرنے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کردیں۔ مثلاً' نصیحت' مشورہ' ہدایت' تجویز وغیرہ۔ اس سے ہٹ کر انسان کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے رویے کو بس جزوی طور پر بدلا جاسکتا ہے' یہ تبدیلی بالیقین عارضی ہوگی۔ وہ طرز عمل جس میں ہمارے ارادے گہرائی کے ساتھ شامل نہ

ہوں سراسر فوجی ڈرل ہے' حقیقی ذہنی نشوونما میں ہماری کوشش کو بھی دخل ہوتا ہے اور اس کے نتائج کو پہلے سے نہیں دیکھا جاسکتا۔

افراد پسند (Individualist) انسان کی اندرونی تبدیلی پر زور دیتے ہیں' جبکہ اثبات پسند (Positivist) اس کے رویے کی تبدیلی پر زور دیتے ہیں۔ ان خیالات کے پس پشت جو فلسفہ کارفرما ہے وہ واضح ہے۔ اگر جرم آزاد انتخاب یا برے ارادے کا نتیجہ ہے تب دوبارہ تعلیم سے اس کے اعدادوشمار میں کمی آسکتی ہے۔ اس کے برعکس اگر جرم کا سبب برے حالات اور بری عادات ہوں تب مجرم کو تعلیم اور اس کے حالات کے بدلنے کے ذریعے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اندرونی تبدیلی اور فوجی ڈرل میں یہی فرق ہے۔ کلرک اور سرکاری ملازمین فوج اور پولیس جو بھی ضابطے وضع کرتے ہیں اصلاً وہ جسم کی مشق ہی ہوتی ہے اس میں روح ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے۔ انسان کے اندر حقیقی تبدیلی اس وقت آتی ہے جب اس کا قلب اور دماغ کسی بات کی افادیت کو تسلیم کرلیتا ہے۔

انسان کے اندر نئی تحریک پیدا کرنے کے لئے سزا کے ذریعے تبدیلی لائی جاتی ہے' لیکن مشق (Drill) اپنی اصل کے اعتبار سے حیوانی نوعیت کی کوشش ہے۔ نصیحت کا انسان سے تعلق ہے اور مشقیں جانوروں کے لئے وضع کی جاتی ہیں۔ ہدایات اور مشقوں کے ذریعے ممکن ہے کہ آپ شہریوں کو قانون کا پابند بنادیں' لیکن یہ ناممکن ہے کہ وہ اس کا احترام بھی کریں۔ اگر وہ قانون کی پابندی کریں گے بھی تو یہ خوف کی وجہ سے ہوگی عادت کی وجہ سے ہوگی ان کا اندر اور ان کا ضمیر ہوسکتا ہے کہ مردہ ہوچکا ہو' ان کے جذبات مرجھا چکے ہوں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ قانون نہ توڑیں کیونکہ انہیں اس کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے۔ کہانیوں' افسانوں اور ناولوں میں ایسے لوگوں کا بہت ذکر ملتا ہے جو اخلاقی طور پر خالی ہوتے ہیں' لیکن ان کو قوانین کی پیروی کی مشق کرائی گئی ہوتی ہے اور وہ قوانین کی پیروی کرتے ہیں۔ اس لئے انصاف کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ ایک انسان کا انصاف اور دوسرا خدا کا انصاف۔ انسان اعمال پر نگاہ رکھتا ہے جبکہ خدا روح اور

دماغ کی حالت پر نگاہ رکھتا ہے۔

انسان کے اندر جو انسان ہے وہ انتہائی کشادہ اور لامحدود ہے۔ یہ انتہائی کریہہ مظالم اور جرائم کی بھی قدرت رکھتا ہے اور عظیم الشان قربانیوں کی بھی۔ انسان کی عظمت اچھے اعمال میں پوشیدہ نہیں ہے اس کے انتخاب میں پوشیدہ ہے۔ نیکی انسان کے ارادے کے باہر کی چیز نہیں ہے نہ ہی اس کو اس پر ٹھونسا جاسکتا ہے۔ جبکہ "ایمان کے لئے کوئی بیرونی قوت ضروری نہیں ہے۔ یہی قانون اخلاقیات پر لاگو ہوتا ہے۔

❏ اخلاقیات اور عقل :

انسانی آزادی کے تصور کو اخلاقیات سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نظریہ تبدیلیوں سے بھی گزرا ہے۔ آزادی اخلاقیات کی ترقی کے ہر دور میں موجود رہی ہے {۱}۔ فزکس کے ساتھ جو تعلق خلا اور مقدار کا ہے اخلاقیات کے ساتھ وہی تعلق آزادی کا ہے۔ عقل خلا اور مقدار کو سمجھ لیتی ہے' لیکن یہ آزادی کا مفہوم نہیں سمجھ پاتی۔ اخلاقیات اور عقل کے درمیان خط فاصل یہی چیز ہے۔

عقل کا کام فطرت کو دریافت کرنا' میکانیت معلوم کرنا اور اعداد و شمار جمع کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عقل کا کام ہر معاملے میں اپنے آپ کو دریافت کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقل مستقل طور پر مختلف مقامات پر گردش کرتی رہتی ہے۔ دراصل عقل کائنات میں اپنے آپ ہی کو پاتی ہے {۲}۔

{۱} George Hegel Saint liche werke (Stuggart: F. Formann 1961).

{۲} Francois Marie Revovet de Voltarie Oeuvres Completes des Voltaire (Paris: Garnier Freres 1885).

اخلاقی اصولوں کو عقل کی پیداوار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ عقل مختلف چیزوں کے درمیان تعلق کی نوعیت کو دریافت کرتی ہے اور اس کا تخمینہ لگاتی ہے۔ عقل اس وقت عاجز ہوجاتی ہے جب اخلاقی قبولیت یا اخلاقی رد کا معاملہ درپیش ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ تمام لوگوں کے لئے یکساں روحانی حالت نہیں ہوسکتی' لیکن عقلی طور پر اس اصول کے لئے نہ دلائل فراہم کیے جاسکتے ہیں نہ اسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔ جس طرح یہ ناممکن ہے کہ آرٹ کے نمونے اور ٹیڑھی لکیروں یا خوبصورت اور بد صورت چیزوں میں مہارت کے بغیر تمیز کی جاسکے۔

مشہور مقولہ ہے کہ نیک شخص ہمیشہ خوش' اور برا شخص ہمیشہ دکھی رہتا ہے۔ اس چیز کو سائنسی انداز میں ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ مسیحی اخلاقیات اپنے آپ کو سائنسی اصطلاحات کے لئے پیش نہ کرسکیں۔ فرانسیسی انقلاب نے برابری' آزادی اور بھائی چارے کے تین اصول متعارف کرائے تھے' لیکن ان کو سائنس سے کبھی بھی اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ نہ ہی ان کو سائنسی طریق کار سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سائنس تو اس کے مقابلے میں تین دیگر اصول عدم مساوات' کامل سماجی نظم اور فرد کی گمنامی یعنی ایک منظم معاشرے میں انسانوں کی ذاتی تحلیل اور تقسیم پیش کرتی ہے۔

جین ولجین سائنس کے ذریعے انسان کے اخلاقی مسائل کے حل کی جدوجہد کرتا رہا لیکن اس پر قائم نہ رہ سکا۔ {۳} اس کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ ایک عام انسان کو بچانے کے لئے بہت سے انسانوں کو قربان کردے۔

وکٹر ہیوگو کہتا ہے کہ:

"انسان اور عقل کے درمیان نزاع نہیں ہے' بلکہ عقل اور روح کے درمیان تنازعہ ہے۔ یہ تنازعہ روح اور دلیل کے درمیان ہے۔ ایک ایسے

۳} Victor Hugo : Les Miserables (Paris : Garnier Flammarion, 1972).

ماحول میں جہاں دو متضاد قسم کے دلائل بارہا جنم لیتے ہیں اور یہ دلائل دو قسم کے ہیں اس لئے ان کا موازنہ ممکن نہیں ہے۔ ان دونوں کا تعلق دو دنیاؤں یعنی جنت اور زمین سے ہے۔ صرف انسان ہی اپنے لئے ایک راہ کا انتخاب کرسکتا ہے اور خود ہی اس مسئلے کا حل تلاش کرسکتا ہے"۔

جین ولجین اپنے فیصلے میں عقل کی شکست اور انسان کی فتح تسلیم کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی فتح ہے جس کی وضاحت عقلی طور پر تو بہرحال ممکن نہیں ہے لیکن یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جس کا لوگ احترام کرتے ہیں۔

ہم میں سے ہر شخص کو داخلی طور پر آزادی کا یقین حاصل ہے۔ ذرا آیئے اس جذبے کو سائنس کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ فرض کیجئے ایک شخص سڑک پر حادثے کا ارتکاب کرتا ہے۔ قانون کی نظر میں وہ مجرم ہے' لیکن یہ بات بہرحال طے کی جائے گی کہ اس نے یہ حادثہ جان بوجھ کر کیا' یا اس سے سہواً ہوا؟ اب اگر یہ بات آپ سائنس کی مدد سے دریافت کرنا چاہیں تو کامیاب نہ ہونگے۔ اس کا بالکل صحیح حال تو خود اسی شخص کو معلوم ہوگا۔ اگر عقل ثبوت فراہم کرنے میں ناکام رہے تو کیا ہم اپنی ذمہ داریوں سے منہ موڑلیں گے؟ یہی وجہ ہے کہ عقل کے خلاف ہم ایک ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جس کے لئے ہم کوئی سائنسی دلیل نہیں رکھتے۔ قیاس اور شہادت پر بھروسہ کرتے ہیں۔

اخلاقی اصولوں کے ساتھ عقل کا کیا رویہ ہوگا؟ ہیوم نے صاف اور واضح الفاظ میں مختصراً اس کی وضاحت کردی ہے {۴}۔

"ہمارے دماغ میں گناہ اور جرم کا تصور نہیں ہوتا۔' بلکہ ایک شخص یا ایک

{۴} Livere Septieme: L' Affaire Champ mathieu in Les Miserables vol. ip. 247-264.

حالت کے متعلق کچھ جذبات' خیالات اور آراء ہوتی ہیں۔ ہم اس تعلق کی نوعیت کو دریافت کر سکتے ہیں' کسی فعل کی ابتداء اور ادائیگی کی وضاحت کر سکتے ہیں' لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم اپنے جذبات کو اجازت دیں کہ وہ ایک خاص عمل کو اخلاقی طور پر برقرار رکھنے دیں۔ ہمارا ذہن تو صرف اس چیز کا اہل ہے کہ مختلف چیزوں کے درمیان تعلق کی نوعیت کو ظاہر کردے۔ اس کے برعکس جب کسی چیز کی اہلیت کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے تو اس کی وضاحت صرف اور صرف جذبات کی قوت کے ذریعے ہو سکتی ہے"۔{۵}

فرانسس ہچیسن نے اپنی کتاب "فلسفہ نظام اخلاق" میں لکھا ہے : اخلاقیات کو سمجھنے کے لئے تعلیم یا ذہانت درکار نہیں ہوتی۔ اخلاقی فیصلے عقل کے ذریعے نہیں ہوتے"۔ {۶}سائنس اور اخلاقیات کے درمیان فرق بھی روزمرہ زندگی میں ظاہر ہوتا ہے۔ سائنس اس چیز کو قبول کرتی ہے کہ بچے پیدا کرنے کے لئے نطفے کو ٹیسٹ ٹیوب میں داخل کر کے بچے حاصل کیے جائیں یا ان کو بے رحمی سے ضائع کردیا جائے۔ ان عوامل کو سائنس کی مدد کے بغیر سمجھا ہی نہیں جاسکتا کیونکہ یہ عوامل تو پیداوار ہی سائنس کی ہیں۔ اس کے برعکس اخلاقیات کے اصول انسانی زندگی کے بنیادی فلسفے کو سامنے رکھ کر اس عمل پر تنقید کرتے ہیں۔

مذہب،اخلاق اور فنون اس سلسلے میں یکساں رائے رکھتے ہیں' لیکن وہ اس کی وضاحت مختلف طریقے سے کرتے ہیں۔ مذہب مصنوعی زندگی اور پرتشدد موت کو تسلیم

{۵} Hume: Treatise on Human Nature.

{۶} Francis Hutcheson: A System of Moral Philosophy

(New York: A. M. Kelley 1966 Vol.1 Part VI).

نہیں کرسکتا کیونکہ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان کو ان میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ اخلاقیات کے نقطہ نظر سے مصنوعی طور پر جاندار پیدا کرنا اور غیر فطری موت کا طریقہ اپنانا' انسانیت کے خلاف جرم ہے' کیونکہ یہ طریقے انسان کی اہمیت کو گھٹا کر اسے ایک جامد چیز بنا دیتے ہیں جس کے سبب اس کے استحصال اور اس کے غلط استعمال کا راستہ کھلتا ہے۔

ایک آرٹسٹ کے نزدیک زندگی اور موت راز ہیں اور انھیں ایسا ہی رہنا چاہیے۔ شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے ہیملٹ میں سب سے مشہور الفاظ وہ ہیں جو ہیملٹ کی زبان سے "خود کلامی" (Monologue) کی صورت میں نکلے ہیں۔ سائنس کے نزدیک زندگی غیراہم چیز ہے اور یہ حقیقت ہے۔

مصنوعی عمل تولید اور انسانوں پر تجربات دراصل انسانوں کی صلاحیتوں کو منجمد کرنا ہے اور یہ موجودہ دور میں عام ہے۔ سائنسی نقطہ نظر سے یہ فطری اور منطقی عوامل ہیں۔ فرانسیسی اکیڈمی برائے اخلاقیات و سیاسیات کے ممبران مصنوعی عمل تولید کے خلاف ہیں کیونکہ اس طرح شادی' خاندان اور معاشرے کے مسلمہ ضابطوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے {۷} اور یہ حقیقت بھی ہے کہ مصنوعی عمل تولید کے لئے احترام کا جذبہ عقل سے لگا نہیں کھاتا۔

مصنوعی عمل تولید اعضاء کی پیوند کاری' اسقاط حمل اور اس قسم کے دوسرے عوامل سائنس کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔' لیکن ان کے استعمال کا تعلق سراسر اخلاقیات سے ہے۔ انسانوں سے جانوروں کی طرح سلوک کرنے کا منصوبہ قابل نفرت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسان کی انا بھی مجروح ہوتی ہے {۸}۔

{۷} Lucien Cuenot "Ieugenique" Revue d' Anthropologue : 1935-36.

{۸} Jean Rostand : Humanly Possible (New York: Saturday Review Press 1973).

معنوی عمل تولید کا آغاز حیوانات کی سرجری سے ہوا' لیکن یہیں سے انسانیت اور حیاتیات کے مسائل کی چپقلش کا آغاز بھی ہوا اور یہیں سے انفرادیت اور مادہ پرستی کا ٹکراؤ شروع ہوا۔ آغاز سے ہی اس سوال کا سامنا ہے کہ مادی مفاد کو دیکھا جائے یا روحانی اہمیت کو مدنظر رکھا جائے؟ آج انسان ان ذرائع کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کر رہا ہے' لیکن کیا وہ کل بھی اس کا انکار کرے گا؟ کیا وہ ہمیشہ اس کا انکار کرتا رہے گا {۹}۔

اس قسم کی ترقی کے بارے میں مسیحی شعراء اور آرٹسٹ ایک ہی قسم کے رویوں کا اظہار کرتے ہیں۔ مسیحیوں کے نزدیک تو یہ ترقی "شیطانی عمل" ہے' ان شعراء کے نزدیک "یہ گندگی کا ڈھیر ہے" لیکن دوسری طرف مادہ پرست ان تبدیلیوں سے خوش ہوتے ہیں جنہیں علم حیاتیات متعارف کراتا ہے۔

سائنس کا علم کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے' یہ نہ تو اخلاقیات سے جان چھڑانے میں اور نہ ہی مذہب کو غیر ضروری قرار دینے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ سائنس لوگوں کو زندہ رہنے کے طریقے نہیں بتاتی نہ ہی یہ اخلاق اور معیار کے ضابطے مقرر کرتی ہے۔وہ اقدار جو حیوانی زندگی کو انسانی زندگی میں تبدیل کریں مذہب کے بغیر ناقابل فہم رہیں گی۔ مذہب ایک اعلیٰ تر دنیا کا آغاز ہے اور اخلاقیات اس کا مفہوم متعین کرتی ہے۔

{۹} Re'my Collin: Plaidoyers Pour la vie humaine and

Voz nesensky's Poem "Oza".

سائنس اور سائنس دان

❑ کانٹ کے دو تنقیدی مضامین :

کانٹ کے مطابق ایک خالص عقل ہوتی ہے اور دوسری عملی عقل ہے۔ قوت فکر خدا کا انکار کرتی ہے' لیکن انسان اور زندگی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے سائنس اور سائنس دان میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے۔

سائنس دان جو کچھ کہتا ہے' سوچتا ہے اور یقین رکھتا ہے ضروری نہیں کہ وہ سائنس ہی ہو۔ دنیا کے بارے میں اس کے مجموعی تاثر کا ایک حصہ سائنس سے متعلق ہے۔ بہرحال مافوق الفطری وضاحت کی عقل نفی کردیتی ہے۔ وہ صرف اس تشریح کو قبول کرتی ہے جس کا سلسلہ' سلسلہ اسباب و نتائج سے جڑا ہوا ہو اور جس کو تجربے اور مشاہدے کے ذریعے ثابت کیا جاسکے۔ سائنس کے ہاتھ میں صرف فطرت رہ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر دوسری چیز اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور یہ سائنس کی تحدیدات (Limitations) ہیں۔

عام طور پر سائنس ایک حد پر ٹھہر جاتی ہے' لیکن سائنس دان اپنا کام جاری رکھتا ہے۔ ایٹم بم بناتے وقت اوپن ہائمر کو ہندوستانی فلسفے' اپنشا کی ضرورت نہیں ہوتی: اگر اس

کو کسی فلسفے کی ضرورت پیش آسکتی تھی تو اس وقت جب کہ اس کے استعمال کا وقت آتا۔ بعد میں اپنی زندگی میں اس نے مکمل طور پر ایٹمی سائنس سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور اپنے آپ کو مکمل طور پر ہندوستانی فلسفے کے مطالعے کے لئے وقف کردیا۔

آئن شائن دوستووسکی کی ادبی تخلیقات میں غیر معمولی دلچسپی لیتا تھا۔ خاص طور پر اسے اس کے ناول The Brothers Karamazov سے بڑا لگاؤ تھا۔ اس عظیم روسی ادیب کا مادے اور توانائی سے تعلق تھا اور ظاہر ہے روشنی کی رفتار کے مسائل' توانائی اور ناول میں کیا قدر مشترک ہوسکتی ہے۔ سائنس دان آئن شائن کا ایوان کرامازوف سے تعلق نہیں تھا' لیکن آئن شائن کے اندر جو مفکر' جو انسان اور جو فنکار چھپا ہوا تھا اس نے اسے ادب سے تعلق پیدا کرنے مجبور کررکھا تھا۔

سائنسی تحقیق اور سائنس کے استعمال میں ایک فرق بہرحال پوشیدہ ہے۔ سائنسی تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو سمجھا جائے جب کہ اس کے استعمال کا مقصد یہ ہے کہ تباہی کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت حاصل کی جائے۔ سائنس دان سائنس کی طرف ان نگاہوں سے نہیں دیکھتا جن نگاہوں سے دوسرے لوگ دیکھتے ہیں۔ عوام الناس کے نزدیک سائنس سے مراد تجربات کے نتائج کا استعمال ہے اور یہ عموماً مقداری اور میکانکی نوعیت کے ہوتے ہیں' جبکہ سائنس دان کے نزدیک سائنسی تحقیق' تلاش' تجربے' کوشش' خواہش (ایک لحاظ سے) قربانی ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں سائنس سائنس دان کے لئے زندگی کا نام ہے۔ سائنس دان کے نزدیک سائنس سیکھنے کے تجربے کی لذت الگ ہے اور یہ انتہائی اعلیٰ احساس کا نام ہے۔ اس تجربے میں سائنس دان اپنے وجود سے اوپر اٹھتا ہے اور ایک مفکر فلسفی اور فنکار بن جاتا ہے۔ اس طرح دو چیزیں بیک وقت ظاہر ہوتی ہیں۔وہ کچھ اپنے لئے دریافت کرتا ہے اور باقی معاشرے کے لئے۔لیکن جب سائنس سائنس دان سے اور اس کی زندگی سے الگ ہوجاتی ہے اور اعداد و شمار' نیز نتائج کا مرقع بن کر رہ جاتی ہے تو پھر یہ انسان اور اس کے معاشرے سے دور ہوتی چلی جاتی ہے اور

آخری نتیجے کے طور پر یہ مذہب سے لاتعلق ہو جاتی ہے۔

سائنس آغاز سے ہی مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کی نفی کا راستہ اختیار کرتی رہی ہے اس لئے کئی اہم سوالات کے بارے میں کامل خاموشی کا رویہ اختیار کیے رکھتی ہے۔ گویا وہ الحاد کی خاموش ساتھی بن جاتی ہے۔ اس کی وجہ سائنس دان نہیں' بلکہ سائنس کے ضابطے ہوتے ہیں۔

اس دہری حالت کی مثال میں فکر اور زندگی کا مخاصمہ یا فطرت یا آزادی کی لڑائی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ کانٹ نے بحث کی یہی بنیادیں قائم کی ہیں۔ اپنے دوسرے تنقیدی مضمون میں کانٹ خدا' آخرت اور آزادی کے متعلق گفتگو کرتا ہے جن کی اس نے اپنے پہلے تنقیدی مضمون میں مخالفت کی تھی۔ کانٹ جو کہ منطقی فلسفی بھی ہے اور سائنس دان بھی اپنے مضمون Critique of Practical Reason میں خالصتاً فلسفی نظر آرہا ہے (1)۔ پہلے تنقیدی مضمون میں عقل کی بنیاد پر جو نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں وہ اخذ کرتا ہے۔ دوسرے مضمون میں اس نے خیالات' تجربات اور زندگی کے بارے میں امیدیں دراز کی ہیں۔گویا پہلا تنقیدی مضمون حقیقت کے بارے میں ایک معروضی رویہ ہے جو تجزیے اور حقیقت کی چیر پھاڑ کا نتیجہ ہے۔ دوسرا مضمون اندرونی علم اور یقین پر مبنی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دنیا کے بارے میں اس کی روح نے جو سوال اٹھائے ہیں وہ ان کے جواب فراہم کررہا ہے۔

اور یوں یہ دونوں تنقیدی مضامین ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے' بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ انسانوں کی دنیا میں ہر جگہ دوئی کی کارفرمائی ہے۔

---

(1) Immannel Kant : The Critique of Pure Keasoh Trans.

J.M.D. Meikle John (Chicago: Encyclopedia Brittanica 1955).

❑ اخلاقیات اور مذہب :

اخلاقیات کی بنیاد صرف اور صرف مذہب پر ہو سکتی ہے' لیکن اخلاقیات اور مذہب ایک چیز نہیں ہیں۔ بطور اصول اخلاقیات مذہب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی چاہے اخلاقیات پر عملی طور پر عمل کیا جارہا ہو' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کا انحصار بھی مذہب ہی پر ہے۔ ان دونوں کو ایک اعلیٰ دنیا کا تصور یکجا کرتا ہے اور یہ دنیا اگر اگلی دنیا ہے تو یہ مذہبی دنیا ہے اور یہ دنیا اگر اعلیٰ دنیا ہے تو یہ ایک اخلاقی دنیا ہے۔ اس سے مذہب اور اخلاقیات کا باہمی تعلق اور ایک دوسرے پر انحصار ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک اندرونی تسلسل ہے جو خودکار نہیں ہے' ریاضیاتی نہیں ہے' منطقی نہیں ہے' لیکن عملی بہرحال ہے۔ ان کے اختلافات الگ الگ ہیں' لیکن جلد یا بدیر ان کا باہمی انحصار دوبارہ قائم ہوجائے گا۔ الحاد' آخرکار اخلاقیات کی نفی بن جاتا ہے اور ہر سچی اخلاقی تبدیلی مذہبی احیاء سے شروع ہوتی ہے۔ اخلاقیات ایک مذہب ہے جو کہ عملی اصولوں میں ڈھل چکا ہے' یعنی یہ خدا کے وجود کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ تعلق کا نام ہے۔ مادی منفعت کو فراموش کرکے اگر ہم خطرات و مشکلات کو انگیز کرتے ہیں تو یہ عمل اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب صرف یہ دنیا اور یہ زندگی ہی پیش نظر نہ ہو' بلکہ اخروی زندگی بھی سامنے ہو اور اسی نکتے سے اخلاقیات اور مذہب کا آغاز ہوتا ہے۔

اخلاقیات کا آغاز اعلیٰ اصولوں کی پابندی سے ہوتا ہے اور آج تک مذہب ان اصولوں کی پابندی کی صورت ہی میں موجود ہے۔ اپنی فطرت کے لحاظ سے اصولوں کی پابندی مذہبی چیز ہے۔ اخلاقیات ہمیشہ ایک رکاوٹ اور پابندی کی صورت میں سامنے آتی ہے جو انسانی فطرت کے اندر حیوانی داعیوں کو ابھرنے سے روکتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دس "مکافات الٰہی" میں سے آٹھ "ممنوعات" ہیں۔
اس سلسلے میں مسیحیت کو بھی سب سے نمایاں مثال کے طور پر کیا جاسکتا ہے۔

تاریخ مذاہب بظاہر تو لایعنی پابندیوں سے بھری ہوئی ہے' لیکن اخلاقیات کے نقطہ نظر سے یہ پابندیاں بے مقصد نہیں ہیں۔ اگرچہ پابندیوں کا ایک عقلی مفہوم بھی ہو سکتا ہے' لیکن پابندی بذات خود مطلوب نہیں ہوتی۔ اخلاقیات فطرت کے ساتھ بے قید ہم آہنگی کی زندگی نہیں ہے جیساکہ اشراقیوں کا خیال ہے۔ {۲} یہ تو فطرت کے خلاف اصولوں پر مبنی جدوجہد ہے۔ بشرطیکہ "فطرت" کو اس کے اصل مفہوم کے ساتھ سمجھا جائے {۳}۔

انسان کی طرح اخلاقیات بھی غیر منطقی' غیر فطری اور فوق الفطری ہے۔ ایک نقطہ نظر سے فطری انسان اور فطری اخلاقیات کا وجود نہیں ہے' فطرت کی پابندیوں پر کاربند وجود انسان نہیں ہے' زیادہ سے زیادہ وہ ایک ایسا جانور ہے جس کو کسی قدر قوی عقل عطا کی گئی ہے۔ فطرت کی حدود کے اندر اخلاقیات' اخلاقیات نہیں ہے' بلکہ یہ تو خود غرضی کی ایک شکل ہے' ایک واضح اور دانشمندانہ خودغرضی ہے۔

ڈارون کے نظریہ تنازع للبقا میں اخلاقی لحاظ سے سب سے بہترین لوگ نہیں جیتے۔ زندہ وہ رہتے ہیں جو مضبوط ترین اور قابل ترین ہوتے ہیں۔ حیاتیاتی ارتقاء بھی انسانی ارتقاء کی طرف سے لے جاتی ہے جو اخلاقیات کی ایک بنیاد ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا حامل انسان حیاتیاتی ارتقاء کے اعلیٰ ترین مرحلے (سپرمین) پر پہنچ جائے' لیکن وہ انسانی خصوصیت سے بہرحال محروم رہے گا اس لئے انسانی عظمت سے بھی محروم رہے گا۔ انسان کو حقیقی عظمت صرف خدا ہی عطا کر سکتا ہے۔

{۲} Whitney Jennings Oates : The Stoic and Epicurean Philosophers (New York : Modern Library 1957).

{۳} فطرت میں انسانی جسم' جذبات' ذہانت' وغیرہ شامل ہیں۔

حیاتیاتی ترقی کے ارتقاء کے نتیجے میں سماجی ترقی کے بھی اخلاقیات پر ایسے ہی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انگریز مفکر اخلاق مینڈیویل سوال کرتا ہے : "معاشرے کی ترقی اور تمدن کے ارتقاء کے لئے اخلاقیات کی کیا ضرورت و اہمیت ہے؟ اور خود ہی بڑی سادگی سے جواب دیتا ہے : اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے' بلکہ الٹا اس کا نقصان ہو سکتا ہے" اس کے خیال میں "جن کاموں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ گناہ ہیں وہ معاشرے کی ترقی میں بڑا ہیجانی کردار ادا کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جس قدر انسان کی ضروریات بڑھتی چلی جاتی ہیں اسی قدر تمدن ترقی کرتا ہے" وہ مزید کہتا ہے : "جن کو اخلاقی اور روحانی برائیاں قرار دیا جارہا ہے دراصل یہی تو ہمارے انسان ہونے اور سماجی جاندار ہونے کا ثبوت ہیں" {۴}۔

اگر حیاتیاتی ترقی اور تکنیکی ترقی ڈارون کے نظریہ فطری ارتقاء کے مطابق وجود میں آتی ہے' یعنی زیادہ قوت رکھنے والا نہ صرف کمزور کو دبا دیتا ہے' بلکہ اس کو تباہ و برباد کر دیتا ہے' تو انسانی معاشرے کے اندر فساد اور تباہی ختم ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی' لیکن خوش قسمتی سے عملی زندگی میں ہمیں نرم روی اور دوسروں کے لئے اپنا حق چھوڑ دینے کے واقعات نظر آتے ہیں اور یہ اس بات کا ثبوت بنتے ہیں کہ نیکی انسان کی سرشت میں داخل ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاقیات میں نیکی اور نرم روی انسانی معاشرے کی ترقی کی اصل محرک ہیں اگرچہ خودغرضی اور سفاکی بھی پہلو بہ پہلو موجود رہتی ہیں۔ یہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کی مخالف رہی ہیں۔ "ضمیر کہتا ہے : شفقت اور درگزر کے ذریعے نجات حاصل کرو' جبکہ نفس امارہ تقاضا کرتا ہے۔ کمزوروں کو دباؤ اور ان کی لاشوں پر چڑھ جاؤ"۔ {۵}

{۴} غور کیا جائے تو مادہ پرستوں کے اسی نقطہ نظر سے انسانی معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوا ہے۔ درست بات یہ ہے کہ انسان سماجی جانور نہیں' بلکہ اشرف المخلوقات ہے اور اس کے تمدن کی ترقی کا انحصار انصاف' امن اور ایثار پر ہے۔ (ادارہ) حاشیہ -(۵) آگے ملاحظہ فرمائیں۔

اخلاقیات سے ان دونوں حیوانی اور روحانی طرز ہائے عمل کی علیحدگی بالکل واضح ہوجاتی ہے اور سائنس مذہب سے الگ راستہ اختیار کرلیتی ہے۔ یہ صرف نٹشے ہے جس نے "حیاتیاتی قوانین اور ان کے نتائج کو انسانی معاشروں پر مستقلاً لاگو کیا ہے۔ اس کے نتیجے میں محبت اور درگزر کی نفی ہوئی۔ نیز تشدد اور نفرت کے حق میں رائے بنتی ہے۔
نٹشے کے نزدیک مسیحیت خصوصاً مسیحی اخلاق ایسا زہر ہے جو انسانیت کے جسم میں داخل کردیا گیا ہے"۔

اپنی کتاب Phaedo میں افلاطون نے ایک عمومی اخلاقی رویہ قائم کیا ہے۔ اس کے نزدیک بہادری، بزدلی کی ایک شکل ہے۔ نیز نرمی، مسرت کے لالچ کا نام ہے۔ اس قسم کی نیکی ایک طرح کا کاروبار ہے۔ یہ نیکی کی شبیہ ہے، یا غلاموں کی نیکی کہلائی جاسکتی ہے۔ ایک سچا بااخلاق انسان صرف یہ خواہش رکھتا ہے کہ وہ ظاہرداری سے دور بھاگے اور روحانیت کے قریب ہوجائے۔ روح جسم کی قبر کا نام ہے۔ اپنے ظاہری وجود میں روح کبھی بھی اپنی منزل تک نہیں پہنچ پاتی اور حقیقی علم صرف موت کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اخلاق پرور انسان موت سے کبھی نہیں ڈرتا۔ سوچنے اور زندہ رہنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان مرنے کی تیاری کرے۔ آج برائی دنیا پر حکمران ہے۔ اخلاق نہ تو انسان کے فطری امکان کا نام ہے، نہ اخلاق کی بنیاد عقل پر ہوسکتی ہے" {۶}۔

{۵ Friedrich W. Nietzsche: Thus Spake Zarathustra: A Book for all and none Trans. Thomas Common (London: Allen and Unwin 1967).

{۶} Plato: Phaedo Trans. R.S. Bluck (London: Routledge and Paul 1955).

جن اخلاقی اصولوں کو ہر دور میں تسلیم کیا جاتا رہا ہے ان کو عقلی طور پر بہرحال ثابت نہیں کروایا جاسکتا اور نہ اس طریقے سے انہیں ثابت کیا جاسکتا ہے۔ افلاطون نے انسانی شہادتوں کے بجائے مابعد الطبیعیاتی مثالوں کو استعمال کیا اور ان کی بدولت وہ مذہب پر مبنی اخلاقیات کا بانی بنا۔ یہ بات عام ہے کہ افلاطون نے ایک ایسی تعلیم کو پروان چڑھایا جس کے مطابق ہر چیز کا ایک وجود ماقبل (Pre-existence) ہے اور علم کا ہر شعبہ صرف اور صرف یاددہانی کا نام ہے۔ ایسی تعلیم کا لازمی عنصر آخرت کا نظریہ ہی ہوسکتا ہے {۷}۔ اخلاق کے بارے میں افلاطون نے جو نظریات متعارف کرائے ان کی بدولت وہ مذہب کے بالکل قریب آگیا۔{۸}

ماضی کے دو اور مفکرین اپیکٹیٹس اور سینیکا اپنے فکری سفر کی بدولت ایک خاص مذہب (مسیحیت) کی طرف ملتفت ہوئے۔ اس بات کے واضح شواہد موجود ہیں کہ اپیکٹیٹس راسخ العقیدہ مسیحی تھا اور پال کے مذہب پر یقین رکھتا تھا۔ جیروم نے اپنی کتاب De Viris Illustri ous میں سینیکا کو کلیسا کے قلمکاروں میں شامل کیا ہے۔

اپنی اصل میں مسیحیت ہم آہنگی' باہمی ربط' نیز مذہب و اخلاقیات کے جاندار الحاق کا شاندار نمونہ ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں وجود پذیر ہونے والے ادب اور فنون لطیفہ نے ثابت کردیا کہ ادب اور فن اس میں شامل ہو چکے تھے۔

تاریخی نقطہ نظر سے اخلاقی سوچ دنیا کی انتہائی قدیم سوچوں میں سے ایک ہے۔ اس کے ساتھ ہی خدا کا تصور بھی ہے جو اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ انسان خود پرانا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں یہ دونوں تصورات ہمیشہ مربوط رہے ہیں۔ اخلاقیات کی تاریخ میں کوئی بھی ایسا

{۷} ابن رشد بھی یہی کہتا ہے۔

Averroes on Plato's Republic (Itaaha NY : Cornell Univ. Press 1974).

{۸} Pierre Abelard کہتا ہے افلاطون مسیحی تھا۔

سنجیدہ مفکر نہیں رہا ہے جس نے مذہب کے بارے میں رائے قائم نہ کی ہو۔ چاہے اخلاقی اصولوں کے لئے اس نے مذہب کی ضرورت کو محسوس کیا ہو یا اس کی مخالفت کی ہو۔ تاہم اس امر کی نشاندہی کی جاسکتی ہے کہ ہر دور میں اخلاق کے ثبوت موجود رہے ہیں' جبکہ الحاد کے وکلاء اور ثبوت تقریباً نابود رہے۔

وہ الحادی اخلاقی تحریکیں جن میں اخلاق کی مذہب سے علیحدگی پر زور دیا گیا ہے' ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر اخلاقی فکر یا سرگرمی اپنی شناخت مذہب کے حوالے سے کروانا چاہتی ہے۔ مذہب اور سائنس کے درمیان ان تصورات کی مسلسل کشکش کو ایک طرف رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا ارتقاء انتہائی اہم رہا ہے۔ فرانس کے اندر سرکاری تعلیمی اداروں میں جہاں مذہبی تعلیمات کی جگہ دیگر اخلاقی تعلیمات کو پڑھایا جانے لگا تھا فراغت کے وقت طالب علموں کی وہی حالت ہو گئی جو مسیحی تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم کے بعد ہوتی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر دور میں یہ رجحان موجود رہا ہے کہ اخلاقیات کو مذہب سے الگ شناخت کروایا جائے' لیکن یہ سلسلہ بہرحال چلتا رہا ہے۔

اس لئے یہ ممکن ہے کہ ایسے شخص کا تصور ذہن میں لایا جائے جو خالصتاً مذہبی ہو لیکن اخلاقی لحاظ سے خالی دامن ہو یا اخلاق کے لحاظ سے مکمل ہو' لیکن مذہبی لحاظ سے خالی دامن ہو۔ مذہب علم کی ایک قسم ہے اور اخلاق اسی علم کے مطابق زندگی گزارنے کا نام ہے (۹)۔ تاہم علم اور عمل کے درمیان ایک شدید اختلاف ہر دور میں موجود رہا ہے۔

مذہب اس سوال کا جواب ہے کہ کس طرح سوچا جائے اور کس چیز پر اعتقاد رکھا جائے

---

(۹) یہ مذہب کا خود ساختہ تصور ہے جو غالباً مسیحیوں نے قائم کیا ہے۔ دین اسلام کا حقیقی مفہوم مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں اخلاقیات کو باہر سے شامل نہیں کیا جاتا بلکہ یہ تو مجموعہ ہی اخلاقیات اور اعلیٰ اقدار کا ہے (ادارہ)۔

جبکہ اخلاقی ضابطے اس سوال کا جواب ہیں کہ کس چیز کی خواہش کی جائے' کس طرح زندگی گزاری جائے اور کس طرز عمل کو اختیار کیا جائے۔

مسیح علیہ السلام کی تعلیمات ایک مضبوط اور واضح الہامی شعور کا مظہر تھیں۔ تاہم رومیوں کی طرف سے جو محققین آئے تھے' مادی نقطہ نظر سے ان کا جذبہ بھی صادق تھا۔

''ایمان لاؤ اور نیک اعمال کرو''۔ یہ جملہ جو کہ قرآن میں پچاس سے زیادہ مرتبہ دہرایا گیا ہے دراصل کوشش ہے اس بات کی کہ ان دو چیزوں (عمل اور ایمان) کو اکٹھا رکھا جائے جن کو لوگ الگ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہ ایمان (یقین) اور اخلاق (اعمال) کا فرق ہے اور قرآن کا اس بات پر بھی اصرار ہے کہ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ چلنا چاہیے۔ قرآن ایک متضاد تعلق کو واضح کرتا ہے اور دکھاتا ہے کہ ایمان کس طرح ایک مضبوط بنیاد اور جذبہ تلاش کرلیتا ہے' ''تم اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک اس چیز کو قربان نہ کرو جو تمہیں پسند ہے''۔ یہ وہ بات نہیں ہے کہ ''مان لو اور تم ایک اچھے آدمی بن جاؤ گے'' بلکہ یہ تو الٹ ہے ''اچھے آدمی بن جاؤ' تم ایمان والے بن جاؤ گے''۔ سوال یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ایمان کو کس طرح مضبوط کرسکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ نیک اعمال کرو' تم خدا کو پالو گے۔

☐ مفاد عام اور اخلاقیات :

اخلاق کی نفی منطقی بنیادوں پر بھی کی جاتی ہے۔ منطقی انکار اس وقت سر اٹھاتا ہے جب ذمہ داری اور مفاد کے درمیان فرق مٹ جاتا ہے اور اخلاقی اصول فائدے یا مسرت کے حصول کے لئے مخصوص ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس طرح اخلاقی اصولوں کی آزاد حیثیت ختم ہوجاتی ہے۔

ارسطو سے رسل تک یہ رجحان اخلاقیات کی تاریخ میں موجود رہا ہے۔ مغرب کے

اولین مادہ پرست علماء میں سے ایک دائٹرچ وان ہالباخ نے واضح طریقے سے اس کی وضاحت کی ہے۔ پہلے وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ صرف مفاد ہی انسانی رویے کی بنیاد بنتا ہے۔ اس نے مندرجہ ذیل مفروضہ قائم کیا:

"چیزوں کے بارے میں انسان جو جذبات رکھتا ہے ان میں سے کچھ خوشگوار اور کچھ ناخوشگوار ہوتے ہیں۔ انسان ان میں سے کچھ کو پسند کرتا ہے اور تمنا رکھتا ہے کہ یہ طویل عرصے تک باقی رہیں یا دوبارہ ظاہر ہوں اور کچھ کو ناپسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان سے حتی المقدور اجتناب کرے۔

"انسان جب معاشرے میں رہتا ہے تو وہ ایسے لوگوں کے درمیان گھرا ہوا ہوتا ہے جو اسی جیسے ہوتے ہیں۔ یہ تمام کے تمام لوگ مسرت کی تلاش میں ہوتے ہیں اور غم والم سے ڈرتے ہیں۔ وہ ہر اسی چیز کو اچھا قرار دیتے ہیں جو ان کے لئے مسرت کا باعث بنتی ہے {۱۰} اور ہر اس چیز کو برا قرار دیتے ہیں جو ان کے لئے تکلیف کا باعث بنے۔ وہ ہر اس چیز کو نیکی قرار دیتے ہیں جو ان کے لئے مستقل فائدے کا باعث بنتی ہو اور ہر اس چیز کو نقصان وہ قرار دیتے ہیں جو ان کے لئے ہمسایوں کے کردار کی وجہ سے ان کیلئے نقصان وہ ثابت ہو"۔

ہالباخ کے بیان کے مطابق :

"ضمیر اس اثر سے واقفیت کا نام ہے جو ہمارے رویے سے دوسرے

{۱۰} مادّہ پرستوں کا نظریہ ان معنوں میں درست نہیں کہ انسانی زندگی میں کچھ بنیادی صداقتیں ایسی ہیں جن کا شخصی نفع یا نقصان سے تعلق نہیں۔ ان کی اپنی قدروقیمت ہے اور ذی شعور لوگ ذاتی مسرت یا غم سے بالا ہوکر انہیں اختیار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی بقاء اور فروغ کے لئے جانی اور مالی قربانیاں دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے (ادارہ)۔

لوگوں پر اور دوسروں کے رویے سے ہم پر مرتب ہو سکتا ہے اور افسوس اس سوچ کا نام ہے کہ ہمارے رویے سے دوسرے لوگ ہم سے نفرت تو نہیں کریں گے یا ہم سے ناراض تو نہ ہو جائیں گے" (۱۱)۔

جیرے بینتھم جس نے افادی اخلاقیات (Utilitarian Morality) کا نظریہ متعارف کروایا۔ کہتا ہے :

"فطرت نے تکلیف اور مسرت کے دو اصولوں کے پیچھے انسانیت کو چھپا دیا ہے۔ یہی ہمارے اعمال کے حکمران ہیں۔

اٹھارویں صدی کا فرانسیسی فلسفی ہیلوپیتس کہتا ہے :

"ہر انسانی عمل کم از کم مزاحمت کی طرف موڑ دیا جاتا ہے اور کوئی بھی شخص کوئی کام نہیں کرتا جب تک اسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس کے ذریعے وہ اپنی مسرتوں میں اضافہ کرلے گا یا اپنی تکلیف کو دور کرلے گا"۔

اس نقطہ نظر سے اخلاق ایک تہذیب یافتہ خودشناسی کی شکل اختیار کرلیتا ہے جس کے اندر ایک فرد کا سوچا سمجھا مفاد چھپا ہوتا ہے۔ عقل و دلیل مسرت کی خواہش کو اخلاقی مطالبے میں تبدیل کردیتی ہے۔ انسان کا ذہن اور دماغ اس کو اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ حال کے ساتھ مستقبل اور ماضی کو بھی دیکھ سکے' تاہم انسان کے رویے کا دارو مدار صرف مفاد پر نہیں ہوتا' بلکہ اس کی اخلاقی ذمہ داری اس کی ذاتی فلاح اور اس کی عقل پر بھی (Edudemonistic) منتج ہوتا ہے۔ اس طریقے سے نتائج مرتب کرنے کے سبب وہ مسرت اور غم کے جذبات کو تبدیل کرلیتا ہے۔ گویا یہ ڈارون کے وضع کردہ حقائق کے

---

(۱۱) Paul Henry Thirty (dietrichvon Holbach): The system of Nature or the laws and Moral and Physical World Boston J.P. Mendum 1889).

مطابق نیکی اور بدی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

نیکی اور بدی مسرت اور دکھ کے شعوری تجزیے اور غور و فکر کا نام ہے۔ اس طرح افادی اخلاقیات فطرت اور کائنات کی حدود میں رہتی ہیں۔ یہ منفعت کی حدود پار کر کے بھی کبھی اخلاق میں داخل نہیں ہوتیں جیساکہ اس لفظ سے ظاہر ہوتا ہے

اخلاقیات کی تعریف ہر دور میں لوگوں کے درمیان مختلف رہی ہے کیونکہ لوگ عام طور پر اس چیز کو اخلاق قرار دیتے ہیں جو ان کے عام دنیاوی رویوں کے مطابق نہ ہو۔ مثال کے طور پر ترک دنیا' ترک تزوج' مالی قربانی' روزہ' مختلف قسم کی پابندیاں' اصولوں کے لئے قربانیاں' دوسروں کی فلاح کے لئے قربانیاں وغیرہ وغیرہ۔

دور اول کے انسان نے پابندیوں' قوانین' ذمہ داریوں 'عقائد' ممنوعات وغیرہ کی طویل فہرست تیار کی تھی۔

اخلاق اپنے عمومی مفہوم کے لحاظ سے غیر منفعت بخش ہے۔ اس کی ایک مثال معمولات میں عورتوں اور بچوں کو اولیت کا درجہ دینا ہے۔ ہم کہتے ہیں عورتیں اور بچے سب سے پہلے ہیں جیساکہ عام رواج ہے کیا سچ بولنا اور انصاف کرنا فائدے کا باعث ہے؟ ہم اپنے ذہن میں ایسے کئی واقعات لاسکتے ہیں جب کہ جھوٹ بولنا اور انصاف کرنا کئی قسم کی منفعتوں کا باعث بن سکتا تھا۔

دوسری مثال مذہبی' سیاسی' نسلی اور قومی رواداری کا مظاہرہ کرنے کی ہے جس میں کوئی فوری ذاتی فائدہ سامنے نہیں ہوتا۔ ہاں اپنے مخالفین کو تباہ و برباد کرنا بڑا مناسب محسوس ہوتا ہے۔

رواداری اور تعلق باہمی کی وجہ سے فوری ذاتی منافع نہیں ہوتا' بلکہ اصول اور انسانیت کا رشتہ اس کی بنیاد بنتا ہے۔ بوڑھے اور بے خانماں لوگوں کی نگہداشت' معذروں نیز ناقابل علاج لوگوں کی خدمت بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ اخلاقی اصولوں کو منافع کے معیاروں کے تحت نہیں لایا جاسکتا۔ ویسے اخلاقی رویہ کبھی کبھار منافع کا باعث

بھی بن سکتا ہے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر کوئی چیز وقتی طور سے فائدے کا موجب بنے تو اس کو مستقلاً اختیار کرلیا جائے۔ اس کے برعکس ایسے واقعات بہت ہی کم ہیں {۱۲}۔

ایمانداری اور منفعت کو ایک ہی چیز سمجھنے کے تصور نے انسانی معاشرے کو بہت نقصان پہنچایا ہے' اس کا لوگوں پر ایک تباہ کن اثر مرتب ہوتا ہے۔ ایک حقیقی راست رو شخص تو وہ ہوتا ہے جو قربانی کے لئے تیار ہو اور جو گناہ کی دعوت ملنے پر اس کے قبول کرنے کے بجائے اپنے اصولوں پر کاربند رہے۔ اگر نیکی کا فائدہ محسوس ہوتا ہو تو تمام ذہین ٹھگ اور نوسرباز نیکی کی مثال بننے کی کوشش میں لگ جائیں گے۔

ماہرین جرائم نے جو تجربات کیے ہیں وہ تلخ بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ شکاگو پولیس کی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۵۱ء میں جس قدر چوریاں اور جعلسازیاں ہوئی تھیں ان میں سے ۹۰ فیصد کا ابھی تک سراغ نہیں ملا۔ اسی طرح کیفار کے سوال نامے سے ظاہر ہوتا ہے کہ امریکہ کے جرائم پیشہ افراد لاکھوں کروڑوں ڈالر چھین لیتے ہیں اور اس "مال غنیمت" کو تقسیم کیے بغیر خود ہی ان سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔ ماہرین جرائم کا خیال ہے کہ جرم منافع بخش ہوتا ہے خصوصاً ان لوگوں کے لئے جو اس کاروبار کو منظم طور پر کرتے ہیں اور جو منشیات فروش گروہوں اور دوسرے مجرم گروہوں کی طرح ایک ہی کاروبار سے چمٹے نہیں رہتے۔

یوں لگتا ہے کہ قتل کا جس قدر فائدہ ہوگا' قاتل کے گرفتار ہونے اور سزا پانے کے مواقع اسی قدر کم ہوں گے' یہ رائے ایک امریکی ماہر جرائم کی ہے۔

عریانی' فحاشی اور جنسی جرائم پر مبنی کہانیوں اور اس قسم کے دیگر جرائم کا معاملہ بھی

{۱۲} Jeremy Bentham: An Introduction to the Principles of Morals and Legislation (London: Athlone Publishing 1970).

ایسا ہی ہے۔ ایک سروے کے مطابق عام فیچر فلم بنانے کی نسبت ایک عریاں فلم بنانے کا خرچ دس گنا کم ہوتا ہے اور اس کا منافع بھی عام فلم سے دس گنا زیادہ ہوتا ہے {۱۳}۔

جرائم کی سب سے نمایاں مثالیں وہ ہیں جن میں جرم بڑے پیمانے پر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جارحانہ جنگیں' دوسرے ممالک پر ناجائز قبضہ' اقلیتوں پر ظلم و ستم وغیرہ۔ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ میکسیکو وسطی امریکہ اور جنوبی امریکہ سے ریڈ انڈینز کے نکالنے سے اہل ہسپانیہ کو فائدہ نہیں ہوا؟ یہ کہ شمالی امریکہ کے ریڈ انڈینز کے نکلنے سے گورے آباد کاروں کو فائدہ نہیں ہوا؟ یا یہ کہ تمام نو آبادیاتی قوتوں نے مقبوضہ علاقوں کو تباہ و برباد کر کے رکھ نہ دیا یا یہ کہ تمام توسیع پسندانہ آمریتوں نے مفادات حاصل نہ کیے؟ اس لئے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جرائم کا صرف اسی صورت میں فائدہ ہے جب وہ منظم طور پر کیے جاتے ہیں اور طاقتور کمزوروں کو نشانہ بناتے ہیں {۱۴}۔

افادی اخلاق کا فائدہ اس وقت ہو سکتا ہے جب یہ ایک نظریاتی ماڈل ہو۔ تاہم صرف عقل و دلیل سے خدا کی نفی کر کے' یہ ناممکن ہے کہ خود غرضی کی بناء پر قربانی والے حقیقی اخلاقی ضابطے قائم کر دیئے جائیں۔

ارسطو نکوماکس کی آراء سے اتفاق نہ رکھتا تھا۔ وہ خود پسندی کے نظریے سے ایثار کا نظریہ اخذ کرتا ہے کیونکہ ایثار کا آغاز اپنی ذات سے ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے :

{۱۳} Questionnaire 1976, Paris.

{۱۴} ایسے جرائم دراصل ضعیفی کی سزا ہوتے ہیں۔ اور تاریخی تسلسل میں یہ بھی نفع کا سودا نہیں ہوتے۔ جو گروہ یا قومیں ایسے جرائم کا ارتکاب کرتی ہیں کچھ ہی عرصہ بعد دوسروں کے تشدد کا نشانہ بنتی ہیں۔ چنانچہ یہ نتیجہ نکالنا درست ہوگا کہ نسل انسانی کی فلاح جرائم کے ارتکاب میں نہیں' ان کے انسداد اور خاتمے میں ہے۔ (ادارہ)۔

"اخلاق پرور انسان اپنے دوستوں اور اپنے ملک کے لئے بہت سے کارنامے سرانجام دے گا۔ وہ اپنی دولت اور جائیداد قربان کردے گا۔ اپنے عہدوں اور اعزازات کو دوسرے لوگوں کے لئے چھوڑ دے گا ___ علاوہ ازیں اس کے لئے یہ بھی آسان ہے کہ دوسروں کے لئے یا اپنے وطن کے لئے اپنی جان بھی قربان کردے {۱۵}۔

یہ واضح ہے کہ یہ رویے بذات خود منضبط نہیں ہیں اور نہ ہی ان سب کا مصدر ایک ہے۔ بہت سے لوگوں نے اس اختلاف کو نوٹ کیا ہے۔ شیلی ہرماشنز ارسطو کی "نیکیوں کے ڈھیر" پر تنقید کرتا ہے {۱۶} جو ول کا کہنا ہے "کہ اخلاقی اصولوں سے رہنما اصول وضع کرتے ہوئے ارسطو تسلسل قائم نہ رکھ سکا جو اس طریقے سے اخذ کرنا ممکن بھی نہیں ہے۔ ارسطو کہتا ہے : "جب کوئی شخص قائدانہ (Heroic) رویہ اختیار کرلیتا ہے تو ہم اس وقت بھی خودپسندی کا انکار نہیں کرسکتے کیونکہ جو دوسروں کے لئے موت کو گلے لگاتے ہیں . وہ سب سے بہترین اور خوبصورت کا انتخاب اپنے لئے کرلیتے ہیں"۔ وہ کہتا ہے کہ : ذاتی منافع اور خودپسندی کا تصور ہر انسان کے دماغ میں موجود رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص جلتے ہوئے گھر میں داخل ہوکر ایک بچے کو بچانے کی کوشش کرتا ہے تو کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے یہ کام خودغرضی سے پاک ہوکے صرف اپنی نیک دلی سے کیا ہے؟ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، لیکن جو شخص اخلاص سے کسی کی بھلائی کے لئے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتا ہے تو یہ کام اس کے لئے بہت بڑی منفعت ہے اور اس میں دوسروں

{۱۵} Aristotle: The Nicho machean Ethics trans. David Ross (London: Oxford University Press 1054).

{۱۶} Fridrich Schleiermache : on religion 'Speeches to its cultural despisers Tran. John Mann (New York. Ungar 1955).

کے ساتھ اس کا بھی فائدہ ہے۔ البتہ اس معاملے میں یہ بات ضرور قابل توجہ ہے کہ قربانی اور منفعت ایک ہی چیز نہیں ہیں' بلکہ یہ تو اخلاقی منفعت ہے۔ اگر ہم عمومی فائدے اور اخلاقی فائدے کو دیکھیں تو یہ مادی دنیا میں اخروی دنیا کا پرتو ہیں اور یوں یہ اخلاقی منفعت بھی ہے۔ اپنی زندگی میں کسی چیز کے لئے قربانی دینے کا فائدہ تب ہی ہو سکتا ہے جب ایک دوسری دنیا موجود ہو۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو ایک دوسری چیز موجود ہے اور یہ لامحدود چیز زندگی ہے۔

مستند اخلاق ایک ایسے رویے کا نام ہے جس کا تصور انسان کے اپنے فائدے سے ہٹ کر ہے۔ ایک اور عمل موجود ہے جو پہلی نظر میں تو یکساں محسوس ہوتا ہے' لیکن عملی طور پر یہ بالکل الگ چیز ہے۔ اسے ہم "سماجی رویہ" کہہ سکتے ہیں۔ اپنی معاشرتی زندگی میں انسان ہمیشہ اپنے معاشرتی فائدے کے مطابق طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ معاشرت تمام منفعتوں کا اظہار بن جاتی ہے۔ یہ نئی صورت حال معاشرے کے مختلف پہلوؤں کے لئے مختلف ذمہ داریاں تفویض کرتی ہے۔ ذاتی منافع کے لئے کی جانے والی سرگرمیاں ذمہ داریاں اور سماجی فرائض بن جاتی ہیں۔ کیونکہ کبھی کبھار یہ شبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ فرد اپنے فائدے کے لئے نہیں' بلکہ معاشرے کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ذاتی فائدوں کے حصول کے لئے ایک مخصوص دائرے کا نام معاشرہ ہے۔ غرض وغایت تبدیل نہیں ہوتی' بلکہ ایک ہی مقصد کے حصول کے لئے اس کی شکل تبدیل ہوجاتی ہے۔ جس چیز کو مفاد عامہ قرار دیا جاتا ہے وہ سراسر ذاتی منفعت ہے۔ اس کے اندر خودغرضی بھی پائی جاتی ہے اور بداخلاقی بھی۔ اجتماعی اقدام اس وقت کیا جاتا ہے جب کسی گروہ میں اکثریت کو اس کام یا خدمت کی ضرورت ہو اور اس کو "سب سے بڑا اور اہم اصول" قرار دیا جائے۔

جو چیز انسانوں کو ذہانت کی شکل میں فراہم کی جاتی ہے وہ جانوروں کو حواس کی صورت میں ملتی ہے۔ مثال کے طور پر چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں یا جنگلی جانوروں کا

طرز عمل ملاحظہ فرمایئے۔ انسان کو جو کچھ عطا ہوتا ہے وہ ذہانت کی صورت میں ہے۔ جانوروں اور حشرات الارض کے گروہی رویے کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہاں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے اخلاقی رویہ قرار دیا جاسکے۔ اس کا ثبوت واضح ہے۔ سماجی رویے کے پس پشت مفاد ہوتا ہے اور اخلاقی رویے کی پس پشت شعور۔ خودغرضی کے نام پر اختیار کیا جانے والا رویہ ایک چیز ہے اور ذمہ داری کے نام پر اختیار کیا جانے والا رویہ ایک دوسری چیز ہے۔ پہلے رویے کی بنیاد مفاد' ضرورت' نظم وضبط اور دلیل پر ہے اور دوسرے رویے کی بنیاد صرف اور صرف خدا پر اعتقاد ہے۔

ایک اور نکتہ جو اس فرق کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے' اخلاقی طرز عمل' روحانی تکمیل' نیز بھلائی' سچائی اور انصاف کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ {۱۷}اس کے برعکس اجتماعی رویے کی بنیاد نظم وضبط پر ہونی چاہیے۔ یہ نظم وضبط جرائم کے لئے ہی کیوں نہ ہو' لیکن عموماً یہ رویہ غیر اخلاقی ہی ہوتا ہے۔ ٹالسٹائی نے اسے "ریاستی یا وہ گوئی" یا "فلاح عامہ کی بکواس" قرار دیا ہے۔ ایک گروہ یا ایک قوم کا اجتماعی مفاد اس بات کا متقاضی بھی ہوسکتا ہے کہ ایک دوسرے گروہ یا قوم کا استحصال کیا جائے ان کو غلام بنایا جائے یا اس کے افراد کو نکال باہر کیا جائے۔ قوموں کی جدید تاریخ' خصوصاً آمریت کی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ کس طرح "مفاد عامہ" کے جعلی نعروں کے پردے میں قوموں اور گروہوں نے مجرمانہ کردار ادا کیا۔

موجودہ دور میں یہ مثال بھی ابھر کر سامنے آئی ہے کہ کس طرح مفاد عامہ کا نعرہ ایک عمومی پیچیدگی اور خطرناک نتائج کا باعث بن سکتا ہے۔ کیمونسٹ منشور میں اعلان کیا گیا ہے کہ یہ پرولتاری اخلاقیات کا اس بنیاد پر انکار کرتے ہیں کیونکہ یہ بورژوا طبقے کی جعل

{۱۷} Gottfried W. Von Leibniz, New Essays Concerning Human understanding ed. Karl

سازی ہے۔ دوسری بین الاقوامی کانگریس نے اس نکتے کا اعادہ کیا تاکہ انصاف کے اصول کی تصدیق کی جائے اور اس خیال کو ترک کردیا جائے کہ اگر انجام اچھا ہو تو ذرائع کی کوئی اہمیت نہیں ہے' تاہم لینن اشتراکی منشور کی طرف لوٹا اور اس نے کہا :

"اخلاق بس وہ چیز ہے جو پرولتاریوں کی فتح میں مددگار ہو"۔ لینن کے اصول پر عمل کرتے ہوئے سٹالن نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پرولتاریوں کی فتح کا مفاد اس چیز میں ہے اور اس لئے یہ جائز بھی ہے اور اخلاقی بھی کہ حکومت اور پولیس کو مضبوط کیا جائے اس منفرد انداز میں کہ اس کے بارے میں پہلے کبھی بھی سنا نہ گیا ہو۔ حکومت اور افسران کے خلاف ہر تنقید کو روکا جائے اور یہ خیال متعارف کروایا جائے کہ سرکاری افسران اور حکومت غلطی نہ کریں گے ایسے لیڈر کو متعارف کروایا جائے جس سے خطا کا احتمال نہ ہو اور وہ طاقت کا منبع ہو۔ ریاست کی طرف سے خوف کی ایک ایسی حالت طاری کردی جائے کہ مزاحمت اور ردعمل کی کوئی بھی کوشش شروع نہ ہوسکے۔ ناپسندیدہ لوگوں' گروہوں اور قوموں کو وقتاً فوقتاً "صاف" کیا جاتا رہے۔ اعلیٰ ترین تنخواہوں اور دوسری مراعات کے ذریعے فوج' پولیس' سیاسی اداروں اور خفیہ اداروں کے تابع فرمان شعبوں کو نوازا جائے اور اس ذریعے سے وزیروں' مشیروں اور حکمران طبقے کے دوسرے لوگوں کو سہولیات فراہم کی جائیں۔ اطلاع اور نشریات کے تمام اداروں' مثلاً پریس' ریڈیو' ٹیلی ویژن پر پورا اختیار حاصل کرلیا جائے اور ان اداروں کو مجبور کردیا جائے کہ وہ بے تکان جمہوریت' آزادی' انسان پروری' عوامی فلاح اور روشن مستقبل وغیرہ کی باتیں کرتے رہیں اور راہنماؤں اور افسروں کی نیکیوں اور بھلائیوں کے راگ الاپتے رہیں اور ایسی ذہنی فضا پیدا کریں کہ دوسرے ممالک کو زیرنگین لایا جاسکے اور اس قسم کی دوسری حرکات جاری رکھی جاسکیں"۔

پرولتاریوں کی فتح کے لئے یہ سب کچھ ضروری تھا اور چونکہ پرولتاریوں کی فتح کے لئے یہ ضروری تھا اس لحاظ سے جائز بھی تھا اور اخلاقی بھی تھا{۱۸}۔

مذہبی اخلاقی اصول برائی کے آگے بند باندھتے اور مزاحمت کرنے کا اصول سکھاتے ہیں اور واضح یا غیر واضح شکل میں یہ ہر اس نظام میں موجود ہیں جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ افادی اخلاقیات اس کے برعکس اصول کی وکالت کرتی ہے۔ افادی مادیت کے مبصرین واضح طور پر اصرار کرتے ہیں کہ کوئی شخص جو ایسے مذہبی اصولوں پر عمل کر رہا ہو جن پر کوئی دوسرا عمل نہ کر رہا ہو تو اس کا فعل عقل کے خلاف ہے اور افادی نقطہ نظر سے یہ سوچ ایک مستقل اصول ہے' علاوہ ازیں اس اصول سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ افادی اخلاق حقیقی اخلاق کا نام نہیں ہے اور اس کا اخلاق سے کم اور سیاست سے زیادہ تعلق ہے۔ علاوہ ازیں اخلاقی معاملات میں متضاد رویہ اختیار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بنیاد بدل دی جائے۔

انگریزی ادب میں افادی اخلاق کو "اخلاقی نتائج" بھی قرار دیا گیا ہے۔ کوئی چیز بھی اخلاقی یا غیر اخلاقی ہو سکتی ہے جس کا تعلق رویوں سے ہو جو اچھے یا برے نتائج پیدا کرتے ہیں۔ ہم نے یہ دیکھا ہے کہ حقیقی اخلاقیات میں نتائج کو مدنظر نہیں رکھا جاتا' جبکہ حقیقی اخلاقیات میں تو صرف ارادوں اور نیت کو ہی مدنظر رکھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں نتائج اور اثرات سراسر خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔

{۱۸} سوویت باشندوں کے لیے وضع شدہ قانون میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر شخص کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ محنت کش طبقے کا وفادار ہو۔ یہ ذمہ داری اخلاقی طور پر نہیں' سیاسی طور پر سرانجام دی جائے۔ اگر ایک نمایندہ یا افسر یہ اعلان کرتا ہے کہ میں محنت کش طبقے کے مفاد کا نگران ہوں تو عوام کے لیے اگلا قدم یہ ہے کہ وہ فی الفور اس کے ساتھ مخلص ہو جائیں۔ مارکسی اخلاقیات کا نمونہ ہنگری کے ہائی سکول میں پڑھائی جانے والی درسی کتاب کے اس پیراگراف سے ہوتا ہے۔ "کوئی طالب علم اپنی ماں کو قتل نہ کرے مگر جب وہ یہ دیکھے کہ اس کی ماں غدار ہو گئی ہے"۔

❑ بے خدا اخلاقیات :

عملی اور اخلاقی تجربات سے متعلق لوگوں کے اندر بہت سی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں کہ وہ اخلاقی تعلیمات سے نا آشنا اور کلیسا یا خدا پر یقین نہیں رکھتے اور عام طور پر ان کے قول و عمل میں عدم مطابقت پائی جاتی ہے۔ ان میں بہت سے لوگ تو ایسے ہیں جو اپنے آپ کو بہت زیادہ مذہبی خیال کرتے ہیں اور مذہب کی تبلیغ بھی کرتے ہیں۔ لیکن عملی زندگی میں ان کا رویہ ایک متشدد دنیا پرست جیسا ہوتا ہے۔

اسی طرح کچھ اور اصول پسند مادہ پرست بھی ایسے ہوتے ہیں جو بہت زیادہ ایماندار ہوتے ہیں اور جو دوسرے لوگوں کے لئے لڑنے اور صعوبتیں برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ اس عدم ربط اور اس پیچیدگی کے سبب عجیب و غریب صورتحال پیدا ہوتی ہے اور اس کی بدولت بہت سے ایماندار اور واضح سوچ رکھنے والے لوگ بھی دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

ہمارے عقیدے اور ہمارے رویے کے درمیان کوئی خودکار نظام نہیں ہے۔ ہمارا رویہ بنیادی طور پر اپنی پسند نہیں ہوتا۔ یہ تعلیم اور ان رویوں کا حاصل ہوتا ہے جو کہ بچپن میں تشکیل پاتے ہیں۔ ہمارے رویے بعد کے فلسفیانہ یا سیاسی رویوں کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ اگر کسی شخص نے بچپن میں یہ سیکھا ہے کہ بڑوں کا احترام کیا جائے' وعدہ پورا کیا جائے' لوگوں کو اخلاقی معیار پر تولا جائے، دوسروں سے محبت کی جائے ، ان کی مدد کی جائے۔ سچ بولا جائے' منافقت سے نفرت کی جائے ، ایک سادہ' باوقار شخص بنا جائے' تو بعد میں جو سیاسی رائے بھی وہ اختیار کرے اور جس فلسفے کو بھی وہ پسند کرے اس کی ذات میں بچپن کے خیالات کے اثرات بہرحال باقی رہیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ اخلاق کے یہ اصول مذہب کے بھی مرہون منت ہوتے ہیں۔

انسان اور انسان کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے تعلیم ان تصورات کو آگے بڑھاتی ہے جو مذہب سے مستعار لئے گئے ہوتے ہیں' لیکن یہ اس اصل روح کے ذریعے منتقل نہیں ہوتے جس کے ذریعے مذہبی تعلیمات منتقل ہوتی ہیں۔ کسی مذہب کو چھوڑنے اور کسی مذہب کے اخلاقی اصولوں کو چھوڑنے کے درمیان صرف ایک ہی قدم کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس ایک قدم کو بھی طے نہیں کرپاتے۔ وہ مذہب کو نہیں مانتے' لیکن اس مذہب نے جو اخلاقی تعلیمات متعارف کرائی ہوں' ان پر پوری طرح عمل پیرا رہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مذہب کا انکار بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ نتائج پروان چڑھتے ہیں جس سے معاملات الجھتے چلے جاتے ہیں۔ اخلاقی اصولوں کے پیروکار ملحد اور بد اخلاقی پر کاربند اہل ایمان پیدا ہوتے ہیں۔

یہ سوال کہ آیا خدا کے بغیر اخلاقیات ممکن ہے؟ نظری بحثوں کا ہر دور میں موضوع رہا ہے' کیونکہ نہ تو اس کی آزمائش کی جاسکتی ہے اور نہ ہی کسی تاریخی واقعے کے ذریعے اس کی سچائی کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ کے کسی بھی دور میں ایسے گروہ کا کبھی ذکر نہیں ملتا جو مکمل طور پر غیرمذہبی ہو۔ نہ ہمیں ایسے علاقوں اور ممالک ہی کا ذکر ملتا ہے جہاں صدیوں سے لوگ مذہب سے نالاں ہوں اور اس سے نفرت کرتے ہوں اور نسلوں پر نسلیں اسی طرح پیدا ہوتی چلی گئی ہوں۔ اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ اخلاقیات کا تعلق ہر دور میں مذہب سے رہا ہے اور اگر بے خدا تہذیب اور بے خدا ثقافت کا وجود رہا ہے تو ایسے معاشرے عام دنیا سے ہٹ کر تو واقع نہیں ہوسکتے۔ ہمارے سامنے سارا ماضی موجود ہے اور ماضی کسی نہ کسی صورت میں اپنی شعاعیں خارج کرتا رہتا ہے اور تمام دنیا اپنے اثرات بھی مرتب کرتی چلی جاتی ہے۔ میں اس پر اصرار کروں گا کہ وہ رویے' قوانین' انسانی تعلقات اور معاشرے کا سماجی ربط جس میں لوگ پروان چڑھتے ہیں اور جس میں معاشرے کے افراد مذہب سے بالکل لاتعلق رہتے ہیں ایسے لوگ ہر اس چیز سے مختلف ہوں گے جو مذہبی گروہوں اور معاشروں کے لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح

اس معاشرے کے لوگ اس معاشرے کے لوگوں سے مختلف ہوں گے جن کی تربیت الحادی ماحول میں ہوئی ہو۔ {۱۹} بہت سے غیرمذہبی لوگ بھی الحادی معاشرے سے آشنا نہیں ہوتے۔ اگر انہیں خالص الحادی معاشرے کے خیالات اور قوانین سے متعارف کرایا جائے یا ان کا اچانک الحاد کے کسی ایسے معاشرے سے واسطہ پڑ جائے جہاں اس پر عرصہ دراز سے عمل ہو رہا ہو تو وہ ششدر رہ جائیں گے {۲۰}۔

کچھ لوگ عقیدے کے لحاظ سے ملحد ہوتے ہیں، لیکن ان کے اندر اخلاقی الحاد نہیں پایا جاتا، گویا غیرمذہبی آدمی کے اخلاق کی جڑ بھی مذہب ہی میں پائی جاتی ہے۔ ایک ابتدائی فراموش شدہ مذہب ابھی تک تمام اطراف سے شعاعیں خارج کر رہا ہے، فلم، ادب، خاندان، طرزِ تعمیر وغیرہ اس کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے سورج غروب ہو چکا ہے، لیکن رات کے وقت جو چیز گرمی بہم پہنچاتی ہے وہ سورج ہی سے آتی ہے۔ اگر چولہے کے اندر شعاعیں فروزاں ہوں تب بھی تمام کمرے میں اس کی گرماہٹ محسوس کی جاتی ہے۔ اخلاقیات اسی طرح ماضی کا ایک مذہب ہے جس طرح صدیوں تک کوئلہ (گرمی پہنچانے کا سبب) رہا ہے۔

روحانی ورثے کے تمام آثار مٹا کر اور اس کی تمام بنیادیں منہدم کرکے ہی یہ ممکن ہوتا کہ ایسے نفسیاتی آثار پیدا کیے جائیں جن کے سبب پوری نسل کو الحاد کی لڑی میں پرویا جا سکے۔

انسانیت ہزاروں سال سے مذہب کے زیرِ اثر رہی ہے۔ مذہب زندگی کے تمام

{۱۹} اگر باہمی تعلقات کے الفاظ کو نکال دیا جائے تو موجودہ زبانوں کا صرف نواں حصہ باقی رہ جائے گا۔

{۲۰} George Orwell Nineteen Eighty Four ed. Irving Huwe New York Harcourt Brace and World 1963).

شعبوں مثلاً اخلاق' قانون' عقائد' حتیٰ کہ زبان تک میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اس لحاظ سے یہ بحث اٹھانا موزوں ہے کہ کیا آج خالص الحادی نسل تیار کرنا ممکن ہوگا یا نہیں؟ یہ کوشش ایک الگ تھلگ ماحول ہی میں ممکن ہوگی۔ اس تیار شدہ نسل کے لوگوں کو قرآن' انجیل اور تمام مذہبی حوالوں سے دور رکھنا ہوگا۔ ان کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ فنون لطیفہ کے نمونے دیکھیں۔ کوئی الہامی گیت سنیں یا سوفوکلیز سے بیکٹ تک لکھے گئے ڈراموں کو پڑھیں یا سٹیج پر دیکھیں۔ نیز انسانوں نے فن تعمیر کے جو نمونے تیار کیے ہیں اور تمام ادبی شہ پارے جو آج تک لکھے گئے ہیں ان سب کو منظر سے ہٹانا اور چھپانا پڑے گا۔ انسانی ثقافت کے جتنے مظاہر اور نتائج ہیں اس نسل کو اس سے محروم رکھنا ہوگا۔ کیونکہ انسان کی مذہب سے رغبت فطری ہے۔ موت کے متعلق ہیملٹ کی خودکلامیاں (Monologues) مائیکل اینجلو کے شاہکار' اور قانونی اصولوں کے علم کو اس نسل سے دور رکھنا ہوگا کیونکہ ان چیزوں کا مشاہدہ نسل نو کے ہر فرد کے ذہن میں ایک دوسری دنیا کی یاد تازہ کردے گا جو کہ موجودہ الحادی دنیا سے بالکل الگ ہوگی۔ سائنس کے ساتھ بہرحال یہ معاملہ نہیں ہے۔ مستقبل کے ان ملحدوں کے لئے خطرہ نہ ہوگا جو تمام تکنیکی علوم اور ریاضی پر مہارت حاصل کریں یا جو عمرانیات کے جدید ترین اصول یا سیاسی اقتصادیات کے رموز میں مہارت حاصل کرلیں۔

۱۹۶۰ء کا چین کا ثقافتی انقلاب حال ہی میں وقوع پذیر ہوا ہے۔ اس لئے اس کے نتائج کے بارے میں فیصلہ کرنا قبل از وقت ہے۔ تاہم یہ بات کسی شک و شبے سے بالاتر ہے' کہ اس ثقافتی انقلاب کے اغراض و مقاصد میں یہ مقصد بھی شامل ہے کہ چین کے روحانی ورثے کا نام و نشان مٹا دیا جائے جو کہ سرکاری طور پر ماؤ کے فلسفے اور نظریے سے ٹکرا رہا تھا۔ {۲۱} ثقافتی انقلاب جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے' سیاسی یا معاشرتی

{۲۱} ثقافتی انقلاب کے بعد ٹالسٹائی' شیکسپیر اور بیتھوون کی تصنیفات پر بھی پابندی لگ گئی۔

انقلاب سے ہٹ کر ایک الحادی نظام قائم کرنے میں ناکام رہا ہے' کیونکہ تمام تر معاشرتی روایات خاموشی سے کسی نہ کسی مذہب کی نمائندگی کر رہی تھیں۔ ایسی ہی بات مارکس کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔ یہ تو یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ کون سے اخلاقی' ذہنی' یا روحانی مصادر نے اس کو لادینی نظریات اپنانے پر اکسایا' لیکن انسان پروری کی تعلیم کے اثرات اس کی ابتدائی تصنیفات سے واضح ہیں۔ {۲۲}انسان کائنات میں تنہا ہے۔ اس کے متعلق اس نے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ مکمل طور پر ایک اخلاقی اور انسانی نظریہ ہے۔ اس مادہ پرست فلسفی سے اس کی توقع بالکل نہ کی جاسکتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مارکس گزرتے ہوئے سالوں کے ساتھ اپنی جوانی کی فکری لغزشوں سے آگاہ ہوگیا تھا۔ ناقدین "ابتدائی مارکس" اور "بالغ مارکس" کے درمیان واضح خط تفریق کھینچ رہے ہیں۔ فکری بلوغت کا یہ اندرونی عمل بالیقین اخلاقی اور مذہبی ہے اس میں مادہ پرستی کی سوچ کی شمولیت رفتہ رفتہ ہوئی ہے۔

موجودہ نسل جو کہ بظاہر غیر مذہبی' بلکہ ملحد ہے۔ اس کی پیدائش مذہب سے لاعلمی کے ماحول میں نہیں ہوئی' بلکہ مذہب سے واقفیت کے ماحول میں ہوئی ہے اگر اس نسل نے خدا کے نام پر محبت' اخوت اور مساوات کے مسیحی اصول تسلیم نہیں کیے تو ان کا انکار بھی نہیں کیا اس لئے ہمیں کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ موجودہ نسل کو مثال بنا کر یہ دعویٰ کریں کہ غیر خدائی تہذیب کا وجود ممکن ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ موجودہ نسل اور اس کی ثقافت غیر محسوس انداز میں مذہب' اخلاق اور اخلاقی اصولوں سے متاثر رہی ہے۔ الفاظ کو محدود کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ نئی نسل نے ایک نئے نظریے کو تسلیم کرلیا ہے اور اس میں تعلیم اور اخلاقی اصول پرانے محسوس ہوتے ہیں۔ تعمیر کرنے والے پرانے

{۲۲}Jean Jacques Rousseau On the Origin of Inequality G.D.H. Cole (Chicago Encylopedia Britannica 1955).

ہیں' نقشہ نیا ہے۔ ہمارے روزمرہ کے مشاہدے میں یہ نظام ان لوگوں کی مشابہت زیادہ اختیار کر لیتا ہے جو اس کو پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں ان لوگوں کی مشابہت اختیار نہیں کرتا جنہوں نے اس نظریے کو پیش کیا اور پھیلایا ہے۔

اگر انسان کی اصل الاصول اخلاق ہے اس کا نظریہ اور سیاسی انتخاب نہیں ہے' تب ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ دنیا دور اول کے لوگوں نے نئے خیالات کے ساتھ پیدا کی ہے۔ وہ لوگ نظریات اور قربانی کی بات کرتے ہیں جو کہ عملی طور پر نظریوں اور قربانیوں کے شدید مخالف ہیں۔ کمیونسٹ چین اور سوشلسٹ روس میں رفتار کار بڑھانے کے لئے "اخلاقی محرک" کو جو استعمال کیا جاتا ہے ناقدین کا کہنا ہے کہ بنیادی طور پر یہ بھی عوام الناس کے چھپے ہوئے مذہبی جذبات کو ابھارنے کا ذریعہ ہے۔ الحادی نقطہ نظر سے اسے کیا تعبیر دی جائے کہ مادی محرکات کو ہٹا کر اخلاقی محرکات کو متعارف کرایا جا رہا ہے۔ یہ تو فطری بات ہے کہ نظریات کے ذریعے مذہبی مقاصد حاصل کیے جائیں' لیکن یہ کس طرح ممکن ہے کہ معاشی مفادات' چھپے ہوئے مذہبی جذبات کے ذریعے حاصل کیے جائیں۔ یہ چیز تو بہرحال عجیب و غریب محسوس ہوتی ہے کہ غیرمذہبی مقاصد کے لئے مذہبی شعائر استعمال کیے جائیں۔

یہ سوال کہ آیا مذہب کے بغیر اخلاق ممکن ہے ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی انسان سے کہا جائے کہ وہ خدا کے نام پر کچھ کرے جس کا اس کا مذہب مطالبہ کرتا ہے۔ اخلاقیات کا نظام استوار کرتے ہوئے مادہ پرست بڑی مسرت کے ساتھ اس فارمولے کی طرف راہنمائی کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے اخلاقی رویے کے پیچھے اس کا ضمیر ہوتا ہے' خوف خدا نہیں ہوتا۔ ایک ملحد فلسفی اس فارمولے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے :

"میں اس اصرار کی جرأت کروں گا کہ الحاد کا سادہ سا مطلب تو انسان اور انسانی اخلاق کا عروج ہے۔" اگر میں ایک آزاد انسان ہونے کے ناطے ایک اندرونی آواز کو سنتا ہوں' جبکہ کسی دوسرے انسان نے اس کا حکم بھی نہ دیا

ہو' اور یہ آواز نہ تو مجھے چوری پر اکساتی ہے نہ ہی کسی کے قتل پر اکساتی ہے۔ اگر میں اس کو اپنے اندر محسوس کرتا ہوں اور یہ میں کسی خدائی' معاشرتی یا مطلق (ہستی) کی طرف سے محسوس نہیں کرتا' تب یہ انسانیت کی تذلیل نہیں ہے۔ اس کی بنیاد تو میری اندرونی روشن ضمیری پر ہے"۔ {۲۳}

آخرکار ہم اپنے آپ سے پوچھنے پر مجبور ہیں کہ کس نے تصورات کو سمجھنے میں غلطی کھائی ہے؟ کیا ضمیر اور شعور حقیقی دنیا کے اجزاء ہیں؟ کیا ضمیر کی خلش انسان میں مذہب کی ادنیٰ شکل نہیں ہے؟ مادہ پرست خدا کی بجائے انسان کی طرف بار بار اشارہ کرتے ہیں جیساکہ مارکس بھی کرتا رہا اور اس نے کہا کہ انسان کی مطلق انسانیت میں امید رکھنا ایسا ہی شائبہ ہے جیساکہ مذہب کا شائبہ ہوتا ہے۔ بات بالکل واضح ہے "اگر خدا نہیں ہے تو پھر انسان بھی نہیں ہے"۔

لینن نے اصول وضع کیا کہ سائنسی اشتراکیت کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ اشتراکی منشور میں یہ درج ہے کہ "کارکن اخلاقیات کو رد کرتے ہیں"۔ عام طور پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ کیونزم تاریخی ترقی کی ضرورت کے طور پر ظہور پذیر ہوتا ہے اور اخلاقی یا انسانی وجوہات سے ظاہر نہیں ہوتا۔ مارکس نے اولین دور میں جو تحریریں لکھی تھیں وہ اس کی ان تحریروں سے بالکل مختلف ہیں جو کہ آجکل اس سے منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ :

"قانون استحصال انسانی تعلقات میں فطری قانون بن کر سامنے آتا ہے اور ہر شخص دوسرے شخص کا اس وقت تک استحصال کرتا رہے گا جب تک اس کو کسی قوت کے ذریعے روک نہ دیا جائے۔ یہاں ضمیر کی "اندرونی آواز

{۲۳} Professor Vuko Pavicavic at The Belgrade Dialogue of Atheists and Theologists held May 1971.

'رواداری' فطری انسان پروری وغیرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ استحصال اس وقت تک باقی رہے گا جب تک باہمی تعلقات کی نوعیت میں تبدیلی کرکے اس کو ختم نہ کردیا جائے۔ اس کا انحصار نہ تو لوگوں کی مرضی پر ہے' نہ ان کی اخلاقی اور اس قسم کی دوسری صلاحیتوں مثلاً تعلیم' کردار' رائے وغیرہ پر ہی ہے اور نہ ان کے باہمی تعلق' مثلاً قومی' خاندانی وغیرہ پر ہی ہے"۔

جب مارکس اپنی کتاب سرمایہ میں بچوں کے استحصال کا ذکر کرتا ہے کہ کس طرح ان کی فاقہ زدہ مائیں ان کا استحصال کرتی ہیں تو وہ لامحالہ ہماری توجہ انسانی معاشروں پر قانون استحصال کے اثرات پر مبذول کروا رہا ہوتا ہے۔ {۲۴} یہی وجہ ہے کہ کچھ مارکسی حضرات اس "اخلاقیات" کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ انسان اور مطلق العنانیت کے ذریعے اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ {۲۵} مارکس ہمیشہ اس چیز پر زور دیا کرتا تھا کہ انسان' انسانیت' شعور اور اسی قسم کے دیگر تخیلات میں مذہبی تصورات ساتھ ساتھ موجود رہتے ہیں۔ ہم مارکس کے ساتھ اس موضوع پر اتفاق کرسکتے ہیں' لیکن موجودہ دور کے مارکسی حضرات مارکس کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے۔

برطانوی لائبریری سے کتابیں حاصل کرکے مارکس کے لئے یہ کہنا آسان ہے کہ اخلاقیات کا کوئی وجود نہیں ہے' لیکن جو لوگ مارکس کے خیالات کو سمجھنا چاہتے ہیں اور ان تصورات پر ایک معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کو باقی رکھنا چاہتے ہیں انہیں اس چیز کی ضرورت ہے کہ وہ لوگوں کے ذہنوں میں تصورات اور قربانی کے خیالات کو اجاگر

{۲۴} Karl Marx: Das Capital (Moscow : Progess Publishers 1965).

{۲۵} اینجلز کہتا ہے ہر طبقے اور ہر پیشے کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہیں اور جب جس کو ضرورت ہو وہ اسے توڑ ڈالتا ہے۔ جنگیں' خلفشار' خاندانی جھگڑے' طلاق' لوگوں کا لوگوں کے ذریعے استحصال سب اسی کا شاخسانہ ہیں۔

کریں اور اتنی زیادہ محنت سے کریں جتنی کہ کوئی پیغمبر مذہب کے نام پر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھار انہیں مادہ پرستی کے کئی اصولوں کو فراموش تک کر دینا پڑتا ہے۔ اس لئے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ کیا کوئی مادہ پرست یا ملحد اخلاقیات اور انسانیات کی تبلیغ کر سکے گا یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ یہ کام مادہ پرستی کی حدود کے اندر رہ کر کر سکے گا؟

ایپی کیورس (۲۷۰-۳۴۲ ق م) کے فلسفے کے ساتھ جو مباحثہ ملحق ہے وہ یہی ہے کہ مادہ پرستی اور اخلاق پرستی طویل عرصے تک ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ یہ معروف یونانی فلسفی اخلاقیات کی وضاحت کرتے ہوئے ایک مادہ پرست کا روپ دھار لیتا ہے' لیکن اخلاقیات کے بارے میں اس کا ایک خاص رویہ ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مسرت تفریح سے ملتی ہے' لیکن اس کا یہ بھی خیال تھا کہ مسرت دماغی سکون (ATARAXIA) کا نام ہے۔ اس کے شاگردوں نے اس کے فلسفے کو مسرت بخش (Eudaemonistic) قرار دیا۔ آج ہم Epicureanism کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس کا مفہوم ظاہری و صنفی مسرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ آج ہمارے دور میں Epicureanism اور Eudaemonism مادہ پرستانہ تعلیم میں مشابہ الفاظ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ کائنات اور اس کے تمام تر مظاہر فضا میں مادی اشیاء کی میکانکی حرکت کا نام ہیں۔ لیکن ایپی کیورس کی مادہ پرستانہ تعلیمات اور ذہنی سکون یا روحانی اقدار کے درمیان ہم آہنگی نظر نہیں آتی۔ اس الزام میں کوئی وزن نہیں ہے کہ ایپی کیورس کے شاگردوں نے اپنے استاد کی تعلیمات کو بدل ڈالا ہے۔ ان شاگردوں نے تو ان نظریات کو صرف مرتب کیا ہے۔ مادہ پرستی نے آخرکار اخلاق کا انکار کرنا ہی ہوتا ہے۔

اس لئے ہم دو نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہیں۔ اول مذہب کے بغیر اخلاق کا کوئی وجود نہیں ہے' جبکہ مذہب کے بغیر عملی طور پر اخلاقی مظاہر باقی رہ سکتے ہیں۔ تاہم اس عملی اخلاق کی جڑیں بھی کمزور ہوتی ہیں۔

دوم' اخلاقی ضابطے اور نظام کی بنیاد الحاد نہیں ہو سکتا۔ تاہم الحاد اخلاقیات کا انکار

نہیں کرتا۔ کم از کم اس کے نچلے درجے کی حد تک تو نہیں کرتا اور نچلا درجہ سماجی تنظیم ہے۔ اس کے علاوہ ایک معاشرہ تشکیل دیتے وقت اگر الحاد کو عملی ضابطوں میں باقی رکھا جائے تب بھی سماجی اخلاق کے مروجہ اصولوں کو یہ قبول کرلے گا۔ ہمارے اشتراکی ممالک میں میرے ان دعووں کی تصدیق ہوتی ہے۔ خالصتاً منافع پسند' خودغرض' غیراخلاقی اور غیر اصولی دعووں کے آگے الحاد بالکل بے بس نظر آتا ہے اس معذور فلسفے کا کیا کیا جاسکتا ہے؟ عریانیت اور جنسی بے راہ روی کے "نئے اخلاق" کو صرف قوت اور سنسر (Censor) کے ذریعے ہی اشتراکی ممالک میں روکا گیا ہے۔ یعنی مصنوعی طریقے پر کوئی بھی اخلاقی قاعدہ ان اخلاقی ضابطوں کی تائید نہیں کرتا' اور اگر اس کے حق میں کچھ دلائل سنائی بھی دیں تو وہ عدم تسلسل اور عدم ربط کا شکار ہوتے ہیں' کیونکہ آزادانہ اور غیرجانبدارانہ تنقید کی فضا میسر نہیں ہوتی۔

لوگوں کے شعور میں وہ پرانے اخلاقی اصول اور ضابطے اب تک موجود ہیں جو انہیں ورثے میں ملے ہیں یا ریاست نے جن کو باقی رکھا ہوا ہے' کیونکہ ریاست کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج بھی ورثے میں پائی جانے والی اخلاقی کیفیت سرکاری تلقین سے الگ تھلگ چیز کا نام ہے اور اس اشتراکی نظام میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔

اگر ہمیں اس تمام بحث کو مختصر ترین الفاظ میں سمونے کو کہا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اخلاقیات اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ "مذہب" ہے۔

باب چہارم

تہذیب و ثقافت اور تاریخ

❑ آغاز میں انسان پروری :

عقل پرست اور مادہ پرست دونوں گروہ تاریخ کے بارے میں اپنی الگ الگ رائے رکھتے ہیں ان کے بیان کے مطابق دنیا کی ترقی کا نقطہ آغاز "صفر" ہے' جبکہ تاریخ وقتی دباؤ اور ٹیڑھی میڑھی حرکات کے باوجود ایک مستقل سیدھی لکیر کی طرح آگے بڑھ رہی ہے۔ آج کا دور گزرے ہوئے کل کی نسبت بہتر ہوتا ہے اور آج کا دور آنے والے کل کی نسبت کم تر ہوتا ہے۔

مادہ پرست حضرات کے نزدیک "تاریخ انسانی زندگی کی مادی ترقی" کا نام ہے۔ مادہ پرست حضرات تاریخ اشیاء اور تاریخ معاشرہ پر نظر رکھتے ہیں۔ انسان کی ذات کی تاریخ پر نظر نہیں رکھتے۔ یہ انسانی تہذیب کی نہیں' بلکہ انسانی تمدن کی تاریخ ہے۔

انسان اور انسانی ثقافت کا آغاز صفر سے نہیں ہوتا اور نہ یہ ایک سیدھے صعودی خط پر ہی چلتی ہے۔ فطرت کی جکڑبندیوں سے آزادی کے بعد' انسانی معاشرہ ان جانوروں سے بالکل ممتاز ہوگیا جو گلوں کی صورت میں پائے جاتے تھے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ اس

نے کچھ ایسی خصوصیات اور اخلاقی اقدار کا مظاہرہ بھی کیا جن کو دیکھ کر ہم بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ انسان تاریخ کے اندر جب داخل ہوا تو اس کے پاس بیش بہا اخلاقی خزانہ موجود تھا جو اس نے اپنے حیوانی اجداد سے بہرحال حاصل نہیں کیا تھا۔

سائنس نے اس چیز کو پایا بھی ہے اور تسلیم بھی کیا ہے' لیکن کبھی اس چیز کی وضاحت نہیں کی ہے کہ اولین ادوار میں انسانی معاشروں اور حیواناتی یکجائی میں انسان کس طرح اپنے انسانی کردار کے باعث نمایاں تھا۔ مذہبی تصورات کو آغاز ہی میں رد کرتے ہوئے سائنس نے اس عمل کو سمجھنے کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کر دی ہے (1)۔

ازمنہ قدیم کے قبائل (Gentes) کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے جو ما قبل تہذیب کے اجزاء کہے جاسکتے ہیں۔ لوئس مورگن کہتا ہے کہ :

"ان معاشروں اور گروہوں کی سماجی اور اخلاقی حالت یہ تھی۔ ایک قبیلہ ایک سربراہ کا انتخاب کرتا تھا اور اسے اس کے عہدے سے معزول بھی کر دیتا تھا۔ تخت سے معزول سربراہ یا سردار دوبارہ ایک جنگجو بن جاتا تھا اور وہ بھی دوسرے عام انسانوں جیسا ہو جاتا تھا۔ ایک ہی قبیلے کے اندر صنفی تعلقات ممنوع تھے۔ یہ پابندی شعوری تھی اور اس کو کبھی بھی توڑا نہ جاتا تھا"۔

"ایک ہی قبیلے کے لوگوں کے درمیان باہمی تعلق اور حفاظت کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ کبھی کبھار یہ ذاتی قربانی تک پہنچ جاتا تھا۔ جنگجو لوگوں کی بہادری کو تسلیم کیا جاتا اور جنگی قیدیوں کے ساتھ نرمی کا سلوک روا رکھا جاتا

---

(1) Bertrand Russel : The History of Western Philosophy 'Its connection with political and social cicumstances from the earliers times to the present day

(New York : Simon and Schuster 1945).

اور انہیں قتل نہ کیا جاتا۔ ایک قبیلے کے تمام افراد برابر ہوتے' آزاد ہوتے اور بھائی چارے کے تعلقات پر مجبور ہوتے۔ دوسرے افراد کو قبیلے میں شامل کرتے وقت انہیں مذہبی رسومات سے گزارا جاتا۔ مذہبی رسومات رقص اور کھیل کود کی صورت میں ادا کی جاتیں۔ اس دور میں بتوں کا تذکرہ نہیں ملتا۔

سرداروں کی ایک مجلس (Gens Council) ہوتی۔ اس میں تمام سردار اپنے اپنے قبائل کی نمائندگی کرتے۔ لوگوں کے درمیان مفاد عام کے مسائل کے بارے میں مجلس فیصلہ کرتی اس فیصلے کے دوران قبائل کے افراد موجود ہوتے۔ فیصلے اکثریت کی بناء پر کیے جاتے {۲}۔

ان تمام تفصیلات سے واقفیت فراہم کرنے کے بعد اینجلز لکھتا ہے :

"اس سب کے علاوہ ایک عجیب و غریب دستور یہ بھی تھا اور اپنی سادہ ترین شکل کے باوجود یہ دستور جاری تھا کہ وہاں نہ فوجی تھے' نہ محافظ تھے' نہ پولیس تھی' نہ نواب ہی تھے' نہ بادشاہ تھے' نہ بادشاہوں کے نمائندے تھے اور نہ وکیل تھے' نہ جج تھے' نہ جیلیں تھیں نہ عدالتی مقدمات ہی تھے۔ ہر چیز متوازن انداز میں چل رہی تھی۔ تمام جھگڑے اور تنازعے معاشرے پر اثرانداز ہونے والے یعنی قبائل کے سرداروں کے ذریعے حل کیے جاتے یا باہمی طور پر خود ہی حل کر لئے جاتے۔ وہاں کوئی غریب نہ تھا' نہ ضرورت مند ہی تھا۔ قبائل کے کرتا دھرتا بوڑھوں' بیماروں اور جنگ میں معذور ہو جانے والوں کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں سے بخیر و خوبی آگاہ ہوتے۔ تمام کے تمام لوگ برابر تھے۔ آزاد تھے۔ عورتیں بھی برابر اور آزاد تھیں۔ اس زمانے میں غلاموں کا کوئی رواج نہ تھا اور بطور اصول نہ ہی دوسرے قبائل کو مطیع

{۲} Lewis H. Morgan. Ancient Society. (Chicago: C.H. Kerr 1907).

بنایا جاسکتا تھا۔ ایسا معاشرہ کیسے فرد اور کیسی عورتیں پیدا کرتا ہے اس کا ثبوت اس تعریف سے کیا جاسکتا ہے جو سفید نسل کے لوگ ان انڈ ینزکی کرتے ہیں' جن سے ان کا رابطہ رہا ہے۔ ان میں وقار' حق پرستی' مضبوطی کردار' حوصلہ اور (ان میں وحشیوں کے) دیگر اعلیٰ خصائص موجود رہے ہیں"۔ {۳}

مورگن نے جن تفصیلات کو بیان کیا ہے' انہیں اس کے ہم عصر مصور جے۔ فین مور کوپر نے واضح اور متاثر کن تصاویر کے ذریعے واضح کیا ہے۔ {۴} اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ رالف والڈو ایمرسن کے ذہن میں امریکی ریڈ انڈ ینز تھے" جب اس نے لکھا "میں نے انسانی فطرت کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت دیکھا ہے۔ {۵} یہ ہر جگہ ایک جیسی ہی ہے۔ تاہم فطرت جہاں زیادہ عیاں ہو' وہاں پر نیکوکاری بھی زیادہ محسوس ہوتی ہے"۔

ٹالسٹائی کے نزدیک اس معاشرتی زندگی کا تصور ایسا تھا جیساکہ وہ ابتدائی روسی دہقانوں کی خرابیوں سے پاک معاشرت میں دیکھ چکا تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ نہ صرف ہمارے علاقے میں ہی بلکہ ہر دوسری جگہ بھی اخلاقی اور انسانی اقدار کمزور ہو چکی ہیں

"تاریخ افریقہ" میں ابتدائی دور کے افریقی لوگوں کی ثقافت کے بارے میں ہمیں متاثر کن حقائق کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ بات مشہور ہے کہ پرانی افریقی بادشاہتوں میں تمام کے تمام غیر ملکی چاہے ان کا تعلق سفید نسل سے ہوتا یا رنگ دار

{۳} Friedrich Engels: The Origin of the family' Private Property and the State (New York: International Publishers 1972).

{۴} James Fenimore Cooper: The complete works of James Fenimore Cooper (New York' G.P. Putnam's sons 1893).

{۵} Ralph Waldo Emerson : The Conduct of Life Nature and other Essays (London J.M. Dent & Co. 1908).

نسل سے' ان کی مہمان نوازی کی جاتی اور ان کو بھی مقامی لوگوں کے برابر حقوق حاصل ہوتے۔ اس کے برعکس قدیم روم یا یونان میں غیر ملکی عموماً غلام بن جاتا۔ اسی بنیاد پر افریقہ کا ماہر نسلیات لیوفوربنی لنس لکھتا ہے :

"افریقی ہڈیوں کے گودے کی گہرائی تک مہذب ہیں اور یہ خیال کہ افریقی وحشی ہیں اہل یورپ کی گھڑی ہوئی داستان ہے"{٦}۔

امریکی ریڈ انڈینز میں بھی اسی قسم کے عادات و اطوار اور اصول پائے جاتے تھے۔ افریقہ کے مقامی قبائل یا اولین روسی دہقانوں اور ہندوستان کے سماج کے نچلے طبقے تک میں ان کا وجود ملتا ہے۔ ان سب کی بنیاد کیا ہے؟ آخر یہ تاریخ کے آغاز میں کیوں ظاہر ہوتے ہیں اور تاریخی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان میں کمی کیوں واقع ہوتی چلی گئی ہے۔ ارکو لنس کا نظریہ ہے کہ بوڑھوں اور استعمال میں نہ آنے والوں کو محفوظ رکھا جائے' یہ خیال آخر کہاں سے آیا ہے؟ کیا اس کی بنیاد حیوانی ہے؟ جانوروں کی مختلف انواع میں اپنے ہم جولیوں کی "نگہداشت" کا جو تصور پایا جاتا ہے اس کی اصل کیا ہے ؟ وہاں تو انسانیت کا دخل نہیں ہے مورگن اپنی معروف کتاب کا خاتمہ ان الفاظ پر کرتا ہے :

"حکومت میں جمہوریت' معاشرت میں بھائی چارہ' برابری اور عمومی تعلیم کے سبب معاشرے میں اعلیٰ درجے کے خصائص پیدا ہوجائیں گے ایسے خصائص جن کو تجربے' ذہن اور سائنس نے ہمیشہ خوش آمدید کہا ہے۔ یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی ہے۔ یہ انقلابی صورت حال بہت اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ یہ آزادی بھائی چارے اور پرانے قبائل کی برابری کی صورت ہوگی"{٧}۔

{٦} Leo Frobenius The Childhood of Man Trans. A.H. Keane (New York : Maridian books 1960).

{٧} Morgan. Ancient Society.

"ان لوگوں کو ایسے طریقے پر ختم کیا گیا کہ کہیں بھی ایسے مظالم کی مثال نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی کے پہلے نصف میں حکومت امریکہ نے ہر ریڈ انڈین کی لاش اور ڈھانچے کے بدلے میں رقم فراہم کی۔ ان سو سالوں کے درمیان بحر اوقیانوس کے تجارتی راستے سے کالے غلاموں کی تجارت بھی جاری رہی اور اس میں یورپی امریکی ثقافت کا ارتقاء جزو لازم کے طور پر جاری رہا اور اس کا خاتمہ ۱۸۶۵ء سے قبل نہ ہو سکا۔ اس عرصے میں ایک کروڑ تیس لاکھ سے ایک کروڑ پچاس لاکھ کے درمیان آزاد لوگ (بالکل صحیح تعداد تو کبھی بھی معلوم نہ ہو سکے گی) حقیقی الفاظ میں شکار کر کے غلام بنا لئے گئے۔ یہاں دوبارہ تمدنی جارحیت نے آزاد اور سادہ ابتدائی انسان کو شکار کر لیا۔

اس سلسلے میں جدید استعماریت کو بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔اس سے مراد یورپ کی تہذیب اور برائے نام غیر ترقی یافتہ' غیر مہذب یا کم ترقی یافتہ لوگوں کا ٹکراؤ تھا' لیکن ہر جگہ یہ ٹکراؤ تشدد' دھوکہ دہی' منافقت' غلام بنانے اور مادی 'ثقافتی اور اخلاقی اقدار کر کمزور کرنے کی صورت میں نکلا۔

قرون وسطیٰ کے بارے میں ہماری جو رائے ہے اس کے پس پشت بھی یہی جذبہ ہے۔ کیا قرون وسطیٰ حقیقتاً تاریکی اور عدم مسرت کی صدیاں تھیں؟ یہ ایک نقطہ نظر بھی ہے اور سوال بھی۔ تہذیبی معیار کے مطابق بہرحال یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔

ہیلو ٹیس جو یورپ کے اولین مادہ پرستانہ فلسفیوں میں ایک ہے کہتا ہے:

قرون وسطیٰ ایک ایسا دور تھا جس میں لوگ جانوروں میں تبدیل ہو گئے تھے' اور یہ وقت تھا جب کہ لوگ "بیہودگی کا عظیم الشان نمونہ" تھے{۸}۔

{۸} Claude Adrien : Helvetius De l' homme.

مورگن کے مطابق' آزادی' بھائی چارہ اور مساوات آئندہ کے مہذب معاشروں میں تین قوتوں کے سبب ممکن ہوں گے۔ تجربہ' ذہن اور سائنس۔ اس موقعہ پر دو باتیں یقینی ہیں۔

* (الف) آزادی' برابری اور اولین طبقوں کا بھائی چارہ' تجربے' ذہن اور سائنس کے نتیجے کے طور پر نہیں تھا۔

* (ب) تجربے' دماغ اور سائنس کے بارے میں مورگن نے جو باتیں کی ہیں وہ اس کی کتاب کے شائع ہونے (۱۸۷۷ء) سے لے کر اب تک ثابت نہیں ہوئی ہیں۔

تاریخ مہذب لوگ مرتب کر رہے ہیں "وحشی" مرتب نہیں کر رہے ہیں' لیکن اس کے باوجود ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ وحشت و تہذیب کے درمیان وسیع و عریض تفاوت و تعصب موجود ہے اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ سماجی اور تکنیکی ترقی دو بالکل متضاد عناصر ہیں' بلکہ اچھائی اور برائی کے نمونے بھی ہیں۔ اگر کوئی شخص ثقافت کو تباہ و برباد کرکے رکھ دے یا کسی نسل کے قتل عام کا مرتکب ہو تو اسے ہم وحشیانہ فعل کہہ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم رواداری اور انسان پروری کا مطالبہ کریں تو ہم دوسرے گروہ سے بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ "مہذب رویہ اختیار کرے"۔ اگرچہ ان تعصبات کی بارہا نفی کی گئی ہے' لیکن اس کے باوجود یہ موجود ہیں۔

براعظم امریکہ کی تاریخ دیکھنے سے بالکل متضاد نتائج مرتب کرنا ہوں گے۔ کیا تہذیب یافتہ اہل ہسپانیہ (Spaniards) کو انتہائی گھٹیا اور ظالمانہ طریقے سے ختم نہ کیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ مشرقی امریکہ کے سرخ باشندوں (AZTECS) اور اہل میکسیکو کے اجداد (Mayans) کو تہہ تیغ نہ کیا گیا' بلکہ اس علاقے کے اصل باشندوں کو بھی ملیامیٹ کردیا گیا۔ کیا سفید نسل کے آباد کاروں (کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مہذب ممالک کے لوگ تھے) نے اصل ریڈ انڈین قبائل کو تباہ و برباد نہ کردیا؟ اور انہی کے متعلق مورگن نے لکھا ہے :

یہ بات تو رہی جاتی ہے کہ نکولائی بردگیو جو ایک مسیحی فلسفی ہے اور جین آرپ جو ایک مصور ہے اس دور کے متعلق بالکل مختلف آراء رکھتے ہیں۔ قرون وسطیٰ کے بارے میں ہم عام طور پر ایک سادہ اور یک طرفہ تصور اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ اگرچہ غربت' سہولتوں کا فقدان اور حفظان صحت کی کمی ہر جگہ تھی' تاہم قرون وسطیٰ کے معاشرے اندرونی طور پر کامل یکجہتی کا مظہر تھے۔ وہ دور مکمل طور پر روحانی زندگی کا مظہر تھا اس کے بغیر ہم مغربی تہذیب یافتہ انسان کو سمجھ نہیں سکتے۔ قرون وسطیٰ کے لوگوں نے آرٹ کے عظیم الشان نمونے تیار کیے جو ایک شاندار فلسفے کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھے اور یہ فلسفہ یونانی تھا اور اس کے اندر ایک عظیم روح تھی۔ یہ روح عیسائیت تھی۔ گو تھک طرز کو "انسانی تخلیقات کے سب سے اہم طرزوں میں سے ایک طرز" قرار{۹} دیا جاتا ہے۔ اور یہ قرون وسطیٰ کے دور کی پیداوار ہے۔ یہ دور جس میں سائنسی اور تکنیکی ترقی نہیں ہوئی تھی اس نے ایک ایسی چیز پیدا کی جس کو الفریڈ نارتھ وائٹ ہیڈ نے "معیار کی ترقی" قرار دیا۔ اگر مغربی معاشرے میں کوئی چیز فاؤسٹ نما ہے تو اس کی تخلیق صراحتًا قرون وسطیٰ کے عظیم روحانی اور سیاسی تنازعوں کے دوران ہی میں ہوئی۔ قرون وسطیٰ کے بغیر جدید دور کبھی وجود میں نہ آتا' کم از کم اس شکل میں جس میں ہم آج دیکھ رہے ہیں۔{۱۰}

{۹} Kenneth Clark: Civilization A Personal view (New York: Harper & Row 1970).

{۱۰} Whitehead: The Future of Religion.

سائنس' آرٹ اور تاریخ

آرٹ قدیم چیز ہے۔ سائنس جدید چیز ہے۔ آرٹ ماضی کی طرف دیکھتا ہے' سائنس مستقبل کی طرف نگاہیں لگائے رکھتی ہے اور تاریخ ہر دور کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ جیکور رائزلر کہتا ہے کہ جیسے ہی یہ دریافت ہوا کہ مصری سنگ تراشوں کے تراشے ہوئے مجسمے اور نمونے چار ہزار سے پانچ ہزار سال پرانے ہیں' ان کو غیر معمولی قدروقیمت کا حامل سمجھا گیا۔ دور جدید کے بہت سے آرٹسٹ اور فنکار اس نقاشی اور پچی کاری سے تروتازگی اور نئے خیالات اخذ کرتے ہیں جو مقبروں کی دیواروں پر سنگ مرمر' سونے اور سنگ جراحت کے سر تھ کندہ ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ آرٹ ططموس دوم اور ططموس سوم کے زمانے میں اعلیٰ نوعیت کا رہا ہے لیکن شیوپ کے زمانے میں اس نے مجسماتی شکل اختیار کرلی اور اخناطون کے زمانے میں اس نے علامتی شکل اختیار کی۔

تہذیبی طور پر امریکہ پرانی دنیا سے پانچ سے چھ ہزار سال پیچھے تھا۔ امریکہ جب دریافت ہوا تو وہ "دور آہن" تک بھی نہ پہنچا تھا۔(۱) تاہم یہی بات امریکی فنون لطیفہ پر لاگو نہیں ہوتی۔ بونامپاک کے مندر میں جہاں امریکی براعظم کی قدیم ترین منقش تصاویر

ملی ہیں۔ ان میں ہمیں غیر معمولی حسن اور قدر و قیمت کی حامل تصاویر ملتی ہیں۔

مشرقی امریکہ کے سرخ باشندوں کے تیار کردہ مجسموں اور نمونوں کی نمائش ۱۹۶۹ء میں پیرس میں ہوئی اور وہاں ثقافت کی برتری ثابت ہوئی' کیونکہ اس ثقافت کو "تمدن" بننے کا موقع نہ ملا تھا۔

نٹشے کے نزدیک "المیہ" کو یونانی ڈرامے کی امتیازی پیشکش اور آرٹ میں اعلیٰ ترین کامیابی شمار کیا جاتا ہے اور انسانی تہذیب کی اعلیٰ ترین شکل کو یونانی ثقافت کے ذریعے سے ہی سمجھا جاسکتا ہے{۲}۔ انسانی تہذیب کے طلوع کے ساتھ آرٹ اپنی بلندیوں تک پہنچ گیا۔ ہیگل کے نزدیک' قدیم یونان "فلسفے کا سنہری دور" تھا{۳}۔ راجر کیلوس لکھتا ہے :

> "جہاں تک فلسفے کا تعلق ہے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ افلاطون کے بعد اس فلسفے نے کوئی ترقی نہیں کی۔ وجہ یہ محسوس ہوتی ہے کہ فن جاری نہیں رہتا' بلکہ ہمیشہ نیا تخلیق ہوتا ہے۔ {۴} سسرو کی اخلاقی تحریریں زندہ ہیں' جبکہ تمدن وغیرہ کے متعلق اس کی تحریریں فراموش کی جاچکی ہیں۔ ایک غیر معروف رومی ادیب کی

{۱} H.G.Wells : Short History of the World (New York : Pelican books 1946).

{۲} Friedrich Wilhem Nietzsche The birth of tradgedy from the spirit of Music and the Geneaology of Morals: Garden City NY : Doubleday 1956).

{۳} George W.F. Hegel: Lectures on the History of Philisophy. Trans. E.D. Haldane (N.Y : Humanities Press 1963).

تخلیق {۵} De Rebus bellicis کے اندر ہتھیاروں کی کچھ دلچسپ تصاویر ہیں۔ ان کی ایک تاریخی اہمیت ہو سکتی ہے' لیکن 'ورجل' (Virgil) کے اشعار اور سینیکا کے "مسرت" پر مضمون کو دوام حاصل ہے۔ آلۂ موسیقی (Harp) کا سراغ تین ہزار قبل مسیح تک ملتا ہے۔ جاپانی نظموں کا مجموعہ Maynoshu جو ساتویں اور آٹھویں صدی میں مرتب کیا گیا اور اس میں ایک ہزار نظمیں ہیں اس کو آج تک عالمی شاعری کے شاہکاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ {۶} دسویں صدی میں فنون لطیفہ اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے اس دور میں جو نمونے تیار ہوئے ان سے آگے بڑھنا بہت مشکل ہے۔ سوفوکلیز اور ایسکی لس نے جو المیہ ڈرامے لکھے ہیں ان کو کسی بھی دور پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔ صرف ان ڈراموں کے کرداروں کے لباس کو تبدیل کرنا ہو گا۔ یوریپیڈیز نے The Trojan Women کا کردار تخلیق کیا' سارتر نے بھی اسی نوعیت کا ڈرامہ لکھا۔ یہ آرٹ ہی میں ممکن ہے کہ دو مختلف ادیب بیس صدیوں' کے فاصلے کے باوجود ایک جیسی چیز تخلیق کر سکتے ہیں۔ {۷} سائنس میں تو یہ ممکن

{۴} Roger Caillois and Gustave Edmond von Grunebaum The Dream and Human Society (Berkeley : Univ. of California Press 1966).

{۵} Marcus Tullius Cicero: De Finibus bonorum et Malorum trans H. Rackham (London: w. Heinemann 1944).

{۶} The Maynoshu: The Nippon Gakujustu Shinkakai (London : Columbia University Press 1965).

{۷} The trojan Women adapted by jean Paul Sartre tran . Ronald duncan (New York : Knopf 1967.)

نہیں ہے۔ ارسطو کی فزکس' بطلیموس کی فلکیات اور گیلن کی طب میں سے اب کیا باقی رہ گیا ہے؟ سائنس کے میدان میں ارسطو کی دو کتابوں Physics اور "On Heaven" کے بارے میں برٹرینڈرسل لکھتا ہے کہ "جدید سائنس کی روشنی میں جو کچھ بھی ان کتابوں میں لکھا گیا ہے ان میں سے ایک فقرہ بھی اب قابل عمل نہیں ہے"{۸}۔

اپنی کتاب میں ارسطو لکھتا ہے کہ :

"وہ اشیاء جو چاند کے نیچے ہیں وہ تو وجود میں آنے اور گلنے سڑنے کی اہل ہیں' لیکن ہر وہ چیز جو چاند کے اوپر ہے اس کو نقصان نہیں پہنچ سکتا یا مثال کے طور پر ارسطو نے کشش ثقل کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ ہر چیز کا ایک اصل مقام ہوتا ہے۔ اور ایک "مستعار مقام" ہوتا ہے جب ایک پتھر گرتا ہے تو وہ اپنے "اصل مقام" تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوتا ہے اور یہ زمین کی سطح ہے۔ {۹}اس نظریے کا نیوٹن کے نظریے کے ساتھ کس طرح تقابل کیا جاسکتا ہے"۔

آرٹ غیر ترقی یافتہ علاقے سے دنیا کے ترقی یافتہ علاقے کی طرف سفر کرتا ہے۔ یہ مشرق سے مغرب کی طرف اور جنوب سے شمال کی طرف چلتا ہے۔ سائنس متضاد راستہ اختیار کرتی ہے۔ اشیاء زیادہ بار والی سمت سے کم بار والی سمت میں حرکت کرتی ہیں۔

{۸} A History of Western Philosophy and its connection with political and Social Circumstances from earliest times to the Present Day (New York: Simon and Schoster 1945).

{۹} Aristotle : On the Heavens Trans. W.K.C. Guthrie (London : W.Heinemann.)

مشرقی موسیقی' افریقی رقص و سرود اور اوقیانوس کے علاقے کا فن مغرب کی طرف سفر کرتا ہے{۱۰}۔

مغربی تمدن اس اصل فن کے آگے بے بس نظر آتا ہے۔ افریقہ کے آرٹ کی دریافت نے جدید یورپی اور امریکی آرٹ کی ترقی پر شدید اثرات مرتب کیے ہیں اور افریقی آرٹ نے مغرب میں انقلابی تحریک برپا کردی ہے۔ افریقی آرٹ کی بین الاقوامی نمائش ڈاکار میں ۱۹۶۶ء میں ہوئی اور انتالیس ممالک کے مختلف گروہوں کا یہاں اجلاس ہوا۔ اس موقع پر افریقی ممالک کے بارے میں ایک صنعتی اور تجارتی میلہ منعقد ہوا' لیکن اس کو زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کے نقطۂ نظر سے افریقہ غیر ترقی یافتہ ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ افریقہ آرٹ میں بھی پیچھے اور غیر ترقی یافتہ ہے' کیونکہ آرٹ میں کوئی چیز "ترقی یافتہ" یا "غیر ترقی یافتہ" نہیں ہوتی۔ لوک موسیقی' فن اور رقص کے میدان میں سیاہ افریقہ حقیقتاً ایک اعلیٰ ترین قوت (Super Power) ہے۔

اریان --- جایا کے جنگلات زمانہ قبل از تاریخ کی ثقافت کے فطری عجائب گھروں کا محفوظ مقام ہیں۔ تمدن یہاں پتھر کے دور سے آگے نہ بڑھ سکا' لیکن ثقافت کا کیا بنا؟ اس سوال کا جواب ایک مبلغ نے فراہم کیا جس نے بیس سال افریقہ میں گزارے۔ وہ کہتا ہے : "ان (کم مہذب) لوگوں میں حسن کے بارے میں جذبات بہت ترقی یافتہ ہیں اور ان کی فنی تخلیقات اعلیٰ درجے کی ہیں"۔ اس موضوع پر کچھ کتابیں موجود ہیں' لیکن خیالات و اشکال کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں تمام باتوں کا احاطہ نہیں کرتیں۔ ان میں لکڑی اور پتھر کے مجسمے ہاتھ سے بنائی گئی تصاویر' کھدی ہوئی تصاویر اور نقشے اور غیر معمولی حسن کے حامل ڈھانچے وغیرہ شامل ہیں۔ یاد رہے سائنس دانوں کا تعلق صرف

{۱۰} مکوندے قبائل کے لوگ قدیم آلات کا اعلیٰ علم رکھتے ہیں۔

اپنے زمانے سے ہوتا ہے جبکہ شاعروں کا تعلق ہر زمانے سے ہوتا ہے۔

□ اخلاقیات اور تاریخ :

ثقافت کا موضوع یہ ہے کہ ہم زندہ کیوں رہتے ہیں۔ تہذیب اس مسلسل ترقی کا نام ہے کہ زندہ کیسے رہتے ہیں۔ ثقافت کا تعلق زندگی کے معنی سے ہے' تمدن کا تعلق اس کے راستے سے ہے۔ تمدن کو ہمیشہ اوپر کی طرف بڑھتی ہوئی لائن کے ذریعے دیکھا جاسکتا ہے جس کا آغاز آگ کی دریافت سے لے کر پن چکی' لوہے' تحریر' انجن اور ایٹمی توانائی کی دریافت اور خلا میں سفر سے کیا جاسکتا ہے۔ ثقافت ہمیشہ پیچھے کی طرف جاتی ہے تاکہ نئے سفر کا آغاز کرسکے۔ انسان ثقافت کے تابع ہی نہیں اپنی غلطیوں' خامیوں' خوبیوں اور نیکیوں کے ساتھ اس کے تابع ہے۔

آج کی دنیا کو جو مسائل اور سوالات درپیش ہیں دو ہزار سال قبل بھی یہی سوالات معروف تھے۔ انسانوں کے تمام معلمین اخلاق چاہے پیغمبر ہوں۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام' مسیح علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' یا غیر نبی مثلاً کنفیوشس' گوتم بدھ' سقراط' کانٹ' ٹالسٹائی' مارٹن' ببر وغیرہ ایسے ادوار کا احاطہ کرتے ہیں جو کہ ۶۰۰ قبل مسیح سے آج تک کا زمانہ ہے (مارٹن' ببر کا انتقال ۱۹۶۵ء میں ہوا) اور ان سب کے سب نے ایک جیسے اخلاقی اصولوں کی تبلیغ کی۔ سماجی نظام کے اصولوں سے لے کر پیداوار کے طریقے اور اخلاقی سچائیاں وغیرہ ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ {۱۱} اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کی پہلی تخلیق کے وقت ہی اس سے وابستہ ہوگئے تھے اور تمام کائنات کو تخلیق کے

{11} John Kenneth Galbraith : The New Industrial State

(Boston : Haoghton Miffin 1967)

مرحلے سے گزرنا پڑا تھا۔ ذہانت' تعلیم اور تجربہ ہر معاملے میں ہمارا مددگار نہیں ہوتا کہ اس کے ذریعے سب کچھ سمجھا جاسکے۔ مسیح علیہ السلام نے اپنی سچائی کا اعلان کیا جبکہ وہ ابھی بچے تھے اور ان کی عمر تیس سال سے کچھ زیادہ ہی ہوئی تھی کہ آپ کو ناپسندیدہ قرار دے دیا گیا۔ خدا کے بارے میں حقیقت اور سچائی سمجھانے کے لئے ان کو نہ علم کی ضرورت تھی' نہ تجربے کی ضرورت تھی' کیونکہ یہ چیزیں سمجھانے کے لئے علم اور تجربے کی سہارا نہیں لیا جاسکتا۔ کیا وہ "دانا لوگوں سے چھپا ہوا اور نادانوں پر عیاں" نہیں ہے۔

مصدقہ اخلاقی اصول وقت' مقام اور سماجی حالات سے تبدیل نہیں ہوتے۔ اخلاقی اصولوں میں تاریخی' سیاسی اور سماجی فرق کے باوجود ہمیں یکسانیت ہی نظر آتی ہے۔ {۱۲} ایپک ٹیٹس اور مارکوس آریلیئس میں سے ایک غلام ہے اور ایک بادشاہ ہے۔ دونوں ایک ہی قسم کی اخلاقیات کی تبلیغ کرتے رہے اور کم و بیش ایک ہی قسم کے الفاظ {۱۳} میں۔ اس اصول {۱۴} کی تصدیق کانٹ کے بیان کردہ اصول سے بھی ہوسکتی ہے۔

{۱۲} Leo Tolstoy "Thoughts on God" The complete works of Count Tolstoy trans. Leo Wiener vol. 16, (New York : AMS Press 1968).

{۱۳} Marcus Antonius Aurelius trans A.S.L. Farquharson (London. Dent 1967) and Titus Lucretius Carus. The Discoveries of Epictetus trans. George Long (Chicago : Encyclopedia Britannica 1955).

{۱۴} ان مشترک اصولوں میں چند ایک یہ ہیں :

سچ بولو' نفرت ترک کردو' سادہ اور صاف زندگی بسر کرو' دوسرے لوگوں کو اپنے برابر سمجھو' آزاد زندگی پسند کرو اپنے حقوق کی حفاظت کرو اور دوسرے لوگوں کے حقوق کی حفاظت اپنے حقوق کی طرح کرو۔ اپنا رزق خود کماؤ۔ دوسرے لوگوں کے پیشوں کا احترام کرو۔ بقیہ حاشیہ آگے ہے

نیز اسی اصول کے آثار پرانے مفکرین کے ہاں بھی مل جاتے ہیں۔یہ اصول کانٹ نے اپنی کتاب "اخلاقی اصولوں کی مابعد الطبیعیات کی بنیادیں" میں بیان کیا تھا۔ وہ کہتا ہے : اس انداز میں کام کریں کہ وہ ایک عمومی اصول کی صورت اختیار کر لے۔ بعد ازاں اپنی کتاب "عقل خالص پر تنقید" میں وہ کہتا ہے : "اس طریقے کو اختیار کریں کہ آپ کا ارادہ اور اصول کسی بھی وقت ایک قانونی اصول بن سکے"۔{۱۵}

قدیم یونان کے سات داناؤں میں سے ایک تھیلز ہے جس کی وفات ۴۲۴ قبل مسیح میں ہوئی۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ ایک سچی زندگی کس طرح گزاری جائے اس نے کہا : "ہم ایسے کام کریں جن کی وجہ سے ہم دوسروں کو تنقید کا نشانہ نہ بناتے ہوں"۔ انہی سات داناؤں میں سے ایک پٹاکس آف مٹیلین بھی ہے اس نے یہی اصول اس طرح بیان کیا ہے "جن چیزوں پر دوسروں کو تضحیک کا نشانہ بناتے ہو ان چیزوں کو خود مت کرو"۔ {۱۶} رومائے قدیم کا مفکر سسرو کہتا ہے : "ہر وہ چیز جو تمہیں دوسروں میں ناپسند

والدین اور بڑے لوگوں کا ادب کرو۔ اپنے وعدے اور ذمہ داریاں پوری کرو۔ غرباء اور کمزور لوگوں کو تحفظ دو۔ لوگوں سے دوستانہ رویہ رکھو۔ دوسروں کے دکھ اور ناکامی پر خوش مت ہو جاؤ۔ دوسرے لوگوں کی مسرت اور کامیابی پر شک نہ کرو۔ دوسرے لوگوں سے فخر اور تکبر کے ساتھ مت چلو۔ تکلیف کے عالم میں صبر کا مظاہرہ کرو۔ اہل اقتدار کی خوشامد مت کرو۔ غریبوں کو مت دباؤ۔ رنگ و نسل اور روپ، جائیداد مرتبے کی بناء پر کسی قوم اور فرد کا احترام نہ کرو۔ اپنی رائے خود قائم کرو، خوشی کے عالم میں معتدل رہو۔ خود غرض مت بنو۔

ظاہر ہے معاشی ضروریات کے تحت یہ اصول تبدیل نہیں ہو سکتے۔

{۱۵} Immanuel Kant: Foundations of the Metaphysics of Morals (Indianapolis Bobbs- Merril 1969).

{۱۶} یہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ کریں

ہے اور جس پر تم تنقید کرتے ہو وہ خود بھی نہ کرو"۔ {۱۷}یہودی مفکر ہلل جو فلسطین میں اسی زمانے میں قیام پذیر تھا جب حضرت مسیح علیہ السلام وہاں موجود تھے' اس سے کسی مشرک نے سوال کیا کہ مذہب کا خلاصہ بیان کرو اور اس نے کہا : "جو تم چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ نہ ہو' وہی کام اپنے ہمسائے کے ساتھ نہ کرو" پوری تورات صرف یہی بیان کرتی ہے اس کے علاوہ ہر چیز اس کی تشریح ہے"{۱۸}۔

چین میں کنفیوشس نے یہی تعلیمات پھیلائیں' کنفیوشس گوتم بدھ اور فیثاغورث کا ہم عصر تھا کہتا ہے :

"جو کام مجھے اپنے لئے پسند نہیں ہے میں وہ دوسروں کے لئے بھی پسند نہیں کرتا"۔ {۱۹}یہی اصول حضرت مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان کیا"۔ لوگوں کے ساتھ اس طریقے سے رہو جس طریقے سے تم چاہتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ رہیں۔ {۲۰}یہ مختصر تاریخ بیان کرتی ہے کہ اخلاقی اصول

{۱۶} Diogenes Laertius: Lives of Eminent Philosophers trans. R.D. Hicks (London W. Heinemann 1959).

{۱۷} Cicero: De Finibus bonorum et Malorum.

{۱۸} نوٹ : فن کے ارتقاء کا یہ نظریہ خاص مصنف ہی کے نقطہ نظر کا اظہار ہے' ورنہ عملی زندگی میں یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ ایک فن کار آغاز میں جو کچھ ہوتا ہے عروج کے زمانے میں اس سے بہت مختلف بن جاتا ہے۔ تہذیب کی ترقی اس عمل ارتقاء کا ثبوت ہے۔ (ادارہ)۔

{۱۹} Andreas Franzke: Dubuffet. Trans. Robert E. Wolf (New York: Abrams 1981).

{۲۰} Lev Nikolaevich : Tolstoy Petrov.

زمانہ تاریخ سے ماوراء ہیں۔ ان کی شکلوں میں بہرحال تبدیلی ہوتی ہے' لیکن ان کی روح ایک ہی رہی ہے۔

❑ فنکار اور تجربہ :

فن کی زندگی میں ارتقاء نہیں ہوتا نہ ہی فنکار کی زندگی میں کوئی ارتقاء واقع ہوتا ہے۔ ہر فنکار تازہ دم ہوکر آغاز کرتا ہے گویا کہ اس سے پہلے کسی اور شخص نے کوئی اور چیز تخلیق ہی نہ کی ہو۔ وہ اپنے علاوہ کسی کے تجربات کو استعمال نہیں کرتا۔ دوسرے لوگوں کے تجربات اور تجربات کے نتائج کو اکٹھا کرنا اور آگے بڑھنا یہ طریقہ سائنس کا ہے' فن کا نہیں۔ دوسرے لوگوں کے تجربات اگر فن میں استعمال ہوں تو یہ نقالی یا مختصر الفاظ میں فن کی موت کہلائے گی۔

پکاسو ستر سال تک تصاویر بناتا رہا اور اس نے مختصر طرزوں' درجوں اور شکلوں کی تصاویر تیار کیں' تاہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہاں کوئی ارتقاء ہوا تھا یا خوب سے خوب تر کی کوئی چیز حاصل ہوئی تھی یا نامکمل سے مکمل تک سفر طے ہوا تھا۔ ثقافت کی طرح فن بھی ایک مشکل تلاش کا نام ہے۔ فن کے غیر تاریخی کردار کے دل چسپ حقائق کو ہم انسانی کردار کی روشنی میں زیر بحث لاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک سائنس بڑی عمر کے لوگوں کے لئے اور ایک سائنس بچوں کے لئے ہے۔ سائنس کو کس طرح تیار کیا جائے اور اس کا کس طرح استعمال کیا جائے اس کا تعلق تعلیم' عمر اور تجربے کے ساتھ ہے' لیکن جب موسیقی کی بات آتی ہے تو بڑے اور بچوں کے لئے الگ الگ موسیقی کا وجود نہیں ہے۔ باخ' موزارٹ' بیتھوون' ڈی بسی اور شوپن نے تجربات سے ثابت کیا کہ بچے بڑوں ہی کی طرح موسیقی کو سمجھ لیتے ہیں۔ پکاسو نے اپنی سب سے پہلی تصویر دو سال کی عمر میں بنائی' جبکہ وہ ابھی چل بھی نہ سکتا تھا۔ اووڈ نے ریاضی کی اصطلاحوں میں گفتگو

کرنا شروع کردی تھی جبکہ اس کے ہم عمر بچے حروف ابجد سیکھ رہے تھے۔ موزارٹ نے اپنے فن کے مظاہرے چھ سال کی عمر میں کرنا شروع کردیئے تھے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ فن علم کا نام نہیں ہے۔ یہ سمجھ' دل' دماغ اور روح کی سادگی کا نام ہے۔ "بہت سے ایسے دہقان ہیں جو روزمرہ کی مشقت سے فارغ ہوکر لکڑی یا مٹی سے کوئی چیز بنانا اور گودنا شروع کردیتے ہیں" اور اس کام کے لئے انہیں دس سالہ تعلیمی تربیت کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فن تک ہر شخص کی رسائی ہوتی ہے اور اس کے لئے کسی خاص تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس سے ہمیں ٹالسٹائی اور یاسناپا پولیانا میں اس کے سکول کی یاد آتی ہے جہاں وہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ انتہائی اہم مذہبی اور اخلاقی سوالات کیا کرتا تھا۔ فن' مذہب' اور اخلاق ذہانت اور منطق سے سمجھ میں نہیں آتے' بلکہ خالص روحانی اہلیت کی وجہ سے سمجھ میں آتے ہیں۔ یہاں ایک دلیل دوسری دلیل کے مقابل نہیں ہوتی' ایک دل اور روح دوسرے دل اور روح کے مقابل ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات اپنے انجام کو پہنچی کہ ثقافت کی ترقی نہیں ہوتی اور انسانی تاریخ میں انسان کی حیثیت ایک "مستقل وجود" کی ہے۔ انسان کائنات اور زندگی کا جزولاینفک ہے۔

باب پنجم

ڈرامہ اور خیالی ریاست

❑ مثالی معاشرہ :

آیا برائی کا مأخذ انسان کے اندر' اس کی روح کی گہرائیوں میں ہے یا اس کا مأخذ حالات ہیں؟ اس سوال کی بدولت تمام لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں۔ اہل ایمان اور مادہ پرست' اہل ایمان کے نزدیک تمام اچھائی اور برائی انسان کے اندر ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو برائی کا مأخذ باہر خیال کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ انسان بد ہے کیونکہ جن حالات اور ماحول میں وہ رہ رہا ہے وہ بھی تو بد ہیں جو تبدیلیاں اس کے ماحول میں آئیں گی وہی تبدیلیاں اس کی ذات میں آئیں گی۔ اس لئے انسان لازمی طور پر بیرونی ماحول کے تابع ہے۔مذہبی نقطہ نظر سے یہ تصور انتہائی بے خدا اور غیرانسانی ہے۔ ایسی رائے انسان کو ایک چیز بنا کر رکھ دیتی ہے ایک ایسا شخص جس پر باہر سے میکانکی اور سماجی قوتیں زور صرف کررہی ہوں' اس انسان کے اندر کی برائی معاشرے کی برائی سے نبرد آزما رہتی ہے اور اس طرح دو انتہائی اور متضاد رد عمل ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

ڈرامہ ایک ایسا عمل ہے جو انسانی روح کے اندر ظاہر ہوتا ہے۔ جبکہ خیالی ریاست

ایک ایسا واقعہ ہے جو انسانی معاشرے میں وقوع پذیر ہو رہا ہے۔ ڈرامہ جذبات کے اظہار کی سب سے اعلیٰ شکل ہے جو ہماری کائنات میں ممکن ہے۔ خیالی ریاست {۱} سے مراد ایک تخیل ایک تصور ہے اور وہ تصور زمین پر جنت بسانے کا ہے۔ ایک خیالی ریاست میں ڈرامے کا ذکر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ڈرامے میں کوئی خیالی ریاست نہیں ہوتی۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ انسان اور دنیا کے درمیان یا فرد اور معاشرے کے درمیان فرق کا نام ہے۔{۲}

افلاطون اپنی کتاب "ریاست" میں لکھتا ہے :

> "آیئے ریاست کی بنیادوں کے بارے میں غور کریں۔ یہ بنیادیں ہماری ضرورت ہوں گی' لیکن ریاست کس طرح ان تمام ضروریات کو پورا کرے گی؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ کچھ لوگ زراعت میں مشغول ہوجائیں' کچھ ان میں معمار بن جائیں' کچھ ان میں جولاہے کا کام سنبھالیں؟ ہر شخص دوسرے کے لئے وہ فرض سرانجام دے جو صرف وہی سرانجام دے سکتا ہو۔ جنگجو لوگ دشمنوں کے ساتھ سخت رویہ رکھیں اور دوستوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں۔ ان دو خصوصیات یعنی نرمی اور سختی کو حاصل کرنے کے لئے وہاں فلسفی بھی ہونے چاہئیں تاکہ وہ دشمنوں اور دوستوں کے درمیاں تمیز کرنے کی اہلیت کے حامل ہوں۔ ریاست کے کامیاب محافظ بننے کے لئے ان جنگجو لوگوں کی تعلیم کا

{۱} خیالی ریاست (Utopia) یہاں اپنے اصل مفہوم میں استعمال ہوئی ہے۔ اس سے مراد ایک تصوراتی مثالی نظام ہے جو ایک جامع حیوانی جماعت کی طرز پر ہو۔

{۲} ڈرامہ اور خیالی ریاست کے درمیان جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ حقیقی ہے۔ چین کے ثقافتی انقلاب کے دوران تھیٹر بالکل ختم ہو کر رہ گیا ہے' کیونکہ جو سٹیج پر دکھایا جاتا تھا وہ ڈرامہ نہیں' "دقیانوسیت" تھی۔

اہتمام ہونا چاہیے۔ اس تعلیم میں ابتدائی تعلیم کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ عام طور پر اس تعلیم کا آغاز جنوں' پریوں کی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ ریاست کو چاہیے کہ ایسے ادیبوں پر پابندی لگائے جو ایسی کہانیاں لکھتے ہیں۔ حکمرانوں کو اجازت ہو کہ وہ ریاست کے مفاد میں جھوٹ بول سکیں' لیکن دوسرے لوگوں کو اس کی اجازت حاصل نہ ہو۔ ماتحتوں کو اپنے افسران کا کہا ماننا چاہیے۔ وہ تمام کتابیں جن میں اس بات کے خلاف لکھا گیا ہو ان کتابوں کو باہر نکال پھینکنا چاہیے جبکہ دیوتاؤں اور بہادر لوگوں کو مثالی بنا کر پیش کیا جائے۔ وہ تمام نغمے جو غمگین پست رو اور نازک ہوں ان کو ہٹا کر مردانہ اور جرأت مندانہ نغمے لائے جائیں۔ شراب کی ممانعت ہو شہری کو بیمار نہیں ہونا چاہیے تاکہ وہ طبی علاج نہ کروائے کیونکہ اس طرح تو ریاست کو نقصان پہنچتا ہے۔ شہری کو چاہیے کہ یا تو کام کرے یا مرجائے۔ وہ شخص جو طویل عرصے سے بیمار ہو یا کمزور نسل سے تعلق رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ وہ خودکشی کرلے۔ حکمرانوں اور محافظوں کے انتخاب کے لئے تعلیم کو مددگار ہونا چاہیے اور ان کے بیٹے جب تک ان عہدوں کے لئے اپنے آپ کو اہل ثابت نہ کریں ان کو "کارکنوں" کے طبقے میں شامل رہنا چاہیے۔ اس قسم کے نظام تعلیم سے ہر آنے والی نسل سابق نسل سے بہتر ہوگی' بالکل اس طرح جیسے کہ ہم پودوں اور جانوروں کی منتخب نسلوں کی نسل کشی کرکے معقول نسلیں پیدا کرتے ہیں" {۳}۔

مثالی ریاست کے لئے جو طریق کار سوچا گیا ہے وہ غیرانسانی ہوتے ہوئے بھی مکمل

{۳} Plato The Republic : Trans. Paul Shorey

(London : W.H. Heinemann 1946

ہے۔ اگر آزادی ڈرامے کی روح ہے تو مثالی ریاست میں تربیت اور یکسانیت کارفرما ہیں۔

سولھویں صدی کے آغاز میں تھامس مور نے ایک تاریخ ساز کتاب لکھی اور اس نے ایک خیالی جزیرے پر ایک خیالی ریاست کی بنیاد رکھی۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی بہت دلچسپ ہے اس لئے ہم اس کے اجزاء کو مختصرا پیش کررہے ہیں۔ خیالی ریاست کو آدھے چاند کی شکل دی گئی تھی جس میں چون بڑے شہر ہیں جو رقبے اور طرز زندگی میں بالکل مماثل ہیں۔ شہروں کے گرد دیہاتی قصبے ہیں جن میں مکانات ہیں اور زرعی آلات ہیں۔ زرعی کارکنوں کو چالیس چالیس افراد کی آبادیوں میں تقسیم کردیا گیا ہے اور ہر آبادی کا ایک مرد میزبان اور ایک عورت میزبان ہے۔ ہر آبادی کو دو غلام دیئے گئے ہیں۔ دو سال گزارنے کے بعد بیس ممبران کو قصبوں میں بھیج دیا جاتا ہے اور بیس نئے ممبران کو اس سرزمین پر بھیج دیا جاتا ہے جہاں پر انہوں نے دو سال گزارنے ہوتے ہیں اس طرح وہاں مستقل زرعی کارکن نہیں ہیں۔ مرغی کے چوزے مرغیوں کے بغیر یے جاتے ہیں (جس طرح جدید دور میں Incubator سے یہ کام لیا جاتا ہے)۔ ہر شخص کوشش کرتا ہے کہ اتنی مقدار میں شے پیدا کی جائے کہ اپنے قصبے کی ضرورت سے بچ جائے اور ساتھ والے قصبے کے لوگوں کو اس میں سے حصہ دیا جاسکے۔ فصل کی کٹائی میں ان لوگوں کی بہت بڑی تعداد شریک ہوتی ہے تاکہ یہ کام جلد از جلد اختتام پذیر ہوسکے۔ ان کا خزانہ (Amaroutu) سمندر کے قریب ایک دریا پر ہے۔ اس میں پانی کی فراہمی کا ایک معقول نظام ہے۔ گھر مکمل طور پر صاف ستھرے ہیں اور یہ گھر قطاروں کی صورت میں گلیوں کے ایک طرف بنے ہوئے ہیں اور ان کی چوڑائی تیس فٹ ہے۔ دروازے بند نہیں کیے جاتے کیونکہ وہاں نجی ملکیت کا سلسلہ نہیں ہے اور ایک نظام انتخاب کے ذریعے رہائش گاہیں ہر دس سال بعد تبدیل ہوجاتی ہیں۔ شہری اپنے باغوں کی حفاظت کرتے ہیں اور چند گھر دوسرے چند گھروں سے باغوں کی نگہداشت کا مقابلہ کرتے ہیں تمام مردوں

اور عورتوں کے لئے لازمی ہے کہ کوئی نہ کوئی فن سیکھیں۔ اہم کاموں میں اینٹیں بچھانا' لوہار کا کام' لکڑی کا کام' اون اور سن کی ترتیب ہے۔ ہر خاندان اپنے لباس خود بنا تا ہے اور پورے جزیرے میں یہ ایک جیسے ہوتے ہیں اور ان میں فرق صرف موسم' عمر' جنس اور ازدواجی حیثیت کا ہوتا ہے۔ مثالی ریاست کے تمام شہری اپنے آباواجداد کے پیشے کو اختیار کرتے ہیں۔ ان کو دن میں چھ گھنٹے کام کرنا ہوتا ہے۔ وہ تین گھنٹے صبح کام کرتے ہیں اور تین گھنٹے سہ پہر کے وقت' اور اس دوران میں دو گھنٹے کا وقفہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ آٹھ بجے بستر سنبھال لیتے ہیں اور آٹھ گھنٹے تک سوتے ہیں۔ کام کے دوران یہ لوگ چمڑے کا لباس پہنتے ہیں جو سات سال تک کام آتا ہے۔ ہر شہر میں چھ سو خاندان ہیں اور ہر خاندان میں دس سے سولہ افراد رہتے ہیں اور جو عمر میں سب سے بڑا ہوتا ہے وہ اس خاندان کا سربراہ ہوتا ہے۔ خاندان اس بارے میں خیال رکھتے ہیں کہ ان کی تعداد بہت کم یا بہت زیادہ نہ ہونے پائے۔ اگر ان کے ممبران کی تعداد زیادہ ہوجائے تو زیادہ افراد کو ان گھرانوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے جہاں افراد کی تعداد کم ہوتی ہے۔ ہر تیس گھروں کو ایک بہت بڑا گھر دیا جاتا ہے جہاں ان کا سربراہ رہتا ہے اور جہاں وہ آتے ہیں' بھونپو کے ذریعے انہیں اکٹھا کیا جاتا ہے تاکہ وہ کھانا اکٹھے کھا سکیں۔ اگرچہ ان کو اجازت ہے کہ گھر پر کھانا کھالیں لیکن اس چیز کو نامناسب سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں خوراک تیار کرنے کو وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہے ۔ مثالی ریاست کے شہری ریاست کے اندر سرکار کی اجازت کے ساتھ گھوم پھر سکتے ہیں {۴}۔

ہمارے دور کے معاشروں میں بھی کچھ چیزیں ان سے مماثل ہیں اور واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً معاشرے کے مفاد میں محدود آزادی' راہنمائی کرنے والے

{۴} Sir Thomas Moore : Utopia trans. Paul Turner (Baltimore : Penguin Books 1965).

قبیلے اور خاندان' سماجی تربیت' خاندان اور والدین کے ساتھ تعلق کا خاتمہ' فن اور فن کار (جو سرکار کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں) ڈارونی انتخاب' خاندانی کی بجائے سماجی تعلیم' فرد کے اوپر ریاست کی بالادستی' تکنیکی ترقی کے لئے قبول عام محنت کی تقسیم میں دونوں جنسوں کی برابری' برابر کی جائیداد' رضاکارانہ اجتماعی جسمانی محنت' مقابلہ اجتماعیت' یکسانیت' سنسرشپ وغیرہ وغیرہ۔

ڈرامے کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے' جبکہ خیالی ریاست کا تعلق دنیا کے عام حالات سے ہے۔ خیالی ریاست میں انسان کی اندر کی لامحدود دنیا ایک معمولی سے مصنوعی نکتے تک محدود کردی گئی ہے۔ خیالی ریاست میں یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ انسان کے پاس شعورو ادراک کی حامل روح موجود نہیں ہے۔ اس لئے خیالی ریاستوں میں انسانی یا اخلاقی مسائل بھی نہیں ہیں۔ اس ریاست میں لوگ اپنا فرض سرانجام دیتے ہیں' زندگی بسر نہیں کرتے۔ معروف معنوں میں وہ زندہ بھی نہیں ہیں' چونکہ انہیں آزادی حاصل نہیں ہے۔ ایک شہری کا یہاں کوئی کردار نہیں ہے'اس کی جگہ اس کی "نفسیات" ہے اور اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ فرائض میں اس کا کیا کردار ہے؟ "اچھا" اور "برا" اس کی زندگی میں بے معنی الفاظ ہیں۔کوئی بھی خیالی ریاست بشمول سائنسی اشتراکیت اخلاقی معاملات سے سروکار نہیں رکھتی۔ خیالی ریاست اچھائی اور برائی کے خیالات سے خالی ہے۔ ہر چیز ایک طے شدہ منصوبہ ہے۔

مارکس کے نزدیک اشتراکیت تاریخ انسانی کا آخری باب ہے۔ ہر شخص کے لئے اشیاء اور پیداوار کی کثرت ہو اور مادی طور پر وہ خوشحال اور متمول ہو (۵)۔ ہیگل کے نزدیک تاریخ سے مراد یہ ہے کہ آزادی کا تصور فتح مند ہو۔ اس کے نزدیک ڈرامہ اسی

{۵} Marx and Engels on Malthus: ed. Ronald Meck:

(London: Lawrence and wishart 1953).

خیال کی عکاسی کرتا ہے۔ مادہ پرست فلسفیوں کے نزدیک اگر طبعی دنیا کے قوانین کو انسان اور سماج پر لاگو کیا جائے تو اس کا نام اشتراکیت ہے اور یہ ان کے نقطہ نظر سے زندگی کا آخری باب ہے۔ {۶} اشتراکی نقطہ نظر سے دائمی امن سے مراد طبقات سے پاک معاشرے کا قیام ہے۔ طبعی دنیا کی تصاویر کے ذریعے ترقی کا خاتمہ دکھایا جاتا ہے اور دکھایا جاتا ہے کہ اس کے بعد زندگی کا تسلسل برقرار نہیں رہے گا۔ طبقات سے پاک معاشرے کا تصور اصل میں کلاسیس کا پیش کردہ نظریہ فشار کائنات (Entropy) ہے جسے اشتراکیوں نے اپنا کر معاشرے پر لاگو کر دیا ہے۔ اس کے برعکس مذہب دائمی امن یا فشار کی طرف نہیں' بلکہ اس کے انجام اور اختتام کی طرف دیکھتا ہے۔ مذہب مکمل مساوات یا عمومی توازن نہیں' بلکہ زندگی چاہتا ہے۔

اس لحاظ سے ڈرامہ تاریخی طور پر ایک مذہبی عمل ہے' جبکہ خیالی ریاست ایک طرح کی سائنس ہے۔ لامبرٹ کیٹیلیٹ نے عمرانیات پر ایک کتاب لکھی اور اس کا نام سماجی فزکس رکھا۔ اس کے خیال میں معاشرے میں جو بھی تعلیم دی جارہی ہے یا تو وہ فزکس کا تسلسل ہے یا حیاتیات (Biology) کا۔

کچھ سیاسی خیالی ریاستیں بھی ہیں۔ افلاطون سے آغاز کریں اور تھامس مور' ٹوماسو کمپانیلا' فرانسس فوریر' سینٹ سائمن' رابرٹ اوون اور مارکس تک کے لوگ اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ {۷} سائنسی ناول کو بھی یہاں شامل ہونا چاہیے اور ہم بیکن کی کتاب New Atlants کو بھی اس میں شامل کریں گے {۸}۔

{۶} George Wilhelm Friedrich Hegel: Lectures on the Philosophy of History (London: H.G. Bohn 1944).

{۷} Sir Thomas Moore: Utopia in Ideal Commonwealth ed. Henry Morley (New York: Kennikat Press 1968).

حاشیہ (۸) آگے

ٹیکنالوجی اور بدنام زمانہ ترقی نے سائنسی میکانیت کا ایسا نظام تشکیل دیا ہے جس کے اندر انسان اپنی انفرادیت کو لازمی طور پر کھو دیتا ہے اور وہ اس مشینیت کا حصہ بن جاتا ہے۔ آلڈس ہکسلے نے تو مستقبل کے انسان کو مصنوعی انسان کے روپ میں دیکھا ہے جو ٹیکنالوجی کی پیداوار ہے اور جسے انسان نے پیدا کیا ہے۔ علم جینیات (Genetics) کی ترقیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک انسانی جنین (Embryo) لیبارٹریوں میں طے شدہ منصوبے کے مطابق مختلف مدارج و مراحل سے گزارا جائے گا۔ سائنس اس قابل ہوجائے گی کہ وہ انسانوں کے مشابہ انسان تیار کرے جو اصل انسان کی نقل ہی ہو۔ ان کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی' بلکہ ان کی صرف پیداواری خصوصیات ہوں گی۔ {۹}ڈاکٹر ڈیوڈ کلین جو جنیوا یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ برائے جینیٹکس کے ڈائریکٹر ہیں' انہوں نے ایسے تجربات کیے ہیں جن میں مینڈک کے انڈے کے خلیے کو نکال کر دوسرے مینڈک کے خلیے کے ساتھ بدل دیا جاتا ہے اور اس طرح نیا پیدا ہونے والا جنین مطلوبہ جیساتی خصوصیات رکھتا ہے۔ ڈاکٹر کلین کے خیال کے مطابق' چالیس پچاس سال میں جب یہ سلسلہ مکمل ہوجائے گا تو یہ بھی ممکن ہوجائے گا کہ ایسے جاندار ہی نہیں' بلکہ انسان بھی پیدا کیے جائیں جن کے اندر سائنس دانوں کی مطلوبہ صفات موجود ہوں۔ آلڈس ہکسلے تکنیکی خیالی ریاست اور اس کی خصوصیات کو بیہودگی سے تعبیر کرتا ہے۔ آلڈس ہکسلے نے اپنی کتاب Brave New World میں آنے والی دنیا کے بارے میں کچھ تصورات پیش کیے اور کہا کہ سن پچیس سو میں دنیا انہی اصولوں پر استوار ہوگی۔ اس کے اصول

{۸} Francis Bacon : The Advancement of Learning and new Atlantis (London : Oxford Univ. Press 1966).

{۹} A Aldous Huxley : Brave New World (London : Chatto and Windus 1932).

مساوات' شناخت اور استحکام پر مبنی ہوں گے۔ حیاتیات اس دنیا کی اہم سائنس ہوگی اور حیاتیات کا یہ جدید علم انسان کو اس قابل بنا دے گا کہ انکیو بیٹرز سے ہزاروں لاکھوں سٹینڈرڈ کے انسان (مرغی کے چوزوں کی طرح) تیار کریں جو ان مشینوں میں جوت دیئے جائیں' اور وہ ایک ہی قسم کے افعال سرانجام دیں..... وغیرہ وغیرہ {۱۰}۔

اس "عجیب و غریب" دنیا میں گناہ اور گناہ گاروں کا وجود نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہاں نقص والے (معذور) افراد موجود ہوں' لیکن ان کو اس کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے گا نہ ان کو اس بنا پر سزا ہی دی جاسکے گی۔ انہیں صرف اس میکانیت سے الگ کر دیا جائے گا۔ اس دنیا میں نہ اچھائی ہوگی نہ برائی ہوگی اور نتیجۃً نہ بغاوتیں ہوں گی' نہ شکوک و شبہات' نہ المیے' نہ حوصلہ افزائی۔ چنانچہ محسوس ہوتا ہے کہ خیالی ریاست کی تشکیل انسان' ڈرامے اور تاریخ کو ہٹائے بغیر ممکن نہیں ہے۔

{۱۰}Aldous Huxley : Brave New World

London : Chatto and Windus 1932).

خیالی ریاست اور اخلاقی اصول

انسان ایک غیر حقیقی دنیا میں نہیں رہ سکتا' نہ ایک غیر فطری زندگی گزار سکتا ہے۔ اپنے گلے' ریوڑ' چھتے اور غول کے ممبران کے ساتھ منظم زندگی گزارنے کا نام اگر سماجی شعور ہے تو یہ شعور جانوروں اور پرندوں میں (حتیٰ کہ انسانی خلیے میں) بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ کہاجاتا ہے کہ انسان ایک معروضی جانور ہے' اس تصور کے بارے میں کئی شکوک و شبہات پائے جاتے ہیں۔ اگر سماجی شعور سے مراد اپنے گلے' ریوڑ' چھتے اور غول کے افراد سے گھل مل جانا ہے تو یہ شعور تو حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ مادہ پرست مفکر ہابز بڑی تلخی سے کہتا ہے کہ :

"فطری طور پر انسان سماجی ہے" اور اس کو "جماعت" میں رکھ کر اس کی فطرت کے خلاف کیا گیا ہے۔ صرف وہ لوگ جن کے اندر انسانیت کم ہے وہی کردار' تنظیم' تسلسل' تواتر' یکسانیت اور فرد کے اوپر ریاست کی بالادستی کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح کا فرد چونکہ زیادہ مؤثر ہوتا ہے وہ کوشش کرتے

ہیں کہ زیادہ مؤثر لوگوں کی آراء کم مؤثر لوگوں کی آراء پر غالب آجائیں۔
جسمانی کام کرنے والے لوگ شاعروں کی نسبت زیادہ مؤثر ہوتے ہیں اور اس
المناک حقیقت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر چیز کی قوت اور کمزوری اس
چیز میں مضمر ہے کہ وہ انسانی ہے یا نہیں ہے"۔

بیرکوں میں فوجیوں کو اپنی ضروریات پورا کرنے کے لئے تمام اشیاء' رہائش' خوراک' کپڑے اور کام مہیا ہوتے ہیں۔ ہمیں یہاں بھی تنظیم' تحفظ' نظم و ضبط' صحت' بلکہ ایک قسم کی مساوات اور یکسانیت نظر آتی ہے' تاہم بہت سے لوگ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ یہ بیرکیں اپنی تمام تر منفعتوں اور سہولتوں کے باوجود ایک ایسے معاشرے کا نمونہ پیش کرتی ہیں جس کی بدترین کیفیت کے متعلق صرف سوچا ہی جاسکتا ہے۔ آج کل جن معاشروں کو وجود میں لایا جارہا ہے ان کی حیثیت بھی بڑی بڑی بیرکوں جیسی ہے یا وہ بہت جلد ان بیرکوں میں تبدیل ہوجائیں گے۔خوبصورت نعرے جو ان معاشروں کے چہرے پر سجا دیئے جاتے ہیں ان سے نہ تو کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے' نہ ہی ان کی اصل بدلی جاسکتی ہے۔

انسان پروری اور اخلاقیات انسان کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں' یہ انسان کی پکار ہیں۔ ایک خیالی ریاست کے اندر جو فرد پایا جاتا ہے وہ اس لفظ کے حقیقی معنی و مفہوم اور روح کے لحاظ سے انسان نہیں ہے۔ وہ ایک سماجی حیوان ہے یا ایک ایسا جاندار جس کو عقل دے دی گئی ہے۔ ایک انسان اخلاق اور بد اخلاقی میں سے کسی ایک چیز کا مالک ہوتا ہے' لیکن ایک خیالی ریاست کا فرد صرف "اپنے کام" کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔

اخلاقی اصول صرف ضوابط کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر ہماری سرگرمیاں شعوری ہوں یا ہمارے ارادے سے نہ ہوں یا ہم وہ کام کر رہے ہوں جس کے کرنے پر

جس کے کرنے پر ہمیں مجبور کردیا گیا ہو (جیساکہ خیالی ریاست کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے) تب ہر اصول بشمول اخلاقیات بے معنی ہو جاتا ہے ۔ اسی طرح ایک اشتراکی کا "انتہائی رحمدلانہ" رویہ بھی غیر اخلاقی ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس نے اس پر بار بار اصرار کیا ہے کہ اشتراکیت میں کوئی اخلاقی اصول نہیں ہے۔ کمیونزم اخلاقی اصولوں کی نفی کرتا ہے کیونکہ لوگ ایک دوسرے سے براہ راست رابطہ اور تعلق پیدا کر لیتے ہیں اور اس کے لیے انہیں اخلاق کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ چیونٹی اپنے بل میں جو کام سرگرمی سے سرانجام دے رہی ہوتی ہے اس کو تو اخلاق سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے چیونٹیاں اس کے سوا کوئی اور کام سرانجام دے ہی نہیں سکتیں۔ جب شہد کی مکھیاں ایک چھتے میں سے بیمار مکھی کو نکال باہر پھینکتی ہیں تو وہ کوئی غیر اخلاقی کام سرانجام نہیں دے رہی ہوتیں' کیونکہ "گروہ" کے مجموعی مفاد کے لئے ایک ممبر کی قربانی "غیر اخلاقی فعل" نہیں ہے۔ اس وقت زیر بحث سوال ایک سماجی مشینی نظام کی کارکردگی کا ہے۔

لینن کے بیان کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ تمام کی تمام سائنسی اشتراکیت میں "اخلاق کی ہلکی سی رمق بھی نہیں ہے"۔ یہ ایک ایسا بیان ہے جس سے کئی شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں' لیکن حقیقت میں اشتراکیت اور خیالی ریاست کے درمیان صحیح ترین تعلق یہی ہے {1}۔

{1} Howard Selsam : David Goldway and Harry Martel eds

Dynamics of Social Change :

A Reader in Marxist Social Science from the writings Of Marx

Engles and Lenin New York :

International Publishers 1970).

مارکسیت بھی ایک خیالی ریاست ہی ہے کیونکہ یہ سائنسی ہے۔ ہر خیالی ریاست اس وجہ سے خیالی ہے کہ انسانی جان کو صرف بیرونی ظہور (جسم) سمجھتی ہے یا اسے پیداوار' استعمال اور تقسیم کے سوال سے جوڑ رہی ہے اور اس وجہ سے بھی کہ سائنس کے طریقوں کے استعمال، منصوبوں' اداروں' قوانین، جیلوں اور ضابطوں سے اسے حل کیا جا سکتا ہے۔ {۲} اس لئے ان کے نزدیک زندگی ضابطوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اگر معاشرے پر مادہ پرستانہ فکر لاگو کر دی جائے تو اس سے ایک قسم کی اشتراکیت یا کمیونزم جنم لیتا ہے۔ اگر یہی اجزاء ایک فرد کی زندگی پر مستقل طور پر لاگو کیے جائیں تو پھر وہ شاہراہ تعمیر ہوتی ہے جسے "عیش پرستی کی زندگی" کہا جاتا ہے۔ وہ شخص جو عیش پرستی میں یقین رکھتا ہے وہ عملی طور پر مادہ پرستی میں یقین رکھتا ہے چونکہ وہ ایک معاشرے کا ممبر مشروط طور پر ہوتا ہے' لیکن حقیقی زندگی میں وہ بے راہ رو انسان ہے اور ہر انسان سماجی زندگی کی نسبت ذاتی زندگی کی طرف زیادہ غالب رجحان رکھتا ہے۔ مثال کے طور صنفی تلذذ بھی انفرادی ہی ہوتا ہے' جبکہ اشتراکیت ایک مادہ پرستانہ فلسفے کا سماجی نتیجہ بن کر سامنے آتی ہے۔ "اگر مجھے صرف ایک زندگی ملی ہے تو اس کا تعلق صرف اور صرف مجھ سے ہے"۔ یہ بات زیادہ قرین صواب محسوس ہوتی ہے بہ نسبت اس بات کے کہ میں موجودہ نسلوں یا آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے کام کروں۔ علاوہ ازیں انسان کے اندر ایک ایسا رجحان پیدا ہوتا ہے کہ وہ سماجی ضابطوں اور اصولوں کو توڑنے کا بار بار مظاہرہ کرتا ہے۔ ہر وہ نظام جس میں فرد کی انفرادی حیثیت کو خاطر میں نہیں لایا جاتا اور جس میں صرف یہ کوشش ہوتی ہے کہ فرد کو معاشرے یا "اجتماع" کے ایک عضو کے طور پر دیکھا جائے اور دیگر تمام حقائق کو فراموش کر دیا جائے تو یہ غلط آغاز یا غلط بنیاد ثابت

{۲} اشتراکیت اور کمیونزم دونوں کہتے ہیں "صلاحیتوں کے مطابق پیدا کرو اور کام کے مطابق تقسیم کرو۔

ہوتا ہے۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی مثالیں بیان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر ایک مکھی سوچنے کے قابل ہوتی اور وہ اپنی جبلت کے ہاتھوں مجبور نہ ہوتی تو وہ بھی کام کرنے سے انکار کردیتی اور کوشش کرتی کہ وہ "رس" چوس جائے جو دیگر تمام مکھیوں نے مل جل کر پھولوں سے اکٹھا کیا ہے۔ اپنی "اجتماعیت" کو بچانے کے لئے دیمک کبھی بھی اپنی جان قربان نہیں کرتی۔ اگر دیمک کو انتخاب کا حق ملے تو وہ موت کی جگہ زندگی کا انتخاب کرے جیساکہ ہم نے انسانوں کی زندگی میں بھی دیکھا ہے کہ انسان معاشرے کی فلاح کے بارے میں بہت ساری باتیں کرتا ہے' لیکن حقیقت میں وہ اپنے ہی مفاد کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے اور اپنے ہی مفاد کے لئے کام کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے اشتراکی معاشروں میں عملی دشواریاں پیدا ہوئی ہیں اور یہ مشترکہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ اس قسم کے تمام ممالک میں ذمہ داری کا عام فقدان پایا جاتا ہے۔ جانوروں کی آبادیوں میں ایسا مظاہرہ نہیں ہوتا کیونکہ جانوروں کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مفاد کے مطابق کام کرسکیں چاہے اس سے ان کی "اجتماعیت" کو فائدہ پہنچتا ہو یا نہ پہنچتا ہو۔ انسان کو بہرحال یہ حق انتخاب حاصل ہے اور اس حقیقت کو بہرحال فراموش نہ کیا جانا چاہیے۔ لوگ اس کی بدولت ایسی حالت میں بندھ جاتے ہیں کہ یا تو ایک سماجی نظام دریافت کریں یا اس صلاحیت کو بذریعہ قوت یا بذریعہ مشقت ختم کریں وہ ہمیشہ ان دو سمتوں میں سے ایک سمت کا انتخاب کرتے ہیں۔ اشتراکی مفکرین نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ افراد کی نفسیات جو "نفسیات اشخاص" کے نام سے معروف ہے (اور ہر شخص کے اندر انفرادیت اور آزادی کی خواہش کی صورت میں موجود ہے) ایک سماجی' اجتماعی جنت کی تعمیر کے راستے میں ہمیشہ حائل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ معاشرہ' پیداوار' تقسیم' عوام الناس' طبقات وغیرہ کے متعلق گفتگو کرتے ہیں اور مسائل خصوصاً لوگوں کے انفرادی مسائل کے متعلق گفتگو کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ "لوگوں کے حقوق" کی جگہ "انسانوں کے حقوق" کی مخالفت کرتے ہیں۔ اسی طرح "انسانی حقوق کی

جگہ " سماجی حقوق پر گفتگو کرتے اور اس کی وکالت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں

ہروہ راستہ جو انسان زیادہ سہولت کے لئے اختیار کرتا ہے اور ہروہ فیصلہ جس میں انفرادی فائدے پر سماجی فائدہ غالب ہو صرف اسی صورت میں قابل عمل ہوتا ہے جب اندرونی ہیجانات اور تمنائیں اخلاقیات کی شکل اختیار کرلیں۔ ان حقائق کی موجودگی میں مادہ پرستوں نے ضمیر کے متعلق گفتگو شروع کردی اور ساتھ میں یہ بھی وضاحت کی کہ اس سے مراد سماجی شعور ہے یعنی یہ کہ احساس انسانی معاشرے کا حصہ ہے اور اجتماعیت کا حصہ ہونے کے سبب اسی طرح زندگی گزارے۔ اس سب کے باوجود شعور اخلاقیات کے ہم معنی لفظ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس طرح مادہ پرستوں نے مکمل طور پر غیر معروف عنصر کو متعارف کرایا جو مادہ پرستی کے ایجادی مرحلوں میں کبھی بھی متعارف نہ رہا تھا۔ اگر انسان دراصل معاشرے کا حصہ ہے اور صرف معاشرے کا حصہ ہوسکتا ہے تب ہی اشتراکیت ممکن ہے۔ انسان کے بارے میں ایسی رائے یک طرفہ ہے اور اس کی نامکمل تصویر کشی ہے۔ چونکہ انسان ایک آزاد وجود ہے' چونکہ وہ انتخاب کرسکتا ہے' چونکہ وہ ایک اخلاقی وجود رکھتا ہے' چونکہ اچھائی برائی کرنے کا اہل ہے مختصراً یہ کہ چونکہ وہ ایک انسان ہے اس لئے اشتراکیت اپنی جامع ترین شکل میں ناممکن بن جاتی ہے۔

❑ مقلدین اور آزاد منش :

ایک قسم کے لوگ وہ ہیں جو مضبوطی اور قوت کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں' جو نظم و ضبط کو پسند کرتے ہیں جو کہ بیرونی تنظیم کو اسی طرح پسند کرتے ہیں جس طرح فوج میں پسند کیا جاتا ہے۔ جہاں "ہر شخص جانتا ہے کہ احکامات کون جاری کرتا ہے اور عمل کس نے کرنا ہوتا ہے"۔ وہ کسی قصبے کے حصوں کی تعریف کرتے ہیں جہاں تمام گھر ایک جیسے ہوتے ہیں۔ سیدھی قطاروں میں ہوتے ہیں اور جن کے یکساں نمونے

ہوتے ہیں۔ یہ سب کے لئے یکساں لباس بلکہ وردی پسند کرتے ہیں ملٹری کے موسیقی والے بینڈ' تماشائی' پریڈ اور اسی قسم کے دوسرے "جھوٹ" پسند کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں نظم و ضبط زندگی کو "رونق بخشتے" ہیں اور اسے زیادہ آسان بناتے ہیں۔ وہ خاص طور پر "ہر اس چیز کو پسند کرتے ہیں جو قانون کے مطابق ہوتی ہے" یہ لوگ اس ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں جسے "تابع فرمانوں کی ذہنیت" کہا جاسکتا ہے۔ سادہ الفاظ میں انہیں ماتحت بننے میں زیادہ لطف آتا ہے' انہیں تحفظ' تنظیم اور انتظامیہ اچھے لگتے ہیں۔ انہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ ان کے سربراہ ان کی تعریف کریں' انہیں یہ اچھا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ شفقت کے بول بولے جائیں۔ اس کے علاوہ وہ ایماندار' پرامن' وفادار اور باشعور شہری ہوتے ہیں۔ ماتحت حضرات "اختیار حاصل کرنے" کو پسند کرتے ہیں اور "اختیار ماتحتوں" کو پسند کرتا ہے۔ یہ دونوں ایک کل کا جزء بن کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

دوسری طرف وہ لوگ جو ناخوش رہتے ہیں معتوب رہتے ہیں اور جو ہر وقت کسی نہ کسی چیز کے خلاف بغاوت پر تلے رہتے ہیں' جو ہمیشہ کوئی نئی چیز چاہتے ہیں۔ وہ روٹی کے متعلق کم بات کرتے ہیں اور آزادی کے متعلق زیادہ بات کرتے ہیں۔ امن کے متعلق کم باتیں کرتے ہیں، انسانی شخصیت کے متعلق زیادہ باتیں کرتے ہیں۔وہ اس بات پر یقین نہیں رکھتے کہ بادشاہ انہیں تنخواہ دیتا ہے۔ اس کے برخلاف ان کا تو یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ بادشاہ کو ہم کھلاتے ہیں (حکومت ہماری امداد نہیں کرتی' ہم حکومت کی امداد کرتے ہیں)۔ یہ لوگ صاحبان اختیار کو پسند نہیں کرتے اور صاحبان اختیار انہیں پسند نہیں کرتے۔ اس کے برعکس مذاہب کے اندر ماتحت ہوں یا صاحبان اختیار ہوں' آزادی کے متوالے ہوں یا باغیانہ رجحانات رکھنے والے ہوں وہ صرف اور صرف خدا کی ثناء بیان کرتے ہیں جبکہ صاحبان اختیار بت پرستی کی تعریف میں مگن رہتے ہیں۔ حقیقت میں بت پرستی غلامی یا ماتحتی کے راستے کو نہیں روک سکتی اور سچا مذہب آزادی کے راستے کی رکاوٹ نہیں بنتا۔

□ معاشرہ اور جماعت :

معاشرے اور جماعت کے درمیان فرق کیا جانا چاہیے۔ معاشرہ افراد کا ایک ایسا مجموعہ ہوتا ہے جس کی بنیاد مفاد پر ہوتی ہے اور جماعت ایک ایسا مجموعہ ہوتی ہے جس میں لوگ اکٹھے اس طرح نشوونما پاتے ہیں کہ ان کے درمیان تعلق کا احساس بھی ہوتا ہے۔ معاشرہ مادی فوائد اور مادی ضروریات پر مبنی ہوتا ہے جبکہ جماعت روحانی ضروریات اور جذبات پر مبنی ہوتی ہے۔ معاشرے میں لوگ صرف مفاد کی وجہ سے اکٹھے ہوتے ہیں یا الگ ہوتے ہیں اور جماعت میں لوگ بھائی بھائی ہوتے ہیں اور وہ مشترکہ افکار' اعتماد اور اس احساس کے ساتھ یکجا رہتے ہیں کہ ہم ایک ہیں۔ معاشرے کا وجود باقی رہتا ہے کیونکہ معاشرہ فوائد حاصل کرنے کے مواقع کو سہل بنا دیتا اور بقاء کو یقینی بناتا ہے۔ ایک بچہ دوسرے لوگوں کی امداد کے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتا جبکہ لوگ اس وقت تک باہمی ربط و محبت نہیں رکھ سکتے' جب تک وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ جڑے ہوئے نہ ہوں۔ یعنی معاشرے کا مصدر بیرونی احساس یا سماجی نظریہ ہے۔ ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ ایک معاشرے میں رہنے کی انسان کی خواہش کا سبب اس کی اپنی تمنا و آرزو نہیں' بلکہ ضرورت ہے۔ سماجی رویے کی بنیاد سماجی سبب نہیں ہوتا' بلکہ اس کی وجہ وہ فوائد ہیں جو اس سے حاصل ہوتے ہیں۔ {۳} عام طور پر معاشرے میں قوانین صلح اور قوانین اطاعت ان قوانین سے منسلک ہوتے ہیں جن میں فوائد باہم بانٹے جاتے ہیں۔ یہ صرف جماعتیں اور گروہ ہوتے ہیں جو انصاف' باہمی امداد' یکجہتی اور بھائی چارے سے واقف

{۳} Thomas Hobbes: De Cive – Philosophical Rudiments Concerning Government and Society (NY Anchor Books 1972).

ہوتے ہیں۔ ان دو اصطلاحات کے لاشعوری طور پر مدغم ہوجانے کے سبب بہت سی غلط فہمیاں جنم لیتی ہیں {۴}۔

مسیح علیہ السلام نے لوگوں کے درمیان باہمی محبت کی بات کی اور بالکل درست بات کی۔ ہابز "سب لوگوں کی جنگ سب لوگوں کے خلاف" کی بات کرتا ہے۔ مارکس بیرونی استحصال کی بات کرتا ہے اور اس کے نقطۂ نظر سے یہی درست ہے۔ مسیح علیہ السلام کے ذہن میں لوگوں کا ایک گروہ ہے۔ ہابز اور مارکس کے ذہن میں معاشرہ ہے۔ آدم سمتھ نے دریافت کیا کہ محبت اور انتقام کے جذبات وہ قوتیں ہیں جو لوگوں کے درمیان تعلقات کو کنٹرول کرتی ہیں۔ محبت اور انتقام کے جذبات ایک جماعت اور گروہ میں ہوتے ہیں' معاشرے میں نہیں۔

{۴} معاشرے اور جماعت کے درمیان فرق واضح کرنے کے لیے امریکہ کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ امریکہ میں لسانیت اور انفرادی ثقافت کی نئی رو چلنے لگی ہے۔ وکٹرٹرنر کے نزدیک یہ رو دراصل اجتماعیت اور بے ساختہ یکجائی کی تلاش ہے۔ ٹرنر کے نزدیک گروہ اور اپنی جیسی جماعت کی تلاش معاشروں کا حصہ ہوتی ہے۔ یہ اجتماعیت مذہب' ادب' ڈرامہ' فنون لطیفہ میں پائی جاتی ہے' لیکن اس کی جڑیں قانون' اخلاق' تعلقات' بلکہ معیشت تک میں پھیلی ہوئی ہیں۔

مزید دیکھیے۔

Victor Witter Turner: Dramas Fields and metaphors: Symbolic Action in Human Society (Itacha NY : Cornel University Press 1974).

Sidney Dillon Ripley : The Sacred Grove: Essays on Museums (New York: Simon and Schuster 1969).

Alex Haley : Roots (Garden City: NY: Double day Press 1976).

معاشرے کی تخلیق کے ساتھ تمدن لوگوں کے درمیان باہمی تعلقات' نیز ذاتی اور براہ راست تعلقات کو ختم کردیتا ہے اور اس کی جگہ ظاہری' بیرونی اور رواجی تعلقات کو فروغ دیتا ہے۔ لوگ خاندانی تعلقات' پیدائش اور موت کی تقریبات اور رسومات کی صورت میں مجتمع ہوتے ہیں جس میں ہر شخص شریک ہوتا ہے اور ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔ ان تعلقات کے علاوہ جو فرد کو بنی نوع انسان کا ممبر بناتے ہیں' تمدن ایسے ادارے قائم کرتا ہے جو لوگوں کی اور ایک بنجر معاشرے کی نگرانی کریں۔

اولین مسیحی معاشرہ روحانی گروہوں کی مثال میں سب سے بہتر مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جس میں اس اصطلاح کے تمام مفاہیم چھپے ہوتے ہیں' لیکن وہاں بھی ہمیں اجتماعی کھانے کا ذکر ملتا ہے جو "سماجیت" کی علامت ہے۔ یہ اور اسی قسم کی دیگر چیزیں مدنظر رکھ کر ہی چند لوگ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے کہ مسیحیت سماجی تحریک تھی اور مسیحیت میں جو مساوات پائی جاتی تھی اس کو مدنظر رکھ کر لوگوں نے یہ کہا کہ مسیحیت کا قائم کردہ معاشرہ کمیونزم کی اولین شکل تھا۔ یہ بات بلاشک و شبہ غلط ہے اور واقعات کی مکمل طور پر غلط توجیہ ہے۔

❑ شخصیت اور "سماجی فرد" :

یورپ کی تاریخ میں خیالی ریاست کا اولین تصور عیسائیت سے آیا {۵}اور یہ اس کی تاریخ کا المناک پہلو ہے۔ کمپانیلا نے جو کتاب ترتیب دی اس کا نام اس نے "سورج کا شہر" رکھا اور اس میں خالصتاً مسیحیت کے خلاف نقطہ نظر کو پیش کیا گیا ہے' کیونکہ اس

{۵} Tommasso Campanella : Civi'tas Solis (The City of the Sun).

کے اندر ایک دنیاوی سلطنت کا تذکرہ ہے آسمانی سلطنت کا نہیں' نتیجتاً فرد کی بجائے یہ کتاب معاشرے سے بحث کرتی ہے۔ یہ کتاب مسیحیت کے اغراض و مقاصد کے علی الرغم ہے۔ یورپ وغیرہ میں معاشی اور سیاسی نظریات کے آغاز کا سبب بنی۔

مذہب بیرونی دنیا کو ترتیب بخش کر ایک نظام میں پرونا نہیں چاہتا۔ مذہب جذبے اور ذمہ واری کا نام ہے سہولت یا بہتر معیار زندگی فراہم کرنے کا نام نہیں ہے۔ مسیح علیہ السلام مصلح نہیں تھے جس طرح فرانسیسی انقلاب اور سائنسی ترقی مسیحی منشور اور عقائد یعنی امن اور محبت کے حصول کے لئے برپا نہیں ہوئے تھے۔ مسیح علیہ السلام کے سامنے انسانی روح اور نجات کی واضح منزلیں موجود تھیں' جبکہ خیالی ریاست کے اندر مکمل امن و سلامتی حاصل کرنے کا ایک انسانی خواب چھپا ہوا ہے۔ مذہب انسانی گواہی کی تاریخ ہے اور مثالی ریاست غیر واضح "کامیابی" کی کوشش ہے اور ان دونوں میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ ایک کا تعلق آسمانی بادشاہت سے ہے اور دوسرے کا تعلق دنیا کی ریاست سے ہے۔ ان دونوں ریاستوں کا ایک ہی نظم اور ربط نہیں ہے۔

ڈرامے کے اندر "سماجی تحفظ کا نظریہ" نہیں ہوتا' جبکہ مثالی ریاست میں انسانی عظمت کا نظریہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مارکس "استحصال زدہ" لوگوں کی بات کرتا ہے {۶} اور داستووسکی' مجبور و مقہور اور ذلیل و خوار کیے گئے "لوگوں" کی بات کرتا ہے۔ سماجی ریاست میں تعلقات کو اس طرح محسوس کیا جاتا ہے گویا کہ لوگوں پر تشدد اور ان کا استحصال کیا جانا بند ہو چکا ہے۔ فطری قانون اس طرح کے تعلقات استوار کرتا ہے گویا کہ وہ مجبور و مقہور اور ذلیل نہیں ہیں {۷}۔

{۶} Feodor Dostoevski: Sabra-nye Sachinyehye (Moscow : Goc iza vo Choodoi 1956).

{۷} Ernest Bloch: Natural Law and Human Dignity (Beograd 1977).

جب کمپانیلا مثالی ریاست کے بارے میں ایسے تصورات پیش کر رہا تھا' یقینی طور پر اس کے ذہن میں مسیحیت کا پیش کردہ نظریہ "ہمسائے سے محبت" موجود تھا' لیکن تمام تر ہمدردی کے باوجود وہ شریف دانشور فراموش کر بیٹھا کہ وہاں نہ تو ہمسائے تھے اور نہ ہی مخلص دوست۔ یہ لوگ پیداوار کے تعلقات 'صرف' کے تعلقات اور محنت کی تقسیم میں غائب ہوگئے تھے' ختم ہوچکے تھے۔ اس ریاست میں فرد کے ہمسائے سے نہ تو کوئی محبت کرتا ہے' نہ نفرت کرتا ہے۔ اس ریاست کا فرد نہ نیک ہے نہ بد ہے۔ اس کی کوئی روح بھی نہیں ہے۔وہ ایک بے مثل' لیکن مکمل فرد ہے اور جو پیدائش سے موت تک "سورج کے شہر" میں مستقل طور پر اپنی ذمہ داریاں ادا کرتا رہتا ہے۔

اگر اس طرز پر سوچا جائے تو خیالی ریاست حقیقت کے صرف ایک رخ کا تجزیہ محسوس ہوتی ہے اور ڈرامہ اس کا دوسرا پہلو بنتا ہے۔ شیکسپیئر اور داستووسکی ڈرامے کے ذریعے دنیا کو کھول کر پیش کرتے ہیں۔ داستووسکی کے ناولوں میں انسانی روح اپنی سرکش شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے' اس میں مسائل بھی ہیں' اندرونی تغیرات بھی ہیں جو باہر کی دنیا سے بڑھ کر شدید ہیں اس میں امارت ہے' غربت ہے۔ اس میں عدالتیں اور ریاستیں ہیں' اس میں کامیابیاں اور ناکامیاں ہیں' کچھ حقیقی ہیں' کچھ مصنوعی ہیں۔ ڈرامے کے اندر فرد اپنی عظمت کے ساتھ تمام دنیا پر چھاجاتا ہے اور اس کو ایک مثال بنا دیتا ہے{۸}۔

خیالی ریاست کا تصور اسی وقت درست ہے جب یہ مانا جائے کہ انسان ایک جانور ہے جس کو عقل دی گئی ہے۔ خیالی ریاست دو حقائق کا نتیجہ ہے اور دونوں کا اجراء "دنیا" سے ہو رہا ہے۔ انسان کی ضروریات ہیں (اور یہ ہمیشہ فطری ضروریات ہوتی ہیں) اور اس کی ذہانت ہے (کہ کس طرح اپنی ضروریات کو عقل و ذہانت سے پورا کیا

{۸} مذاہب کے نزدیک کائنات کا محور انسان ہے۔

جائے)جب انسان کی ضروریات ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معاشرے میں رہنا چاہتا ہے' لیکن ایک ذہین وجود ہونے کے ناطے وہ ہمیشہ کوشش کرتا رہے گا کہ بہترین اور منظم معاشرے میں رہے' یعنی ایک ایسا معاشرہ جس میں "سب کے خلاف سب کی جنگ" کا خاتمہ ہو۔ اس مثالی معاشرے کے اصول آزادی یا انفرادیت نہیں' بلکہ تنظیم اور تعمیل ہیں {۹}۔

ان حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ خیالی ریاست اور ارتقاء پذیر نظریات کا انسان کی ابتداء کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ معروف ماہر حیوانیات روڈولف ورکوف نے بھی اس حقیقت کو محسوس کیا۔ {۱۰}ڈارون نے ایک لحاظ سے بعد میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو مشروط کردیا۔ مختلف سماجی تصورات کے لئے موزوں ہونے یا کسی مثالی ریاست کے لئے اچھا شہری بننے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کی ڈارون کے نظریے کے مطابق کتربیونت کی جائے۔ ایک حقیقی انسان انفرادیت پسند بھی ہوتا ہے اور رومان پرور بھی اور اس کے لئے کسی طور پر بھی ممکن نہیں ہے کہ وہ خیالی ریاست یا اس قسم کی کسی اور ریاست میں باقی رہ سکے اور اس کا اچھا شہری بن سکے۔ مثالی ریاست کے لئے ہر اس چیز کا خاتمہ ضروری ہے جس کا انسان اور اس کی انفرادیت سے تعلق ہو' آزادی سے تعلق ہو۔

اس لئے خیالی ریاست ملحدوں کے ایمان اور عقیدے کا نام ہے۔ اہل ایمان کا اس سے تعلق نہیں ہے۔ لیکن اگر انسان ایک آزاد وجود ہے اور ایک مکمل جانور نہیں ہے تب بھی یہ عقیدہ دھوکہ ہے جب سے انسان کو وجود عطا ہوا ہے اس وقت سے ہی ایک خیالی ریاست کا وجود ناممکن ہے۔ بشر کو "انسانیت" سے نوازنے کے بعد کے مرحلے سے

{۹} یاد رہے کہ اپی کیورس کا تصور آزادی نہیں' بلکہ تحفظ تھا۔

{۱۰}Rudolf Ludwig Karl Virchow : Diseases 'life and man.

(Stanford : Stanford Univ. Press 1958).

انسان کا مقابلہ انتشار، بدنظمی، تلاطم اور ڈرامے سے ہے۔ "نیچے اتر جاؤ (تم سب لوگ) اور تمہارے درمیان افتراق ہوگا"۔{۱۱} مثالی اور خیالی ریاست رائے اور شخصیت سے محروم ایسی نسلوں کا تسلسل ہے جو اشیاء کو تیار کرتی اور استعمال کرتی ہیں اور یہی کام کرتے کرتے مرجاتی ہیں، کیونکہ کائنات خدا نے پیدا کی ہے اور خدا اس کی تخلیق کے وقت سے اس کائنات میں مداخل ہے اس لئے خیال ریاست کا وجود میں آنا نظریے کا شائبہ ہی محسوس ہوتا ہے۔ جبکہ خیالی ریاست کے فلاسفہ نے معاشرے اور اس کے مفادات کو سب سے اعلیٰ قدر قرار دے دیا ہے جب کہ خدا چاہتا ہے کہ انسان کو سب سے اعلیٰ قدر قرار دیا جائے۔

یہ خیال کرنا کہ ایک خیالی ریاست وجود میں آجائے گی بے معنی امید اور بھولپن ہے کیونکہ اس کی بنیاد انسانی روح کی نفی پر ہے۔ وہ لوگ جو انسانی روح اور انسانی شخصیت کو نظرانداز کرتے ہیں وہی لوگ انسان کے "سدھائے جانے" اور ایک خیالی ریاست کی مشینی میکانیت کا فرد بنائے جانے کا سوچ سکتے ہیں۔ {۱۲}اس کے برعکس جو لوگ انسانی روح پر یقین رکھتے ہیں وہ دراصل بغاوت، خوف، شکوک اور نافرمانی کے ناقابل تسخیر سمندر پر یقین رکھتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ انسان ایک ایسا وجود ہے جس کی انفرادیت ناقابل علاج ہے۔ اس کو یک شکل، یک نظامی، پالتو اور خاموش نہیں بنایا جاسکتا اور ایک مرتبہ جب وہ کسی بھی چیز کو بکثرت حاصل کرلے گا وہ اشیاء کے ڈھیر کو نفرت سے پرے کردے گا اور اپنی آزادی اور اپنے انسانی حقوق پر اصرار کرے گا۔ "انسان ایک جانور ہے جو جانور بننے سے انکاری ہے"۔ یہ وہ نکتہ ہے جو خیالی معاشرے کے خیالات کو باہم مربوط رکھتا ہے۔

{۱۱} القرآن سورہ بقرہ آیت ۳۶۔

{۱۲} توحید پرستی سے محروم معاشرے ہی خیالی ریاست کے لئے موزوں ہیں۔

❑ خیالی ریاست اور خاندان :

اشتراکی نقطہ نظر سے خاندان معاشرے کی بنیادی اینٹ نہیں ہے جیسا کہ پرانے دساتیر میں قرار دیا گیا ہے۔ {۱۳} خاندان اور معاشرے ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ خاندان میں محبت اور جذبات لوگوں کو جوڑے رکھتے ہیں معاشرے میں مفاد اور ذہانت یا دونوں ان کو جوڑے رکھتے ہیں۔

معاشرے کے اندر رونما ہونے والا ہر تغیر خاندان کے خاتمے کا متقاضی ہوتا ہے اگر ایک خیالی ریاست میں سماجی اصولوں کو آخر تک بروئے کار لایا جائے تو اسے خاندان کسی صورت میں بھی تسلیم اور برداشت نہیں کرتا۔ خاندان میں ذاتی تعلقات' رومانوی خیالات اور اندرونی جذبات کی بھٹیاں ہوتی ہیں اور یہ خیالی ریاست سے سراسر متضاد ہوتی ہیں۔ اینگلز نے انہی چیزوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تسلیم کیا ہے کہ ”اولین دور میں خاندان کا آغاز دائروں کے محدود ہونے سے شروع ہوا۔ پہلے آغاز قبیلے کے اندر ہوا' جس کے اندر دو متضاد جنسوں کے افراد صنفی تعلق کے ذریعے ایک دوسرے سے متعلق ہوگئے۔ آغاز میں قریب کے رشتہ داروں اوربعدمیں دور دراز کے رشتہ داروں میں بُعد پیدا ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ شادیوں کے ذریعے جڑے ہوئے افراد خانہ بھی الگ ہونے لگے۔ آخر میں شادی کے بندھن میں بندھے ہوئے افراد کا جوڑا رہ گیا یہ ایک ایسا مالیکول ہے جس کے بکھرنے سے خاندان بذات خود بکھر جاتا ہے {۱۴} خیالی ریاست میں ہر دوسری چیز کی

{۱۳} یونین آف سوویت سوشلسٹ روس کے ۱۹۷۷ء کے دستور میں خاندان کی جگہ ”اکٹھے کام (کرنے والے)“ کا ذکر ہے۔

{۱۴} یہ حاشیہ آگے ملاحظہ فرمائیں

طرح بچوں کی پرورش بھی ہر ذمہ داری سے مبرا ہے' کیونکہ دوسرے بہت سے کاموں کی طرح یہ کام بھی صرف ایک "کام" یا "شکل پیداوار" ہے۔ افلاطون اپنی کتاب "ریاست" میں لکھتا ہے :

"بیس اور چالیس سال کی عمر کے درمیان عورتوں کو خاص کمروں میں پچیس اور پچاس سال کے مردوں کے ساتھ رہنے دیا جائے۔ اس طرح سے جو بچے پیدا ہوں گے ان کی پرورش اور تعلیم کا انتظام ریاست کرے اور ان کی ماؤں اور باپوں کا علم نہ ہو۔ جن عورتوں کی عمر بیس سال سے کم ہو یا وہ مرد جن کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہو ان کو اجازت حاصل ہو کہ وہ صنفی تعلق قائم کریں اور اس تعلق کے نتیجے میں حمل ٹھہر جائے تو اس کو ضائع کر دیا جائے اور اگر بچہ پیدا ہو جائے تو اس کو بھوک سے مرجانے دیا جائے۔ خاندانی زندگی اور محبت کو دیس نکالا دے دیا جائے"۔

اس معاملے میں اینجلز اس سے بھی زیادہ سفاکانہ رائے رکھتا ہے {۱۵} :

"مادہ پرستانہ تصورات کے مطابق تاریخ کے اندر فیصلہ کن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے لئے ضروریات کی پیداوار در پیداوار کا سلسلہ جاری رہے۔ اس کی نوعیت بھی دو شاخی ہے۔ ایک طرف تو بقاء کے ذرائع مثلاً خوراک' لباس

{۱۴} Engels: Origin of the Family International Publishers (New York : 1942).

{۱۵} خیالی ریاست محبت کی نفی کرتی ہے' کیونکہ یہاں سماجی کی جگہ "ذاتی" معاملات آجاتے ہیں' چین کے ثقافتی انقلاب (جو خیالی ریاست کے حصول میں سب سے کامیاب جدوجہد کرتا رہا ہے) میں محبت کو بورژوا جذبہ قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ملک' سوشلزم اور ماؤ کے علاوہ باقی تمام محبتوں کو زہریلا سمجھ کر ترک کر دیا جائے۔

رہائش اور ان چیزوں کو تیار کرنے کے لئے اوزار کی فراہمی ہے اور دوسری طرف بذات خود انسانوں کی پیدائش کا مسئلہ ہے' تاکہ وہ نسل برقرار رہے"۔ {۱۶} آگے وہ لکھتا ہے :

"یہ واضح ہے کہ عورتوں کی آزادی کے لئے ضروری ہے کہ عورتوں کو دوبارہ عوامی سرگرمیوں میں شامل کردیا جائے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ الگ تھلگ خاندان کا وجود بطور معاشرتی و سیاسی یونٹ کے ختم کردیا جائے۔ نجی ملکیت کو سماجی صنعت میں تبدیل کردیا جائے۔ بچوں کی داشت پرداخت اور تعلیم سرکاری معاملہ ہومعاشرہ تمام بچوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے چاہے ان کی پیدائش جائز طریقے سے ہوئی ہو یا ناجائز طریقے سے ہوئی ہے" {۱۷}۔

مارکس کے نزدیک خاندان کے خاتمے سے مراد یہ ہے کہ انسان کو سماج بنادیا جائے اور اس کو مکمل طور پر "سماجی وجود" میں تبدیل کردیا جائے۔ انسانی وجود کے تمام حقوق چاہے وہ سماجی ہوں' مادی ہوں یا اخلاقی ہوں ان کو خاندان سے معاشرے کی طرف منتقل کردیا جائے۔

فرانسیسی ادیب سائمن باوار جو فرانس اور دیگر ممالک میں آزادی نسواں کی تحریک کا معروف کارکن رہا ہے اس کی رائے بھی اس بارے میں واضح ہے۔ وہ کہتا ہے :

"جب تک خاندان کے تصور کو ختم نہیں کیا جاتا' جب تک "ماں" کے ادارے کو ختم نہیں کیا جاتا اور جب تک "مادری جذبے" کو ختم نہیں کیا جاتا'

{۱۶} Engels Origin of the Family Private property and The state 1884 Edition (New York: International Publishers (1942)

{۱۷} Engels: Origin of the Family Private property and Th state 1884 Edition (New York: International Publishersm 1942.

عورت ہمیشہ مطیع اور ماتحت رہے گی" {۱۸}۔

تمدن خاندان کا خاتمہ صرف نظری طور پر نہیں کرتا' بلکہ وہ یہ کام شعوری اور حقیقی طور پر سرانجام دیتا ہے۔" سب سے پہلے مرد نے خاندان کو چھوڑا' پھر عورت نے خاندان کو چھوڑا اور پھر بچوں نے بھی خاندان کو چھوڑ دیا۔ خاندان کے خاتمے کی جڑیں کئی پہلوؤں میں واضح نظر آتی ہیں۔ شادیوں کی تعداد گھٹتی جارہی ہے۔ طلاقوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ ملازمت کرنے والی عورتوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہورہا ہے۔ ناجائز بچوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ایک فرد والے گھروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور یہ سلسلہ آگے بڑھ رہا ہے {۱۹}۔ نوجوانی میں بیوہ یا رنڈوے ہوجانے والوں کی تعداد کو بھی یہاں مدنظر رکھنا چاہیے اور ان کی عمومی وجہ اموات ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ دل کی بیماریوں اور دیگر مہلک بیماریوں کی تعداد میں اضافہ مدنظر رہنا چاہیے جو تمدن کے ساتھ ہی متعلق ہے۔

۱۹۶۰ء میں کیلی فورنیا میں جتنی شادیاں ہوئی تھیں اتنی ہی طلاقیں بھی واقع ہوئی تھیں۔ یہ "کیلی فورنیائی تناسب" دنیا کے تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مراکز میں بھی جلد ہی پہنچ گیا۔ نئی شادیوں کے ساتھ ساتھ طلاقوں کا تناسب بھی مستقل انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں امریکہ میں نئی انجام پانے والی شادیوں میں ہر سو میں سے چھبیس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ۱۹۷۹ء تک یہ تعداد اڑتالیس فی صد تک پہنچ چکی تھی۔ روس میں ۱۹۶۰ء کے دوران نئے شادی شدہ جوڑوں میں طلاق کا تناسب دس فیصد تھا جو ۱۹۷۳ء میں ۷۲ فیصد تک پہنچ چکا تھا۔ پچھلے دس سالوں میں سوئٹزرلینڈ میں طلاقوں کا تناسب دوگنا ہو چکا ہے {۲۰}' جبکہ پولینڈ میں طلاق کا تناسب پچھلے بیس سالوں

{۱۸} New York Magazine Saturday Review September 1975.

{۱۹} سوئٹزرلینڈ اور سویڈن میں ہزار میں سے پانچ لوگ شادی کرتے ہیں {۲۰} حاشیہ آگے ہے

میں چار گنا تک بڑھ چکا ہے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۵ء تک کے تین دہوں میں چیکو سلووییکیہ میں طلاقوں کی تعداد تین گنا بڑھ چکی ہے۔ پراگ میں ہر تیسری شادی کا انجام طلاق ہوتا ہے۔ فرانس میں سکول کی لڑکیوں سے ایک سوالنامے کے ذریعے معلوم کیا گیا کہ ان کی ترجیحات کیا ہیں تو انہوں نے آزادی اور آرام وہ زندگی کو اولین ترجیح اور خاندان کو آخری ترجیح قرار دیا {۲۱}

اقوام متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے اعداد و شمار کے مطابق پچھلے پچیس سالوں میں معاشی زندگی کی سرگرمیوں میں عورتوں کا حصہ توقع سے بھی زیادہ بڑھ چکا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں دنیا کے تمام ملازم پیشہ لوگوں میں سے پینتیس فیصد خواتین تھیں۔ اسی طرح ملازم پیشہ عورتوں کی سب سے بڑی تعداد روس میں ہے جہاں سو میں سے بیاسی عورتیں کام کرنے کی اہل ہیں اور رجسٹرڈ ہیں۔ مشرقی جرمنی میں اسی فیصد عورتیں' بلغاریہ میں چوہتر فیصد عورتیں' ہنگری میں تہتر فیصد عورتیں اور پولینڈ میں تریسٹھ فیصد عورتیں کام کرتی ہیں ان ممالک کے بعد فن لینڈ' سویڈن' چیکو سلوویکیہ' ڈنمارک اور جاپان کا نمبر آتا ہے۔ برطانیہ' سوئٹزرلینڈ آسٹریا' امریکہ اور مغربی جرمنی ممالک کے گروہ میں عورتوں کی تقریباً نصف تعداد (۴۹ سے ۵۲ فیصد تک) ملازم پیشہ ہے۔

جن اشتراکی ممالک میں خونریز فسادات برپا ہوئے' اگرچہ وہ ان ممالک کی طرح ترقی یافتہ تو نہیں ہیں جن کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے۔ تاہم ان فسادات کی وجہ نظریاتی ریاست کے اثرات' خاندان کے ساتھ رویہ اور عورتوں کی ملازمت ہے۔ اسی طرح کی ایک اور حقیقت یہ ہے جس کی تکنیکی ترقی کے ذریعے وضاحت نہیں کی جاسکتی اور

{۲۰} سوئٹزرلینڈ میں دس ہزار میں سے ۱۴۱،۱ لوگ طلاق کے عمل سے گزرتے ہیں۔ (حکومت سویڈن کے جاری کردہ اعداد و شمار ۱۹۷۶ء)۔

{۲۱} Report by B. Fazzo at The International Congress in Bonn 1960.

وہ یہ ہے کہ امریکہ اور روس میں ناجائز بچوں کی تعداد برابر ہے یعنی آبادی کا دس فیصد۔

اس معاملے میں روس دنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک کی شکل اختیار کرچکا ہے' کیونکہ شادی اور خاندان کے عمومی تہذیبی پہلو کو منفی نظریاتی رویے کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔ چین' کوریا' اور اب کمبوڈیا میں بھی بٹے ہوئے خاندانوں کی موجودگی کی وجہ بھی یہی ہے۔ چین میں لاکھوں گھر ایسے ہیں جہاں افراد خاندان الگ الگ رہتے ہیں۔ باپ ملک کے ایک حصے میں رہتا ہے۔ ماں اور بچے ملک کے دوسرے حصے میں رہتے ہیں اور ان کی سال میں صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ "ملک کی معیشت کو اس کی ضرورت ہے" اور یہ "اجتماعی کام" ہے اگر خاندان اکٹھا رہے تو ملک کے لئے اس قسم کے فوائد حاصل نہیں کیے جاسکتے۔

ایک جائزے کے مطابق امریکہ میں گھر سے بھاگنے والے بچوں کی تعداد پچھلے پانچ سالوں میں دگنی ہوچکی ہے اور ۱۹۷۶ء میں ان کی تعداد بیس لاکھ ہوجائے گی۔

اس صورت حال میں بڑی عمر کے لوگ سب سے زیادہ کربناک صورت حال کا شکار ہیں۔ حقیقت میں دنیا تو دونوں گروہوں کی ہے نوجوانوں کی بھی ہے اور بوڑھوں کی بھی' لیکن تمدن جو اخلاقی معیارات سے محروم ہے اور صرف عقل پرستانہ جذبات کے تابع ہے۔ دنیا کو نوجوان لوگوں کی آرزوؤں اور خواہشات کے مطابق تشکیل دیتا ہے۔ "ترقی اور عروج کے زمانے میں ان لوگوں کے لئے زیادہ جگہ اور زیادہ مواقع ہوتے ہیں جو زیادہ متحرک ہوں۔ اور نوجوان لوگ زیادہ متحرک اور صحت مند ہوتے ہیں۔ یہ رائے ایک یوگوسلاوی ماہر نفسیات کی ہے۔ یہ ایک ایسا رویہ ہے جس میں چین کے معاملات کو دیگر تمام معاملات پر فوقیت دی گئی۔ فطری طور پر ایسے ماحول میں تمام مدح و ستائش نوجوانوں کے حصے میں آئی اور مضحکہ خیز رویہ بوڑھوں کا مقدر بنا۔ بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کے لئے احترام کا جذبہ سب سے بڑا تعصب سمجھا جاتا ہے۔ اگر انسانی روح کا وجود نہیں ہے تو ایک بوڑھا شخص دنیا کے اندر سب سے زیادہ بے مصرف بن جاتا ہے۔ زیر بحث

موضوع تو مذاہب میں اقدار کا درجہ رکھتا ہے۔ مذہب اور تہذیب مختلف رویہ اختیار نہیں کرسکتے۔

تمام مذاہب میں خاندان کی وکالت اس طرح کی گئی ہے گویا کہ یہ خاندان مرد کے لئے گھونسلہ ہو اور عورت کو اولین استاد قرار دیا گیا ہے جس جیسا استاد مہیا ہونا ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ تمام خیالی ریاستوں میں سماجی تعلیم' نرسری سکول' نونہالوں کے سکول' بچہ گھر وغیرہ کے متعلق بڑے اہتمام سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس سے صرف نظر کے ساتھ کہ ان اداروں کو ہم کیا نام دیں ان سب میں ایک چیز مشترک ہے کہ ان میں سے "ماں" کو خارج کردیا گیا ہے اور بچوں کی نگہداشت کو ملازمین کے حوالے کردیا گیا ہے۔ افلاطون جس نے خیالی ریاست کے بارے میں سب سے پہلے منظم سماجی تخیل واضح کیا اسی نے سب سے پہلے منظم سماجی تعلیم کا نظریہ بھی پیش کیا۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی اشتراکی تحریکوں میں یہ نظریہ اپنے عروج تک پہنچ گیا ہے۔ یہ رویہ بڑا قانونی ہے اور اگر انسان "سماجی حیوان" ہے (جو اس کے وجود کا صرف ایک حصہ ہے) تب مشق' سماجی تعلیم' گوشہ اطفال اور نام نہاد نظری ریاست اس کا صحیح حل ہیں۔ جب کہ مادری الفت' پدری شفقت' خاندان' فنون اور مذہب کے متعلق تعلیم' انفرادیت' اور آزادی غیر معمولی رومانوی اور افسانوی تصورات کے سوا کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ایک مثالی نظری اور خیالی ریاست میں ہر شخص اپنی ذمہ داری کسی غلطی کے بغیر مکمل طور پر سرانجام دیتا ہے ماں اور خاندان اس مکمل نظام اور تربیت کو خراب کرسکتے ہیں اور وہ نظام تہہ و بالا ہوسکتا ہے جس کی بنیاد یکسانیت اور نفی ذات پر ہے۔

ایک ماں بچے کو جنم دیتی اور اس کی پرداخت و نگہداشت کرتی ہے' بالکل اس طرح جس طرح ایک ریاست ایک پودے کو درخت بناتی ہے اور وہ مستقبل کی خیالی ریاست کا حقیقی باشندہ بن جاتا ہے۔ نرسری ایک کارخانے اور ایک تعلیمی مشین کا نام ہے۔ سٹانسلا گسٹراوو وچ سٹرولین (۱۸۸۷ء-۱۹۷۴ء) جو معروف روسی ماہر تعلیم اور طویل عرصے تک

روسی حکومت کا ایک کارپرداز رہا ہے۔ اس نے ۱۹۲۰ء کے عشرے میں لکھا۔ "تعلیم کی سماجی حیثیت کا مطلق فائدہ اسی وقت اٹھایا جاسکتا ہے کہ ہم اس کی شکل کو پندرہ بیس سال کے اندر اندر اس طرح بدل دیں کہ جھولے سے بلوغت تک تمام شہری اس سے آگاہ ہو جائیں۔

یہ اعلیٰ درجے کا دانشور فخر کے ساتھ اپنا خوفناک خیال بیان کرتا ہے :

"ہر روسی شہری جو ہسپتال میں جنم لے اس کو گوشہ اطفال میں بھیج دیا جائے پھر ابتدائی تعلیم کے سکول (Kindergarten) یا نونہالوں کے اقامت گھر (All Day Children's Home) پھر اقامتی سکول اور پھر وہاں سے ایک آزاد زندگی کے آغاز کے لئے ایک کارخانے یا اعلیٰ تعلیم کے ادارے میں شامل کر دیا جائے"۔

ہمیں یہاں کہیں ماں یا خاندان کا ذکر نہیں ملتا ظاہر ہے جس کا وجود ہی باقی نہیں رہنے دیا گیا اس کا ذکر کیوں ہو۔ تعلیم کی جگہ انسان کی نشوونما کا ذکر ہے گویا انسان کی پرورش بھی ایک ٹیکنالوجیکل کام ہے جس طرح کہ مرغی کے چوزوں کی پرورش ہوتی ہے۔ خاندان کے متعلق اس "مہذبانہ" رویے کا نقطہ عروج ملاحظہ کرنا ہو تو مارکس کی کتاب "سرمایہ" میں اس کے یہ الفاظ پڑھیے۔

"دونوں اصناف کے بچوں کو سب سے پہلے ان کے والدین ہی سے بچا کر رکھا جائے"۔

کچھ ایسے اشارات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سوویت یونین خاندان کے متعلق اپنے رویے کو تبدیل کر رہا ہے۔ اصولوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ آیا سٹروِ میلین یا انجلز کا خاندان کے متعلق مبغوضانہ رویہ صحیح ہے یا غلط ہے، لیکن کیا انجلز خاندان کے متعلق اس کے سوا کوئی اور رویہ اختیار کر سکتا تھا۔ ایک مستقل تمدن سے انجلز یہ نتائج اخذ کر رہا تھا اور یہ تمدن خیالی ریاست کے تصورات کے ماتحت تھا اور ثقافت کو اس وقت تک مکمل طور پر سمجھا نہیں جاسکتا جب تک یہ انسان کی

شخصیت کو مکمل طور پر تباہ و برباد کر کے نہیں رکھ دیتی۔ اس طرح کا آدمی اس کی میکانیت' اس کے ڈھانچے' اس کے اداروں' اس کی اجتماعیت' اس کے عمومی مفادات' ریاستی انصاف اور نظم و ضبط وغیرہ میں فٹ نہیں بیٹھتا اور اسی وجہ سے آندرے وزنیسکی کے الفاظ میں "انسان اور جبری مشقت" کے درمیان نہ ختم ہونے والی جنگ جاری ہے۔

شادی' خاندان' تعلیم' والدین' بوڑھے لوگ ان سب کا تعلق ہمارے "فلسفہ انسانیت" سے ہے۔ میثاق ازدواج (مثال کے طور پر سویڈن میں) ایک الگ چیز ہے اور کیتھولک شادی کا بندھن' ایک دوسری چیز ہے۔ اس سوال کو ایک طرف رکھتے ہوئے کہ ان میں سے شادی کا کون سا معاہدہ زیادہ سودمند ہے ہم تو صرف یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ منطقی فلسفے میں شادی کو ایک "سودا" قرار دیا گیا' جبکہ مسیحی شادی کو ایک مقدس عہد اور پیمان سمجھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب اینجلز نے خاندان کی "موت" کا اعلان کیا تو اس کے نقطۂ نظر سے یہ غلط نہیں تھا' تاہم سرکاری فلسفے کے نقطۂ نظر سے وہ سوویت ماہرین عمرانیات جو "پیارے پرانے خاندان" کو دوبارہ بحال کرنا چاہتے تھے۔ مثال کے طور پر (ڈاکٹر الرائیس وغیرہ) ان کی نظر سے اینجلز کی سوچ غلط ہے' چونکہ اگر انسان ایک مکمل جانور ہے تب ماہر تعلیم سٹرولیلن نے جو طریقہ کار وضع کیا ہے وہی بہترین ہے۔

ہمیں نہیں معلوم اس نادر و نایاب صنعت میں انسان کی اندرونی سچائی نے کیا شکل اختیار کی' لیکن ہم جانتے ہیں کہ مقدار میں روز افزوں اور پریشان کن زوال ہو رہا ہے۔ ایک عورت بچے کو جنم دینے کے لئے تیار نہیں ہے' چونکہ یہ بچہ اس سے فوراً چھین لیا جائے گا۔ تمام نام نہاد مہذب ممالک میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ شرح پیدائش یا تو منجمد ہو چکی ہے یا اس میں کمی واقع ہو رہی ہے اس کی وجہ یا تو ماؤں کی حالت ہے یا یہ خواہش کہ ذمہ داریوں سے پاک آسانی سے گزرنے والی زندگی میں "بچے کی مداخلت" نہ ہونے دی جائے اور اس کی حقیقی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ مذہبی اور تہذیبی سرگرمیوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بہت سے یورپی ممالک میں شرح آبادی واضح طور پر کم ہو رہی ہے

اور منفی ہوتی جارہی ہے۔ پائرے سونے جو سوبورن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں دعویٰ کرتے ہیں کہ "سفید نسل" کو ختم ہوجانے کا خدشہ لاحق ہے۔ اس کے بیان کے مطابق جرمنوں کے اندر شرح پیدائش اس قدر کم ہے کہ ممکن ہے اگلی صدی کے آغاز میں وہ بالکل ختم ہوچکے ہوں۔ آبادی کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ فرانس کی آبادی جو اب پانچ کروڑ بیس لاکھ ہے اکیسویں صدی کے پہلے نصف میں صرف ایک کروڑ ستر لاکھ رہ جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اعداد و شمار مبالغے پر مبنی ہوں' لیکن گوشواروں سے تو یہی ثابت ہوتا ہے۔ ۱۹۷۶ء تک جرمنی میں رہائش پذیر لوگوں کی تعداد میں اعشاریہ تینتیس فیصد تک کمی آگئی تھی' جبکہ ۱۹۷۵ء میں یہ کمی دو لاکھ تھی۔ ۱۹۷۴ء کی نسبت ۱۹۷۵ء میں یہ کمی اعشاریہ چھپن فیصد تھی۔ مغربی برلن میں یہ کمی ۱۷ فیصد تھی۔

سویڈن کی پارلیمنٹ نے یہ ضروری محسوس کیا کہ اپنے ایجنڈے میں ذہنی طور پر معذور یا مختل لوگوں کی تعداد میں اضافے پر غور کرے اور یہ ایک ایسا ملک ہے کہ جہاں بچوں کی شرح اموات کم از کم ہے' جہاں عمومی زندگی کا اوسط طویل ترین ہے' جہاں تمام درجوں میں تعلیم مفت ہے' جہاں پچھلے ۱۵۰ سال سے امن قائم ہے' جہاں آبادی کے دباؤ کا مسئلہ نہیں ہے' جہاں مزدوروں کی پیداوار ساری دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور فی کس آمدنی بھی دنیا کے سب سے زیادہ فی کس آمدی والے ممالک کے برابر ہے۔ ڈاکٹر ہانس لومان جو ایک معروف ماہر نفسیات ہیں ان کے ذمے سویڈن کی پارلیمنٹ نے یہ کام لگایا کہ وہ دیکھیں کہ "ان ذہنی امراض" کی کیا وجہ ہے؟ ان کا کہنا یہ ہے کہ خاندان کے وسیع و عریض شیرازے کے بکھرنے سے یہ مسئلے کھڑے ہوئے ہیں۔ سویڈن میں پچاس فیصد ملازم مائیں ایسی ہیں جن کے بچوں کی عمریں تین سال تک ہیں اور ستر فیصد ملازم مائیں ایسی ہیں جن کے بچوں کی عمریں سترہ سال تک ہیں۔ اپنی رپورٹ میں لومان لکھتے ہیں "ہم نے اپنے بچوں کے لئے غیر معمولی طور پر سرد' دشمن اطفال معاشرہ بنایا ہوا ہے" ذہنی امراض کے بڑھنے کی یہی وجہ ہے۔

۱۹۷۶ء میں جو اعداد و شمار اور رپورٹیں شائع ہوئیں ہم اس میں دیکھ سکتے ہیں کہ سویڈن میں ہر دوسرا بچہ ہی آخری بچہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی صورت حال چیکوسلواکیہ کی ہے۔ شادی شدہ جوڑے تین یا زیادہ بچوں کی موجودگی کو "اسراف" اور "غیر منطقی" سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں آبادی کے اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ ۱۹۹۰ء تک سویڈن اس قابل نہ ہو گا کہ اپنی آبادی میں معمول کا اضافہ بھی جاری رکھ سکے۔

موجودہ تمدن و ثقافت نے عورت کو تعریف یا استعمال کی چیز بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس نے عورت کو اس کی شخصیت سے محروم کر دیا ہے اور عورت کے اندر قابل تعریف اور قابل احترام چیز اس کی شخصیت ہی ہے۔ یہ صورت حال بارہا مشاہدے میں آئی ہے' لیکن "حسن کے مظاہروں" یا خالصتاً خواتین کے کچھ پروگراموں مثلاً ماڈلنگ (اشتہار بازی) میں تو یہ اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس میدان میں عورت کی کوئی شخصیت باقی نہیں رہ جاتی' بلکہ وہ تو انسان بھی باقی نہیں رہ جاتی۔ اور "خوبصورت جانور" کے سوا اس کی کوئی شناخت باقی نہیں رہتی۔

ثقافت نے 'مادریت' کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ اس ثقافت نے عورت کو ماں کے لقب سے پکارنے کی بجائے سیلز گرل' ماڈل' دوسرے لوگوں کے بچوں کی استانی سیکرٹری اور صفائی کرنے والی عورت کا لقب دینا زیادہ مناسب خیال کیا۔ یہ ثقافت ہی تھی جس نے ماں کے مقام اور ذمہ داری کو غلامی قرار دے کر اسے اس غلامی سے نجات دلانے کا وعدہ کیا۔ یہ ثقافت اس چیز پر فخر کرتی ہے کہ اس نے اتنی عورتوں کو خاندان اور بچوں سے آزاد کر کے "ملازم پیشہ" بنا دیا ہے۔ اس کے برعکس مذہبی تہذیب نے ہمیشہ عورت کو ماں کے درجے میں عظیم الشان احترام بخشا ہے۔ اس نے اسے ایک علامت' ایک راز اور ایک مقدس ہستی بنایا ہے۔ تہذیب نے ماں کی شان میں بہترین عقیدے اور اشعار لکھوائے ہیں۔ اس تہذیب نے موسیقی تخلیق کرائی ہے۔ شاندار پینٹنگز تصاویر اور مجسمے بنوائے ہیں۔ جبکہ موجودہ تمدن میں ماں سے نفرت جاری ہے۔ پکاسو نے اپنی

شاندار تصویر ماں کی مادریت کے متعلق ہی بنائی اور ماں کے تصور کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اس نے کہا کہ تہذیب' تمدن اور ثقافت کے لئے ماں ابھی تک زندہ ہے۔ بوڑھوں کے لئے گھر اسی طرح ہیں جس طرح بچوں کے لئے ہیں۔ ان کا اشیاء کی اسی ترتیب سے تعلق ہے اور حقیقت میں یہ ایک ہی حل کی دو شکلیں ہیں۔ بچوں کے گھر اور بوڑھوں کے گھر ہمیں مصنوعی زندگی اور مصنوعی موت کا تاثر دیتے ہیں۔ دونوں کی نمایاں خصوصیت آرام و سہولت کی موجودگی اور انسانی زندگی میں عورت کا بدلا ہوا کردار ہے۔ ان دونوں کی مشترکہ خصوصیت ماں باپ کے تعلقات کا خاتمہ ہے۔ ایک گوشہ اطفال میں بچے والدین کے بغیر ہوتے ہیں' بوڑھے لوگوں کے گھروں (Old Houses) میں والدین بچوں کے بغیر ہوتے ہیں۔ یہ دونوں قسم کے "گھر" بظاہر ثقافت کی شاندار پیش کش ہر قسم کی مثالی خیالی ریاست کا نمونہ ہیں۔

خاندان' ماں کے ساتھ ایک مذہبی تصور پیش کرتا ہے بالکل اس طرح جیسے نرسری اور اس کے ملازمین اس سے متعلق ہوتے ہیں۔

باب ششم

موسیٰ علیہ السلام، مسیح علیہ السلام
محمد صلی اللہ علیہ وسلم

❏ یہاں اور ابھی :

آنحضرت ﷺ دین اسلام کے بانی نہیں ہیں۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام کی دو تاریخیں ہیں، ایک تاریخ آنحضرت محمد ﷺ سے پہلے کے دور کی ہے اور ایک تاریخ آنحضرت ﷺ کے دور سے شروع ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے دور اور اس کے بعد کی تاریخ کو بڑی تنگ نظری کے ساتھ تاریخ اسلام قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ سے پہلے کی تاریخ اسلام کو پڑھے بغیر اسلام کی مکمل تاریخ کو سمجھنا ناممکن ہے۔ خصوصاً اس دور کے مطالعے کے بغیر تو بات سمجھی ہی نہیں جاسکتی جس دور میں یہودیت اور نصرانیت کا ظہور ہوا ہے(۱)۔

---

(۱) یہودیت اور نصرانیت اصلاً اسلام تھے۔ ان کے پیروکاروں نے تحریف کرکے اسلام کو کبھی یہودیت بنادیا اور کبھی نصرانیت۔

الف ۔ صدوقی، زدوک کے پیروکار ہیں۔ یہ فرقہ ان لوگوں پر مشتمل ہے بقیہ آگے ہے

یہودیت' نصرانیت اور اسلام موجودہ معلوم تاریخ میں ان تین مذاہب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان مذاہب کے ذریعے ہی انسان تاریخ کا محور بنارہا ہے اور اس نے انسانیت کو مجموعی طور پر سمجھنا سیکھا ہے۔ ان مذاہب کے ذریعے ہی انسان نے اندرونی اور بیرونی زندگی' ظاہری اور باطنی ترقی' ان کے باہمی تعلق اور ان کی حدود کو سمجھا ہے۔ یہودیت اور نصرانیت دونوں کی تاریخی کامیابیوں اور ناکامیوں کے بعد ہی انسانیت اسلام کے فیصلہ کن تجربے سے روشناس ہوئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام' عیسیٰ علیہ السلام' اور آنحضرت محمد ﷺ تینوں انسانیت کے راہنما اور یکساں قابل احترام ہیں۔

یہودیت "یہ دنیا" رجحان کی عکاسی کرتی ہے۔ یہودی ذہن کے تمام خیالات اور نظریات "زمین پر جنت" کے گرد گھومتے ہیں۔ "کتاب یعقوب" اس تمنا' خواہش' اظہار اور خواب کا نام ہے کہ انصاف ہونا چاہیے اور انصاف کے عمل کو زمین پر ہی پورا ہونا چاہیے۔ دوسری دنیا میں نہیں' بلکہ ابھی اور یہیں۔

زندگی بعد موت کے تصور کو مکمل طور پر یہودیوں نے کبھی بھی تسلیم نہیں کیا ہے۔ صدوقیوں نے تو اس کا انکار مسیح علیہ السلام کے زمانے میں بھی کردیا تھا۔ میمون جو کہ قرون وسطیٰ میں یہودیت کا سب سے بڑا مفکر رہا ہے' کہتا ہے کہ : ابدی زندگی ایک غیر متعلق بات ہے اور یہ اپنے ہی تصور کی نفی ہے {۲} جسے ایک اور معروف یہودی مفکر بینیڈکت دی سپینوزا' مزید آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ : عہد نامہ قدیم حیات بعد الموت کے بارے میں خاموش ہے۔ رینان اور اس کے بعد بردی یو نے بالکل صحیح

جو قدیم یہودیوں پر مشتمل مذہبی وسیاسی جماعت ہے ۔ انہوں نے برسراقتدار گروہ کی نمائندگی کی' انہوں نے موسوی شریعت پر کامل انحصار کیا۔

{۲} Moses ben Maimon The Guide of the perplexed' trans. Shlomo Pines (Chicago : 1963).

نشاندہی کی ہے کہ یہودی ابدی زندگی کے تصور کو سمجھنے کی اہلیت ہی سے محروم ہو گئے تھے 'کیونکہ یہ تصور ان کے "اس دنیاوی" تصور سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ مسری گریکاز کہتا ہے کہ مادہ خدا کا جسم ہے۔ سپینوزا کی مثال کے ذریعے یہ سمجھنا ممکن ہے کہ یہودیت کے وجود میں ایک نئے مادہ پرستانہ فلسفے نے جنم لیا ہے یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اپنی روایت کے مأخذ سے اس کا خمیر اٹھا ہے' ایسی روایت کہ جب اس کا موازنہ قومی' سیاسی امور اور انسانی معاملات کے تناظر میں کیا جائے تو یہودیت بہت کھوکھلی محسوس ہونے لگتی ہے اور یہ صورت حال مسیحیت سے انتہائی مختلف ہے۔ سپینوزا کی تحریروں میں یہ ممکن ہے کہ جہاں جہاں "خدا" کا لفظ آیا ہے وہاں فطرت" کا لفظ رکھ دیا جائے اور وہ اس کے لئے وضاحتیں بھی پیش کرتا ہے۔ خدا کے تصور سے ذاتی' انفرادی اور شعوری خصوصیات ہٹانے کے بعد وہ خدا اور فطرت کے تصور کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ اس کو یہودیت سے خارج کردیا گیا تھا اس کے باوجود وہ ایک مصدقہ یہودی تھا۔

مسیح علیہ السلام سے قبل یہودی خدا کی جس سلطنت کی پیشین گوئیاں کرتے رہے تھے مسیح علیہ السلام اسی سلطنت کو آسمانوں میں نہیں' زمین پر عملی شکل دینے کے لئے تشریف لائے تھے۔ یہودی ادب میں مسیح علیہ السلام کو انصاف کا قاتل قرار دیا جاتا رہا ہے۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ مسیح علیہ السلام نبی نہیں ہے جو آزمائش کا شکار بنتا اور مرجاتا ہے' بلکہ وہ ایک قومی ہیرو ہوگا جو منتخب لوگوں کی حکومت کو زمین پر قائم کردے گا۔ وہ دنیا جس میں انصاف پر چلنے والا شخص بے دست وپا ہو یہودیوں کے نزدیک لایعنی تصور ہے۔ یہودی نظام انصاف اور کسی بھی سماجی نظام میں یہی بنیادی اصول کام کر رہا ہے۔ زمین پر جنت بنائے جانے کا خیال اپنی اصل کے لحاظ سے یہودیت سے مشتق ہے۔ "یہودی تاریخ ماضی میں بھی اور حال میں بھی اس طرز پر مبنی ہے کہ اس کے اندر دبے ہوئے اور بدنصیب لوگوں کے لئے ہر دور میں ایک اپیل رہی ہے۔ سینٹ آگسٹائن نے یہی طریقہ

مسیحیت میں اور مارکس نے اشتراکیت میں متعارف کرایا"۔(۳) تمام انقلابات' خیالی جنتیں' اشتراکی نظریات اور وہ دیگر نظریات جن کا تعلق زمین پر جنت بنانے' تعمیر کرنے یا زمین کو جنت میں بدل دینے سے ہے ان سب کا سرچشمہ عہد نامہ قدیم کا تصور جنت ہے۔

فری میسن نظریہ کہ انسانیت کا اخلاقی انقلاب سائنس کے ذریعے ممکن ہے یہ بھی یہودی تصور ہے۔ اگر نظریہ اثبات، فری میسنری اور یہودیت کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کا کھوج لگایا جائے تو بہت سی چیزیں یکساں محسوس ہوں گی۔ یہ اثرات روحانی بھی ہیں اور مادی بھی۔

سومبارٹ کے الفاظ میں "یہودیت" کی تاریخ دنیا کی کاروباری ترقی کی تاریخ ہے۔ نیوکلیائی سائنس شروع میں "یہودی سائنس" کہلاتی رہی ہے۔ فلسفہ افضاد پر بھی یہی عنوان چسپاں کیا جاسکتا ہے۔ مغرب کی تاریخ میں ایسا ہی ہوا ہے۔ بقول برٹرینڈ رسل قرون وسطیٰ کے تمام عرصے میں مسیحی ممالک پر یہودی کوئی تہذیبی اثر نہ ڈال سکے۔(۴) جس لمحے ثقافت کے اندر حضرویت کا غلبہ ہوتا ہے وہیں یہودی نظر آنے لگتے ہیں۔ تاریخ میں یہودیوں کی بستیاں ہر بڑے شہر میں قائم ہوتی رہی ہیں۔ صیدون' انطاکیہ' یروشلم' اسکندریہ' کارتھیج اور روم قدیم دنیا میں اور قرطبہ' غرناطہ' طلیطلہ اور اشبیلیہ مسلم ہسپانیہ میں ایمسٹرڈم' وینس اور مارسیلز نشاۃ ثانیہ کے آغاز میں اور آج دنیا کے تمام بڑے شہر خصوصاً امریکہ کے شہروہ مراکز ہیں جن پر یہودیت کی تاریخ استوار ہوئی ہے۔ ایک دلچسپ بات کا ذکر کیا جانا بھی ضروری ہے کہ کولمبس کے سفر کے اخراجات مسلمانوں نے مہیا کئے تھے اور اس طرح انہوں نے براہ راست ایک نئی دنیا کی دریافت کے کام میں حصہ لیا تھا۔

---

(۳) Werner Sombart: The Jews and Modern Capitalism trans M.Epstein (Gleucose il: Fress Press 1951).

(۴) Sombart. : Les Juifs dans la vie economique.

مسلمانوں نے تہذیب کو بہت شروع سے ترقی دی تھی' جبکہ ایک عجیب و غریب کہانی یہ بھی سنائی جاتی رہی ہے کہ کولمبس یہودی تھا۔ جدید ترین ایٹمی دور کا بابائے اعظم آئن سٹائن بھی یہودی تھا۔ تمام کی تمام مثالوں میں یہودی ظاہری دنیاوی ترقی کے علمبردار رہے ہیں جس طرح مسیحی روحانی بالیدگی کے علمبردار رہے ہیں۔

□ پاک مذہب :

یہودیوں کی مادہ پرستی نے انسان کے ذہن کو دنیا کی طرف موڑ دیا۔ یہودیوں کی تاریخ میں 'سود' کی نشوونما اسی خیال کے سبب ہوئی۔ مسیحیت نے اس کے برعکس روح کی بالیدگی کا پیغام دیا۔

عیسائیت کی تعلیمات کے مطابق انسانی توانائی دو متضاد سمتوں میں ضائع نہیں کی جانی چاہیے اور یہ متضاد سمتیں جنت اور دنیا ہیں۔ کوئی بھی شخص دو آقاؤں کی خدمت نہیں بجا لاسکتا' کیونکہ وہ یا تو ایک سے محبت کرے گا اور دوسرے سے نفرت کرے گا یا ایک کی عزت کرے گا اور دوسرے کو حقیر جانے گا۔ تم خدا اور شہنشاہ کی عبادت بیک وقت نہیں کرسکتے۔ {۵} ٹالسٹائی نے اسی خیال کو مزید آگے اس طرح بڑھایا ہے :

"انسان اپنی روح اور اپنی دنیاوی فلاح کے لئے بیک وقت کام نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی شخص مادی اشیاء کے پیچھے دوڑتا ہے تو روح کو فراموش کردیتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی روح کو بچانا چاہے تو دنیاوی سازوسامان سے محروم رہ جاتا ہے۔ بصورت دیگر فرد ٹوٹ جاتا ہے اور نہ ایک چیز حاصل کرپاتا ہے' نہ دوسری ...... انسان تمام رکاوٹوں سے دور رہ کر اور اپنے جسم کو دور رکھ ——

{۵} متی ۲۴ ـ ۶

کر آزادی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان مال' دنیاوی مرتبے اور شہرت کے ذریعے اپنے جسم کو سیر کرنے کی کوشش کرتا ہے ــــ اور ان ذریعوں سے مطلوبہ آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس آزادی کے راستے میں مزید رکاوٹیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ زیادہ آزادی حاصل کرنے کے لئے انسان نے اپنے گناہوں' جذبات اور اوہام کے ذریعے ایک جہنم تعمیر کرلی ہے اور اپنے آپ کو اپنی خواہشات کی جیل کی قید میں محصور کرلیا ہے {۶}۔

"کلیسا کے تمام اہم عہدیداران نے عہدنامہ قدیم اور عہدنامہ جدید کے درمیان ایک واضح فرق کا تذکرہ کیا ہے۔ کچھ مصنفین کے نزدیک مرقس صحیفہ جوکہ مرقس کے لئے ایک نمونہ بنا اس میں لکھا ہوا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کو ترک کیا اور مسیح علیہ السلام نے "یہوواہ" انصاف کا خدا اور ظاہری دنیا کا نجات دہندہ کی جگہ محبت کرنے والے خدا کا تصور پیش کیا جس نے نظر نہ آنے والی دنیا پیدا کی۔ کاؤشد کے مطابق اس انجیل میں دوسری انجیلوں سے کہیں زیادہ واضح انداز میں ترک دنیا' عدم تشدد اور گناہوں سے بچنے کی تعلیمات موجود ہیں۔

آغاز ہی سے مذہب صرف ظاہری دنیا کو چمکانے یا تبدیلی کرنیکے خیال سے الگ رہتا ہے۔ خالص مذہب مذہبیت سے زیادہ انسان کے اندر کی تبدیلی چاہتا ہے۔ انجیل میں بیان ہوا ہے:

"اپنی زندگی کے بارے میں مت سوچو کہ تم کیا کھاؤ گے' کیا پیو گے

{۶} Leo Tolstoy: "The Chiristian Teachings" ed. Leo Wiener vol. 22: The Complete works of count Tolstoy (New York: AMS Press 1968)

.... "اگر تمہاری داہنی آنکھ تمہاری خلاف ورزی کرے' تو اسے نکال پھینکو' اور اگر تمہارا داہنا ہاتھ تمہاری خلاف ورزی کرے' تو اسے کاٹ پھینکو"۔

"جو شخص کسی بھی عورت کی طرف جنسی خواہش کے میلان سے دیکھتا ہے تو اس نے اپنے دل میں زنا کا ارتکاب کرلیا" {۷}۔

"کیونکہ یہ لکھ دیا گیا ہے کہ میں دانا شخص کی دانائی کو تباہ و برباد کردوں گا اور زیرک شخص کی زیرکی کو بے مقصد بنا دوں گا۔ عقل مند کہاں ہیں؟ فقیہ کہاں ہیں؟ اس کائنات میں فساد ڈالنے والے کہاں ہیں؟....." {۸}

"اور لوگوں نے اس سے پوچھا' تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اس نے جواب دیا اور انہیں مخاطب کرکے کہا' جس کے پاس دو چوغے ہوں وہ ایک چوغہ اسے دے دے جس کے پاس ایک بھی نہیں ہے اور جس کے پاس ضرورت سے زیادہ گوشت ہے وہ بھی ایسا ہی کرے"۔ {۹}

یہاں انجیل کی آیات اور اشتراکیت کے اصولوں میں ظاہراً مشابہت پائی جاتی ہے' کیونکہ یہاں ریاست کے احکام اور حکومت کے اصول بیان نہیں کیے جارہے ہیں' بلکہ ایک شخص اور اس کی روح موضوع گفتگو ہے۔ مذہب دینے کی ترغیب دیتا ہے اور چھیننے کو حرام ٹھہراتا ہے۔ علاوہ ازیں دلوں کی کیفیت کا اپنا مقام ہے۔

مذہب جس راستے کا دعویدار ہے وہ مشکل بھی ہے اور صرف مخلص لوگوں کے لئے ہے۔ جب قرآن کہتا ہے { لا یکلف اللہ نفسا الا وسعہا } (اللہ کسی نفس پر اس کی قوت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا)۔ {۱۰}

{۷} متی۔ ۳۱-۶' ۲۹-۵' ۲۸-۵

{۸} پولوس....۱' کرنتھیون ۱۹-۱ حاشیہ (۹) - (۱۰) آگے ہے

تمام پاک مذاہب نے دو راستے یا دو پروگرام پیش کیے ہیں۔ بدھ مت میں "مہاینا" (عظیم راستہ) کو شدید اور مشکل راہ گزر قرار دیا گیا ہے جو کہ غالب طبقے کے لئے مخصوص ہے اور "ہنایانا" (چھوٹا راستہ) کو آسان' کم فاصلے والا اور عام لوگوں کے لئے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ {۱۱}اس قسم کی اخلاقی تقسیم مسیحیت میں بھی پائی جاتی ہے۔ ایک طرف پاپائیت ہے اور قوانین ہیں۔ دوسری طرف عام لوگ اور ان کی عامیانہ زندگی ہے۔۔ اسی طرح ترک دنیا راہبوں اور پادریوں کے لئے ہے' جبکہ عام لوگوں کے لئے شادی ہے۔ ترک دنیا کو اصلی حل اور شادی کو ایک مفاہمت قرار دیا گیا ہے۔

تشدد کے سامنے دیوار تعمیر کرتے ہوئے مسیحیت خاص طور پر اور دیگر مذاہب عام طور پر کوئی ایسے اثرات مرتب نہ کرسکے جو انسان کی معاشرتی حالت کو بہتر بنا سکتے۔ معاشرتی تبدیلیاں دعاؤں اور اخلاقیات کے ساتھ وقوع پذیر نہیں ہوسکتیں' بلکہ اس کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے پیچھے خیالات کی قوت ہو یا عمل کی قوت نافذہ ہو۔ عام طور پر الزام لگایا جاتا ہے کہ زمانے میں جو بھی حالت چل رہی ہو مذہب اس کی معاونت کرتا ہے۔ لیکن یہ الزام موجودہ مسیحیت کے لحاظ سے اخلاقی طور پر تو غلط' لیکن تاریخی طور پر درست ہے۔ اگر لفظ "عملی" پر غور کیا جائے تو عیسائیت عملی' نہیں ہے اور نہ ہی اس کو اس لحاظ سے جانچا جانا چاہیے۔ قرآن اسے اعلان قرار دیتا ہے اور انجیل اسے بشارت قرار دیتی ہے۔

"اپنے ہمسائے سے اسی طرح محبت کرو جس طرح اپنے آپ سے کرتے ہو"۔ "اپنے دشمن سے محبت کرو' جو لوگ تمہیں برا بھلا کہیں ان سے شفقت

{۹} لوقا ۱۰۔ ۳

{۱۰} قرآن پاک سورہ البقرۃ آیت ۱۸۳

{۱۱} Daisetz Teitaro Suzuki : Studies in the lankavatava sutra.

سے پیش آؤ"۔ یہ اعلانات انسان کی عملی زندگی کے اس قدر خلاف جاتے ہیں کہ وہ ہمیں ایک اور دنیا کی طرف لے جاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت میں اور دنیا کے بارے میں اعلان کر رہے ہیں جیسا کہ مسیح علیہ السلام نے کہا تھا۔ "میری سلطنت اس دنیا کی نہیں ہے"۔ {۱۲}

اناجیل کی صاف اور واضح ہدایات تاریخ کے ایک اہم موڑ کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ انسانیت کی اہمیت واضح ہوئی اور اس کے ذریعے "تاریخی" نہیں بلکہ "معیاری" تاریخ کی اہمیت اجاگر ہوئی۔ اس لحاظ سے مسیح علیہ السلام کا ظہور تاریخ انسانی کا "سنگ میل" اور "دنیا کے لئے نشانی" ثابت ہوا اور مسیح علیہ السلام نے جن تصورات اور خواہشات کا اعلان کیا وہ تمام کی تمام اس وقت سے متحد ہوگئیں۔ مغربی ثقافت اپنے تمام تر شکوک و شبہات و انحرافات کے باوجود مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کی تصدیق اپنے اندر رکھتی ہے۔ فرد اور معاشرے کے ابتدائی تضادات جو روٹی یا آزادی' تمدن یا ثقافت کے عنوانات سے ظہور پذیر ہوئے۔ ان میں مسیحی روایت کے پابند یورپ نے ہمیشہ دوسرے انتخاب کی پیروی کی۔

❑ مسیح علیہ السلام پر ایمان اور مسیح علیہ السلام کا انکار :

مذہب دنیا پر اسی وقت اثر انداز ہو سکتا ہے جب یہ "دنیاوی" بن جائے۔ سیکولر بن جائے۔ اس دنیا کا بن جائے۔ یعنی یہ وسیع تر معنوں میں "سیاسی" بن جائے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مسیحیت کی تکمیل یہی تو ہے' لیکن دنیا کے بارے میں اس نے اپنے آپ کو از سر نو تشکیل دیا ہے۔ یہ تعریف دونوں مذاہب کے بارے میں شبہات اور اختلافات کو واضح کر دیتی ہے۔

{۱۲} John ۱۸ -- ۳۶

اسلام یہودیت کی اچھی باتیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور ہیگل نے مذاہب کی درجہ بندی کرتے ہوئے اسلام کو یہودیت کا تسلسل قرار دیا ہے۔ اس کی یہ رائے اس کے مسیحی نقطہ نظر کے زیر اثر قرار دی جاسکتی ہے۔ {۱۳} اسی طرح سپینگلر کے نزدیک صحیفہ ایوب' ایک اسلامی تحریر ہے۔ مرکا ایلیڈا اپنی کتاب Patterns of Comparative Religions میں آنحضرت محمد ﷺ کو انسانیت کی روحانی ترقی کے دوسرے اور تیسرے دور کے درمیان نقطۂ اتصال قرار دیتا ہے۔

تیسرا (آخری) دور جس کا ابھی تک خاتمہ نہیں ہوا اور جو ابھی تک جاری ہے اس کا نقطہ آغاز آنحضرت محمد ﷺ ہیں۔ ایلیڈا کے بیان کے مطابق' انسانیت کی تاریخ عمومی لامذہبیت کی تاریخ ہے۔ اس تصور میں آنحضرت محمد ﷺ مذہب کی فتح اور نئے آزاد دور کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ اس طرح آنحضرت تاریخی عدل کے نقطۂ انعکاس پر کھڑے ہیں۔ {۱۴}

ایلیڈا کے تاریخی نقطہ نظر کو ایک طرف رکھتے ہوئے (جو کہ اس کتاب کے نقطۂ نظر سے غیر متعلق ہے)' ہم اسلام اور آنحضرت محمد ﷺ کے درمیان "مقام" کو اس زمانے کی سب سے بڑی روشنی قرار دے سکتے ہیں۔ اس کی وضاحتیں اور تاویلات مختلف ہوسکتی ہیں' لیکن اس نقطہ نظر سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔

جناب مسیح علیہ السلام نے بیت المقدس (یروشلم) سے احتراز کیا کیونکہ دوسرے

{۱۳} George W.F. Hegel : Early Theological writings trans. T.M. Knox and Richard Kroner.

(Philadephia : University of Pennsylvania Press 1971).

{۱۴} Oswald Spengler : The decline of the west.

New York : A A Knopf 1926

شہروں کی طرح یہ شہر بھی فریسیوں' کاہنوں' مشرکوں' ملحدوں' اور منافق پیروکاروں سے بھرا پڑا تھا۔ اشتراکیت دیہاتیوں سے خطاب نہیں کرتی' بلکہ بڑے شہروں کے رہنے والوں کو اپنا مخاطب بناتی ہے۔ آنحضرت محمد ﷺ غار حرا میں جاتے' لیکن بار بار مکہ کے بے خدا شہر میں لوٹ آتے تاکہ اپنے مشن کو پورا کر سکیں۔

اس کے باوجود مکہ میں جو کچھ ہوا اس کو اسلام قرار نہیں دیا جا سکتا' اسلام اپنے عروج پر مدینہ میں پہنچا' غار حرا میں آنحضرت محمد ﷺ ایک راہب' ایک صوفی اور ایک حنیف شخص کی طرح جاتے تھے"۔ {۱۵}

مکہ میں آپ ﷺ دین حق کی آواز تھے اور مدینہ میں آپ ﷺ دین حق کا نقارہ اور نقیب بن گئے۔ وہ پیغام جو آنحضرت محمد ﷺ لائے تھے اس نے اپنی جامع اور کامل شکل مدینہ میں اختیار کی۔ مکہ میں نہیں ---- مدینہ میں اسلامی سماجی نظام کا آغاز اور تکمیل ہوئی۔ {۱۶}

آنحضرت محمد ﷺ کو غار حرا سے لوٹنا پڑا۔ اگر آپ واپس نہ پلٹتے تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم حنیف رہتے۔ جیسے ہی آپ ﷺ واپس آئے۔ آپ نے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ اسلام کا آغاز تصوف سے اور اختتام ریاست سے ہوا۔ مذہب نے دنیا کی حقیقت کو تسلیم کیا اور اسلام کی شکل اختیار کر لی۔

انسان اور اس کی روح ---- یہی رشتہ آنحضرت محمد ﷺ اور مسیح ناصری علیہ السلام میں ہے۔ مقدس صحائف اور روح میں فطرت کی یکسانیت ہے۔ اپنی اصل میں وہ ایک ہی راز رکھتے ہیں ..... مقدس صحائف اور روح علامتی طور پر ایک دوسرے کی نمائندگی بھی کرتے ہیں اور باہم ایک دوسرے پر روشنی بھی ڈالتے ہیں۔ {۱۷} اسلام

{۱۵} حنیف وہ شخص ہے جو باطل عقائد کو چھوڑ کر سیدھے دین پر چلے۔

{۱۶} آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور نعمت تمام کر دی۔ القرآن۔ (۱۷ آگے)

انسان کی روحانی تکمیل کا نام ہے۔ اسلام کے اندر انسان کی طرح "خدائی شعلہ" مشتعل ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ زندگی کی تشریح بھی ہے۔ اس کے بہت سے پہلو اور گوشے ایسے ہیں جن کی شعراء اور رومانویت پسند وضاحت نہ کرپائیں۔ قرآن ایک حقیقت پسند اور غیر شاعرانہ کتاب ہے۔ فرشتوں کا انسانوں کے آگے جھک جانا، خدا نے بندوں کو سکھایا ہے اور اولین انسان کو یہ سکھایا گیا کہ تمام اشیاء کے نام سیکھ لے اور اس سے انسان کی زندگی اور اس کے مظاہر کی جامد اور مقید معلوم اشیاء پر برتری ظاہر ہوتی ہے۔

مسیحیت ایک خدا کے کامل تصور تک کبھی بھی نہیں پہنچی ہے۔ حقیقت میں مسیحیت کے پاس خدائی کے بارے میں وسیع تصور ہے، لیکن خدا کے بارے میں واضح تصور نہیں ہے۔ آنحضرت محمد ﷺ کا مشن یہ تھا کہ مقدس صحائف کے ذریعے خدا کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کو انسانی فکر و ذہن کے لئے مزید وضاحت سے پیش کیا جائے۔ "اللہ" "خدا" ہے جو ہماری روح کی پکار اور ہمارے ذہن کے نازک خیالات سے آگاہ ہے۔ صحائف میں خدا باپ ہے۔ قرآن میں خدا آقا و مالک ہے۔ صحائف میں خدا سے محبت کی جاتی ہے۔ قرآن میں خد کا احترام سکھایا گیا ہے۔ مسیحیت میں خدا کی یہ تفہیم الٹ گئی اور مغالطہ آمیز نقوش کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوا جس نے حقیقی توحید پرستی اور عیسائیت (تثلیث، احترام کنواری مریم علیہ السلام، احترام صوفیاء و راہبان وغیرہ) کو باہم گڈمڈ کردیا۔ اسلام میں اس قسم کا ارتقاء ممکن نہیں ہے۔ ان تمام تاریخی مصائب و مسائل کے برعکس جو اسلام کو درپیش رہے ہیں اسلام ہر دور میں "شفاف ترین توحیدی مذہب" رہا ہے۔ {۱۸}انسان کی روح صرف توحید کو اپنے اندر سمو سکتی ہے۔ ذہن کے اندر دماغ کے ذریعے وحدانیت صرف اور صرف ایک خدا ـــــ اللہ کو تسلیم کرتی ہے۔

{۱۷} Henri de lubac. The drama of Atheist Humanism trans. M.R. Ley (New York 1969).

{۱۸} آگے ہے

مسیحی خدا انفرادی دنیا (افراد اور ارواح) کا مالک ہے' جبکہ شیطان مادی دنیا کی رکابیں تھامے ہوئے ہے۔{۱۹} یہی وجہ ہے کہ مسیحی عقیدہ خدا صرف اندرونی آزادی کے ساتھ مشروط ہوتا ہے' جبکہ اسلامی عقیدہ اندرونی آزادی کے ساتھ ساتھ بیرونی آزادی کا بھی مطالبہ کرتا ہے۔ اسلام کے دو بنیادی نعرے اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) اور بنیادی عقیدہ لا الہ الااللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے) بیک وقت اسلام کی دو انتہائی اہم صداقتیں ہیں۔ سید قطب ان دو کلمات کو تمام دنیاوی اختیارات اور حکومتوں کے خلاف بغاوت اور انقلاب قرار دیتے ہیں۔ یہ بغاوت ان تمام کے خلاف ہے جنھوں نے خدائی کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔ سید قطب لکھتے ہیں کہ :

> ان کلمات کا مطلب یہ ہے کہ تمام کاہنوں' پروہتوں' پادریوں' قبائل کے سرداروں' امیروں' حاکموں اور حکمرانوں سے اختیارات چھین کر خدا کو واپس کر دیئے جائیں۔

سید قطب نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ :

> "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' یہ کلمہ ہر زمانے اور ہر علاقے میں صاحبان اقتدار کی بیزاری کا سبب بنتا رہا ہے۔{۲۰}

اسی طرح مسیحیت کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ ایک شکل کو کامل تصور کر لے اور وہ انسان بھی ہو۔ مسیح علیہ السلام کی تعلیمات سے مسیحیوں نے بندہ۔ خدا' کا تصور اخذ کیا اور مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ آنحضرت محمد ﷺ بہرحال ایک انسان ہی

{۱۸} Le Bon:

{۱۹} مسیحی قصوں سے شیطان کی عظیم طاقتوں کا پتہ چلتا ہے۔

{۲۰} Sayyid Qutb: Islam and Universal Peace: (Indianapolis: American trust, Publications 1975).

رہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کا آنا بے مقصد ہو جاتا۔ آنحضرت محمد ﷺ کی ذات سے ایک مصلح اور ایک مجاہد کا تصور ابھرتا ہے اور مسیح علیہ السلام کی ذات سے ایک فرشتے کا تصور ابھرتا ہے۔ یہی معاملہ عورتوں اور قرآن کا ہے۔ قرآن عورتوں کو ان کے فکر و عمل کے سبب واضح طور پر مائیں اور بیویاں کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ انہیں صحائف کی "مریم" اور "مارتھا" نہیں بنا دیتا۔ اسی وجہ سے مسیحیوں کا آنحضرت محمد ﷺ کی ذات پر یہ اعتراض کہ "آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بہت زیادہ انسانی ہے" کم فہمی کا نتیجہ ہے۔ قرآن خود اصرار کرتا ہے کہ محمد ﷺ یقیناً انسان ہیں اور آپ کی ذات پر مستقبل میں ہونے والے تمام اعتراضات کا پہلے ہی سے یوں دفاع کر دیتا ہے۔

یہ کیسا رسول ہے جو خوراک کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟{۲۱}

کافروں کا اعتراض تھا :

یہ کیسا رسول ہے جو بازاروں میں چلتا پھرتا ہے' تو قرآن کہتا ہے کہ رسول چونکہ انسانوں کی طرف آیا ہے اس لئے خود بھی انسان ہے اور یہ خامی نہیں ہے۔ صحائف اور قرآن میں جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں اگر ان کا موازنہ کیا جائے تو کئی واضح نتائج سامنے آتے ہیں۔ صحائف میں بہت سے الفاظ بار بار آئے ہیں۔ مثلاً پاک' مقدس' فرشتہ' ابدی زندگی' جنت' فریسی' گناہ' محبت' پچھتاوا' معافی' راز' وجود (گناہ کو رکھنے والا) روح' پاکیزگی اور نجات وغیرہ وغیرہ۔ قرآن میں یہی اصطلاحات دنیا کے مسائل کو مدنظر رکھ کر پیش کی گئی ہیں اور اب حقیقی اور متعین اصطلاحات کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ مثلاً' دلیل' صحت' صفائی' خرید' فروخت' معاہدہ' وعدہ' تحریر' ہتھیار' حالت جنگ' قوت' جدوجہد' تجارت' پھل' فیصلہ کن حیثیت' احتیاط' سزا' انصاف' منافع' بدلہ' شکار' طب' سود وغیرہ وغیرہ۔

{۲۱} قرآن - الفرقان آیت ۷۔

اسلام کے اندر کوئی مخصوص "مذہبی ادب" نہیں ہے جیسا کہ یورپ میں مخصوص مطلب لیا جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام میں کوئی بھی خالص لادینی ادب نہیں ہے۔ ہر اسلامی مفکر' قانون دان بھی ہے' {۲۲} بالکل اس طرح جیسے ہر اسلامی تحریک ایک سیاسی تحریک بھی ہوتی ہے۔

اسی قسم کے نتائج مسجد اور کلیسا کے درمیان موازنہ کرکے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ مسجد "لوگوں کے لئے ایک جگہ" کا نام ہے اور کلیسا "خدا کا گرجا" ہے۔ مسجد کے اندر دلیل کی فضا ہوتی ہے اور کلیسا میں رہبانیت کا ماحول ہوتا ہے۔ مسجد سرگرمیوں کا مرکز ہوتی ہے۔ بازار کے قریب اور آبادیوں کے درمیان ہوتی ہے' {۲۳} جبکہ کلیسا ایسے ہی بازار اور آبادی کے لئے "بلند جگہ" ہوتا ہے۔ کلیسا کی بناوٹ روایتی خاموشی، تاریکی' بلندی اور دوسری دنیا کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ کیتھولک گرجا گھر میں داخل ہوتے وقت انسان تمام دنیاوی معاملات کو باہر ہی چھوڑ آتا ہے' جیسے وہ کسی دوسری دنیا میں داخل ہورہا ہو۔{۲۴} ایک مسجد میں امید کی جاتی ہے کہ لوگ نماز کے بعد "دنیاوی" مسائل پر بحث مباحثہ کریں گے اور فرق دونوں میں یہی ہے۔

مسیحیت کا اصول دیکھیے جس میں پوپ سے غلطی سرزد نہیں ہوسکتی اور اسلامی

{۲۲} ارنسٹ بلاخ لکھتا ہے کہ تمام عرب فقہاء ڈاکٹر بھی تھے۔

Ernest Bloch, Natural Law and Human Dignity.

{۲۳} Kennth Clark, Civilization A Persnal View

(London British Broad Costing Corporation 1962)

{۲۴} Kennth Clark, Civilization A Persnal View

(London British Broad Costing Corporation 1962)

اجماع کو دیکھیے جس میں یہ لوگ غلطی پر کبھی مجتمع نہیں ہوسکتے جیساکہ آنحضرت محمد ﷺ کا ارشاد ہے 'عہدنامہ جدید انسان کی طرف توجہ دیتا ہے اور قرآن لوگوں کی طرف رخ کرتا ہے۔ اس طرح اجتماعیت' معاشرے اور کل کا تصور ابھرتا ہے۔ یہاں کوئی بھی بات اتفاقی نہیں ہے۔ عہدنامہ قدیم یہودیت' قدوسیت اور رہبانیت کے قریب ہے اور اس کے راہبانہ تصورات بدھ مت' کی روح تک پہنچ جاتے ہیں مسیحیت میں دین کو سمجھنے کا کام کچھ خاص اعلیٰ دماغ لوگوں کے لئے مخصوص ہے۔ اسلام نے دین کا راستہ ہر خاص و عام کے لئے کھول دیا ہے۔ اسلام کسی طبقے کی اس طرح برتری تسلیم نہیں کرتا کہ یہ راہب ہیں' تارک الدنیا ہیں' نہ ہی اسلام میں دو قسم کے پروگرام ہیں کہ ایک پروگرام منتخب لوگوں کے لئے اور دوسرا عام لوگوں کے لئے ہو۔ اسلام تو ایک جمہوری اصول کا اعلان ہے۔ {۲۵}

صحائف اور قرآن --- جوکہ عہدنامہ قدیم سے مختلف ہیں' یہ ایک روحانی برادری کے اصول کا اعلان کرتے ہیں۔ تاہم صحائف میں درجہ بندی رہتی ہے' جبکہ اسلام ملتوں کو تسلیم کرتا ہے اور ان سب کے اوپر ایک نئی جہت قائم کردیتا ہے جس کا نام امت ہے اور اس میں تمام کے تمام مسلمان شامل ہوتے ہیں۔ {۲۶}علاوہ ازیں قرآن رشتہ داری اور خون کے تصور کو تسلیم کرتا ہے جس کا مسیح علیہ السلام نے انکار کردیا تھا۔{۲۷}

وہ حالات جن میں اسلام کا ظہور ہوا۔ ان سے بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام ایمان اور سیاست کی تعلیم کا نام ہے۔ اس زمانے میں قریش مکہ صاحب قوت و حشمت

{۲۵} دوسری ویٹی کن کونسل کے موقع پرپاپائیت کو ہٹانے اور اجتماعی نظام لانے کی کوشش کی گئی' لیکن اس کی شنوائی نہ ہوئی۔

{۲۶} قرآن حکیم سورہ الحجرات آیت ۱۳۔

{۲۷} قرآن حکیم سورہ النساء آیت ا سورہ آل عمران آیت - ۳ سورہ حجرات آیت ۱۳

لوگ تھے اس کی طول طویل جنگوں کے ساتھ ساتھ مذہبی روایات بھی چلی آتی تھیں۔ کعبہ ان کے لئے نہ صرف عبادت کی جگہ تھا' بلکہ صدیوں سے تجارتی مرکز بھی تھا۔ جن معاشرتی حالات نے ان کو گھیر رکھا تھا اس کے سبب ان کے لئے ناممکن تھا کہ وہ زندگی کے اندر اقتصادی پہلو کو نظر انداز کر سکیں۔ اس کی مثال گلیلی جیسی نہیں ہے جہاں عیسائیت نے جنم لیا تھا اور جہاں اگر کوئی شخص چاہتا تو آسانی کے ساتھ زندگی گزار سکتا تھا۔ وادی مکہ میں زندگی شدید مصائب کے ساتھ ہی گزاری جا سکتی تھی. تجارتی دورے کرنے پڑتے تھے۔ زمین کو زرخیز بنانے' حتیٰ کہ پانی کے ایک ایک ڈول تک کے لئے سخت محنت کرنا پڑتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ صحرا کے اندر عربوں نے ایک طاقتور اور گہری مذہبیت کو پروان چڑھا رکھا تھا۔ ان دو متضاد پہلوؤں نے عربوں کے قلب و ذہن پر مستقل اثرات مرتب کیے تھے۔ اس کی بدولت ان کے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا کہ دینی و دنیاوی تعلیم کے لئے سب سے بہتر وہی ہیں۔ صحائف میں آتا ہے' اس طرح زندگی بسر کرو جس طرح کھیتوں میں سوسن کے پھول ہوتے ہیں۔ لیکن قرآن نے کہا' "خدا نے تمہیں دن عطا کیا تھا کہ تم (زمین) میں پھیل جاؤ اور اپنے لئے خوراک اور خدا کی نعمتیں تلاش کرو"۔ {۲۸}

یہ قرآن کا حکم ہے ـــ اناجیل کا نہیں ہے کہ ـــ خدا نے انسان کو کائنات کا فرمانروا بنا کر پیدا کیا ہے۔ {۲۹} انسان فطرت اور دنیا پر غلبہ و استعلاء صرف علم اور کام کے ذریعے یعنی سائنس اور عمل کے ذریعے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ قانون اور انصاف پر زور دینے کے ساتھ اسلام نے ثابت کر دیا کہ اسلام کو صرف تمدن مطلوب نہیں ہے' تہذیب بھی مطلوب ہے۔ {۳۰}

{۲۸} متی ۶:۲۸ کا موازنہ قرآن سورہ الجمعہ ۱۰ سے کیجئے۔

{۲۹} قرآن البقرہ آیت ۳۰۔ حاشیہ (۳۰) آگے ہے۔

اسلام کی تہذیب سے گہری وابستگی کا اس امر سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام نے خواندگی کو تہذیب کے انتہائی طاقتور آلۂ پیائش میں شمار کیا۔ لکھنے پڑھنے کا ذکر تو قرآن کی اولین آیتوں ہی میں کیا گیا ہے۔ {۳۱} تحریر مذہب کے لحاظ سے اجنبی چیز تھی۔ اناجیل طویل عرصے تک زبانی روایت کے طور پر موجود رہیں اور جہاں تک ہم جانتے ہیں، مسیح علیہ السلام کے کم وبیش ایک نسل کے بعد اناجیل لکھی گئیں۔ اس کے برعکس آنحضرت محمد ﷺ قرآن کی نازل شدہ آیات فوراً ہی کاتبوں کو لکھوا دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ طرز عمل یہودیوں کے لئے سخت عناد کا باعث ہوا ہوگا اور یہ طرز عمل معتوب فریسیوں کے طرز عمل کے بہت قریب ہے۔ {۳۲}

قرآن حکم دیتا ہے کہ برائی اور ظلم کے خلاف جدوجہد {۳۳} (جہاد) کی جائے اور یہ طرز عمل اس لفظ کے لحاظ سے خالصتاً مذہبی نہیں ہے۔ عدم تشدد اور عدم مزاحمت کے اصول مذہب کے بہت قریب ہیں۔ خالص مذہب کے یہ اصول مسیح علیہ السلام کی تعلیمات اور ہندوستانی مذہبی فکر میں یکساں پائے جاتے ہیں اور گاندھی کی قیادت میں اس نے اہنسا پرمودھرما کی تحریک کی شکل اختیار کی۔ اس سے مراد عدم تشدد کے ذریعے جدوجہد کرنا ہے۔ قرآن جب حکم دیتا ہے کہ ذلت اور غلامی و بندگی کے خلاف جدوجہد کرو۔ {۳۴} تو یہ مذہبی یا اخلاقی اصول نہیں، بلکہ عمرانی اور الہامی ضابطہ ہے۔ آنحضرت

{۳۰} اسلام واحد مذہب ہے جس نے اپنا جامع قانون بنایا۔

{۳۱} قرآن سورہ العلق آیت ۵ - ۴۔

{۳۲} موسیٰ علیہ السلام نے بھی تحریر کروایا (اعداد ۲: ۳۳ رومیوں ۵: ۱۰)۔

{۳۳} قرآن سورہ الحجرات آیت ...

{۳۴} قرآن سورہ البقرہ آیت ۲۱۶۔ سورہ الحج آیت ۳۹، الممتحنہ آیت ۲، الانفال آیت ۹، الصف آیت ۱۰۔

محمد ﷺ جنگوں میں شرکت کرتے تھے کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے کہ آپ کے پاس نو تلواریں' تین نیزے اور سات زرہیں' تین ڈھالیں اور دیگر ہتھیار تھے۔ اس سلسلے میں آنحضرت محمد ﷺ موسیٰ علیہ السلام کی مشابہت اختیار کر لیتے ہیں جنہیں "لڑنے والا نبی" کہا جاتا ہے۔ {۳۵}

اسلام کے اندر نشے کی ممانعت کا ایک سماجی مرتبہ ہے۔ کیونکہ نشہ اولین طور پر ایک سماجی برائی ہے۔ مذہب کو عمومی طور پر نشے کے خلاف کچھ کرنے کا موقع نہ ملا۔ کچھ مذاہب نے کچھ مصنوعی ذریعوں سے نشے کو حلال کرنے کی کوشش کی۔ عیسائی اس بات کے اعلان میں کوئی پریشانی محسوس نہیں کرتے کہ ان کے خیال میں عشائے ربانی کے وقت شراب مسیح علیہ السلام کے خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ اسلامی قانون میں تو واضح حکم موجود ہے کہ شراب پینا شدید جرم ہے اس لئے اس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اسلام جس وقت شراب کو حرام قرار دیتا ہے تو وہ مذہب کے طور پر نہیں' سائنس کے طور پر اس کی ممانعت کرتا ہے۔

ایک وحدت کے طور پر اسلام کی بے مثال خوبی یہ ہے کہ اگرچہ کچھ لوگوں نے اس کے مذہبی عنصر پر زور دیتے ہوئے اس کے دوسرے پہلو "اتحاد" کو قربان کرنے کی کوشش کی۔ تاہم "اتحاد" موجود رہا۔ موجودہ دور میں اسلام کو مذہب اور تصوف تک محدود کر دیا گیا ہے۔ جس قدر "سرگرمی" محدود ہوتی ہے اسی قدر ہم "دنیا میں حصے" سے محروم رہ جاتے ہیں۔ {۳۶} اور دنیا کے ساتھ ہم آہنگ نہیں رہ پاتے۔ اسلامی ریاست کسی بھی

{۳۵} ہمیں ایسی دیگر مثالیں بھی ملتی ہیں جس کے ذریعے موسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم یا یہودیت اور اسلام میں موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے موازنات یہودیت اور عیسائیت میں کرنا ناممکن ہیں۔

{۳۶} قرآن سورہ البقرہ آیت ۱۷۷۔

دوسری ریاست کی طرح ایک ریاست بن جاتی ہے اور اسلام کے اندر مذہب ایسے ہی بن جاتا ہے جیساکہ کسی بھی دوسری ریاست میں ہوتا ہے۔ ریاست ایک برہنہ ادارہ بن جاتی ہے جو صرف اپنے ہی مقاصد کی تکمیل کرتی ہے' جبکہ مذہب معاشرے کو قدامت اور تساہل کی طرف لے جاتا ہے۔ بادشاہ' امیر' بے خدا سائنس دان' مذہبی راہنما' صوفیانہ سلسلے' مخمور شعراء ــــ اور اس قسم کے تمام لوگ اندرونی توڑ پھوڑ کا بیرونی اظہار ہوتے ہیں۔ مشہور و معروف مسیحی فارمولے کے مطابق "جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو۔{۳۷}متصوفانہ فلسفہ اس انحراف کا آغاز ہے جس کی وجہ سے اسلام کو "مسیحیت زدہ کرنا" کہا جاسکتا ہے اور یہ آنحضرت محمد ﷺ سے مسیح کی طرف واپس لوٹنا ہے۔{۳۸}

اسلام کی "مادہ پرستی" کے بارے میں ایک خوفناک تصور قائم کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ وہ فطری اور سماجی عناصر ہیں جو اس کو ملے ہیں ــــ اور جن کے باعث دیگر انتہائی مادہ پرستانہ یورپی ممالک کے لئے اسلامی دنیا ناقابل قبول ہوگئی ہے۔ انقلاب سے قبل روس میں تصوراتی مسیحیت بائیں بازو کی تعلیمات کی حقیقت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ مسلم ممالک میں مارکسی انقلابات کی جزوی یا کلی ناکامی اتفاقی واقعہ نہیں ہے۔ اسلام کے اندر اپنا ہی نظام ہے اور مادہ پرستی کی اس کی اپنی توجیہہ ہے ۔ عہدنامہ قدیم کی حقیقت پسندی کو اسلام نے برقرار رکھا' جبکہ یورپی مارکسیت یہودی عنصر کے طور پر ہے جس کو کیتھولک اور آرتھوڈوکس عیسائیت نے مکمل طور پر نکال باہر کیا تھا۔{۳۹}عقل

{۳۷} متی ۲۱ : ۲۲۔

{۳۸} اس وقت ہمارے ذہن میں صوفیاء اور درویشوں کے وہ سلسلے ہیں جن کی درویشی انہیں ترک دنیا اور عملی زندگی سے علیحدگی کی طرف لے گئی۔

{۲} یہ حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں

پرست پروٹسٹنٹ ازم انقلابی چیلنج کے لئے اور بھی زیادہ مزاحم ثابت ہوا۔ اس نقطہ نظر سے کیتھولک مسیحیت کی نسبت پراٹسٹنٹ مسیحیت اسلام کے زیادہ قریب ہے۔ اسلام اور مسیحیت کے درمیان سیاسی کشمکش کی تاریخی وجوہات کی بدولت ان کے قریبی تعلق کو بارہا نظر انداز کیا گیا ہے۔ اسلام انجیل کو مقدس کتاب قرار دیتا ہے اور مسیح علیہ السلام کو ایک نبی۔ اسی چیز کو نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ اگر ہم اس سے نتائج اخذ کریں تو دنیا کے یہ دو عظیم مذاہب باہمی تعلق سے مستقبل میں نئی راہیں تلاش کر سکتے ہیں {۴۰}

{۳۹} عہدنامہ قدیم اور قرآن میں جو باتیں مشترک ہیں یہ وہ ہیں جن میں قوت اور دولت کے ناجائز قابضین کا انکار کیا گیا ہے۔ قرآن "گمراہ لیڈروں" (الانفال آیت ۷۵) بے خدا سرداروں (ہود آیت ۲۷) گنہگارانہ سرداری (الانعام آیت ۱۲۳) 'معززین (الاعراف آیت ۵۹)' غیر معمولی دولت (آیت ۳۴) کے خلاف ہے۔ یہ سماجی تعلق کو بھی ظاہر کرتا ہے جو یہودیت اور اسلام کا خاصہ ہے۔

{۴۰} "کہو ہم ایمان لائے جو تم پر نازل کیا گیا ہے کیونکہ خدا ایک خدا ہے اور اسی کے آگے ہم جھکتے ہیں"۔ قران(سورہ العنکبوت آیت ۴۵)

یا کہو اے اہل کتاب آؤ ان نکات پر جو ہمارے تمہارے درمیان مشترک ہیں۔قرآن(سورہ آل عمران آیت ۶۴)

باب ہفتم اسلام اور دین

اسلام کے پانچ ستون اور ان کا ظاہر و باطن

اسلام دنیا کو کس طرز پر چلانا چاہتا ہے یہ عمل صلوٰۃ سے واضح ہوتا ہے۔ صلوٰۃ کے ذریعے دو حقیقتیں واضح ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ بنیادی انسانی مقاصد دو ہیں۔ دوم یہ کہ مقاصد منطقی طور پر جدا جدا ہونے کے باوجود انسانی زندگی میں یکجا کیے جاسکتے ہیں' کیونکہ ظاہری صفائی حاصل کیے بغیر صلوٰۃ ادا نہیں کی جاسکتی اور روحانی مدارج ظاہری اعمال اور سماجی کوششوں کے بغیر طے نہیں کیے جاسکتے۔ جس چیز کو ہم "دوگانہ وحدت" قرار دیتے رہے ہیں اس کا جامع ترین اظہار صلوٰۃ ہے۔ صلوٰۃ اس حقیقت کو ٹھوس شکل دیتی ہے۔

وضو کے بغیر صلوٰۃ بے معنی ہے جبکہ عیسائیت اور ہندومت کے کئی سلسلوں میں پاک ترین عبادت "مقدس ناپاکی" کے ذریعے ہی سرانجام دی جاسکتی ہے۔ ان فرقوں میں مذہبی طور پر یہ خیال پایا جاتا ہے کہ جسم سے غفلت برتنے کی بدولت عبادت میں روحانیت پیدا ہوتی ہے' بلکہ اس کو جلا ملتی ہے۔ ان کے خیال میں عبادت کو جس قدر ظاہری اعمال سے پاک کیا جائے گا اسی قدر فوائد حاصل کیے جاسکیں گے۔ جس قدر ظاہری حالت کا عمل دخل کم ہوگا اسی قدر روحانی حالت عروج تک پہنچے گی۔ (۱)

لیکن وضو اور اس میں جو اعمال شامل ہوتے ہیں وہ نماز کے منطقی پہلو کی وضاحت

کرتے ہیں۔ یہ اعمال صلوٰۃ کو ایک عبادت ہی نہیں، بلکہ ایک منظم فعل اور حفظان صحت کا ایک اصول بنا دیتے ہیں۔ صلوٰۃ صرف روحانی عمل ہی نہیں، بلکہ ایک متحرک فعل بھی ہے۔ سردی کے موسم میں علی الصبح ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا اور صلوٰۃ کے لئے صفیں ترتیب دینا فوجی تربیت محسوس ہوتا ہے۔ جنگ قادسیہ سے قبل ایک ایرانی سپاہی نے مسلم مجاہدین کی صلوٰۃ کے لئے صف بندی دیکھی تو اس نے اپنے افسر سے جا کر کہا۔ ''مسلمانوں کی فوج کو جا کر دیکھو وہ کس شاندار انداز میں فوجی مشقیں کرتے ہیں''۔ (۲) صلوٰۃ کے دوران بظاہر چند اعضاء کی حرکت نظر آتی ہے، لیکن حقیقت میں تمام اعضاء اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ روزانہ پانچ مرتبہ وضو (یا غسل) کرکے پانچ نمازیں ادا کرنا۔ پہلی نماز طلوع آفتاب سے پہلے اور آخری نماز رات کے ابتدائی حصے میں ادا کرنا، ایسے اعمال ہیں جو انسان کو تعیش، آسائش اور بے راہ روی سے بچاتے ہیں۔

اگر نماز کے اس عقلی پہلو کی طرف توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ نماز یک رخی عبادت نہیں ہے۔ وضو نہ صرف ایک صحت بخش عمل ہے، بلکہ ایک نیکی بھی ہے۔ اسلام نے نماز کے لئے ایک ایسے صحت بخش اصول کو لازمی قرار دیا جو اسلامی اصطلاح میں خالصتاً عبادت ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اصول صحت عبادت بن گیا اور کسی اور مذہب میں

---

(۱) جیکب اسقف ان لوگوں میں سے ہے جس نے اس نقطۂ نظر کو عروج تک پہنچایا۔ قرون وسطیٰ میں صفائی اور پاکی سے کس طرح دشمنی رکھی جاتی تھی اس کا اظہار ان سطور میں موجود ہے۔ ''پاک صاف رہنے سے علی الاعلان نفرت کی جاتی تھی۔ مرد اور خواتین راہب فخریہ یہ کہتے کہ پانی نے ان کے قدموں کو کبھی بھی نہیں چھوا سوائے یہ کہ جب انہیں دریا سے گزرنا پڑ جائے''۔

Russel : The History of Western Philosophy

(London N.P. 1946), P. 371.

(۲) Risler in La Civilization Arabe P.35

یہ عجیب محسوس ہوگا۔ قرآن کہتا ہے ”اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں“۔ یہ اسلام ہی کا اعزاز ہے کہ جسمانی صفائی کو بھی ایمان و عقیدے کا جزو بنا دیا گیا ہے۔ دیگر تمام مذاہب میں جسم اور اس کی نظافت ”خارج ازبحث“ ہے {۳}۔

رمضان کے مہینے میں صلوٰۃ تراویح ادا کی جاتی ہے اور روزے کے ساتھ تراویح ایک قابل تعریف صحت بخش اقدام بن جاتی ہے اور یہ بھی اسلام کی عطا ہے۔

نماز دن کے مخصوص اوقات میں ادا کی جاتی ہے اور نماز کی حالت میں ایک جغرافیائی سمت یعنی کعبے کی طرف رخ کرنا لازمی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی عبادات فطرت اور اس کے عوامل کو بھی شامل رکھتی ہیں' دیگر مذاہب اس منطق سے عاری ہیں۔ نماز' روزہ اور حج کئی فلکیاتی امور کے ساتھ متعلق ہیں' لیکن اسلام واضح کر دیتا ہے کہ ”نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق کی طرف کرلو یا مغرب کی طرف“۔ {۴} لہٰذا نماز ہماری کائنات زمان و مکان کا حصہ ہے۔ اسلام کے دور اول میں فلکیات کی نشوونما خصوصی طور پر ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اسلامی عبادات ادا کرتے ہوئے وقت اور مقام کا صحیح ترین تعین بھی مطلوب ہوتا تھا۔ ہم دلائل سے ثابت کرسکتے ہیں کہ فلکیات میں یہ ترقی اسلامی وجہ سے ہوئی۔

نماز کے اس پہلو نے ایک اور خصوصیت یعنی سماجی پہلو کو بھی پروان چڑھایا۔ نماز

{۳} مثال کے طور پر مسیحیت کے پھلنے پھولنے کے ساتھ رومی تہذیب کے بنائے ہوئے غسل خانے غائب ہونے لگے۔ کلیسا نے غسل خانے' گرجا گھروں اور معبدوں میں تبدیل کردیئے۔ اس کے برعکس اسلام نے مساجد کے ساتھ غسل خانے اور طہارت خانے قائم کروائے۔ دنیا میں کوئی مسجد ایسی نہیں ہے جس میں فوارہ (یا موجودہ دور میں وضوخانہ) نہ ہو۔ یہ سب اتفاقی طور پر نہیں ہوا۔

{۴} سورہ البقرہ آیت ۱۷۷

باجماعت ادا کرنا لوگوں کے صرف اجتماع کا نام نہیں ہے، بلکہ افراد کے باہم رابطے کا نام بھی ہے اور اس لحاظ سے یہ "منفی انفرادیت" اور "تنہائی پسندی" کی نفی کرتا ہے۔ زندگی انسانوں کو تقسیم کر ڈالتی ہے۔ مساجد لوگوں کو بار بار اکٹھا کرتی اور انہیں باہم ملا دیتی ہیں۔ مساجد تو ہم آہنگی مساوات، معاشرتی ربط اور خیر خواہی کے سکول ہوتی ہیں۔

نماز کی یہ سماجی خوبی جمعہ کے روز اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ جمعہ کی نماز اصل میں ایک شہری یا سیاسی اجتماع ہے۔ نماز جمعہ، جمعہ کے روز علاقے کی مرکزی مسجد میں ریاست کے نمائندے کی موجودگی میں ادا کی جاتی ہے۔ نماز جمعہ سے قبل جو خطبہ پڑھا جاتا ہے اور جو جمعے کی نماز کا ایک اہم حصہ ہے وہ دراصل ایک سیاسی پیغام ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عیسائی حضرات کہیں کہ نماز کے ساتھ سیاسی پیغام عبادت کی روح کی نفی ہے۔ عیسائیت کے زاویہ نظر سے تو یہ قابل اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن اسلام کی روح اس کی نفی نہیں کرتی۔

زکوۃ کے عمل سے اسلام کے پاک و صاف کرنے کے عمل کی ایک اور پہلو سے وضاحت ہو جاتی ہے۔ اسلام کے دور اول یعنی مکی دور میں زکوۃ رضاکارانہ طور پر غریبوں کو صدقہ و خیرات کے طور پر دی جاتی تھی۔ مدینہ میں مسلم ریاست کے قیام کے بعد (یہ ایک تاریخی لمحہ تھا جب ایک روحانی جماعت نے ایک ریاست قائم کی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوۃ کو ایک قانونی ذمہ داری بنا دیا کہ امیروں سے زکوۃ لی جائے اور غریبوں کو دے دی جائے۔ اس طرح یہ ایک سرکاری ٹیکس بھی تھا اور اس کو جمع کر کے فقراء میں تقسیم کرنے کا کام ہمارے علم کے مطابق تاریخ میں اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔ عیسائیت میں صدقات کا ذکر تھا، اسلام نے اسکو لازمی کر دیا۔ رائزلر نے اسے "لازمی خیرات" کا نام دیا ہے۔ جس منطق نے عبادت کو نماز میں تبدیل کیا تھا اس نے خیرات کو زکوۃ میں اور آخر کار مذہب کو دین اسلام میں تبدیل کر دیا۔

زکوۃ کے ادارے کے ساتھ اسلام ایک سماجی تحریک بن گیا اور معروف معنوں میں

صرف ایک مذہب نہ رہا۔ زکوۃ نے صحیح ترین شکل مدینہ کی سیاسی ہیئت میں اختیار کی۔ زکوۃ کی اہمیت کے سبب قرآن کی مکی سورتوں میں اس کا ذکر آٹھ مرتبہ اور مدنی سورتوں میں بائیس مرتبہ آیا ہے۔

زکوۃ ایک ایسے عمل کا مظہر ہے جو یک رخا نہیں ہے۔ بخل نہ صرف ایک معاشرتی مسئلہ ہے' بلکہ مال کی محبت کا یہ فتنہ روح تک میں سرایت کرجاتا ہے۔ محرومی اس کا ظاہری پہلو اور گناہ اس کا اندرونی پہلو ہے۔ خوشحال معاشروں میں بخل کی ہم کیا وجہ بیان کرسکتے ہیں؟ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں دنیا کی ایک تہائی آبادی کو پوری خوراک نہیں ملتی۔ اس کے پس پشت اشیاء کی کمی ہے یا جذبات کی کمی ہے؟ بخل اور مال پرستی کا حل یہ ہے کہ گناہ کا اعتراف کیا جائے۔ ہر معاشرتی مسئلے کا انسانی حل نکالا جائے جو نہ صرف معاشی تعلقات کو درست کرے' بلکہ انسان کے انسان کے ساتھ تعلق کو بھی درست کرے۔ نہ صرف یہ کہ اشیاء کی منصفانہ تقسیم ہو' بلکہ محبت اور ہمدردی کی بھی نشوونما ہو۔

غربت ایک مسئلہ ہی نہیں' بلکہ گناہ بھی ہے۔ غربت کا حل یہ نہیں ہے کہ اشیاء تقسیم کردی جائیں' بلکہ ذاتی جدوجہد' محنت اور نیک نیتی کے ساتھ بھی اس کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اگر کچھ اشیائے صرف ایک شخص سے لے کر دوسرے شخص کے حوالے کردی جائیں تو ملکیت کے تبدیل ہونے سے نفرت' استحصال اور ماتحتی کے اندرونی جذبات تبدیل نہیں ہوتے۔ عیسائیت میں جو سماجی انقلاب اور مذہبی بغاوتیں ہوتی رہی ہیں ان کا سبب یہی رہا ہے۔ "پچھلے دو ہزار سالوں میں برائیاں کم نہیں ہوئی ہیں، نہ کوئی مذہبی یا انفرادی سلطنت ہی طویل عرصے تک قائم رہی ہے"۔ {۵} مذہب کی بنیاد پر اٹھنے والی بغاوتیں بہت زیادہ مذہبی تھیں اور سماجی بنیاد پر ترتیب پانے والے انقلاب بہت زیادہ

{۵} Albert Camus: I' Homme Re'volte' Paris: Gallimord 1951.

سماجی تھے۔ اہل مذہب نے خیال کیا کہ سیاست اور کشمکش سے دامن بچاکر زیادہ مذہبی ہونے کا ثبوت دیا جاسکے گا' جبکہ اشتراکیت کے پیروکاروں نے اپنے شاگردوں کو اولین سبق ہی یہ سکھایا کہ تشدد ہی اصل راستہ ہے' جبکہ خیرات اور احسان ایک دھوکہ ہے۔ انسان ایک ایسے مذہب کا متلاشی ہے جس میں سیاست بھی ہو اور سیاست بھی ایسی کہ جس میں اخلاقیات شامل ہوں اور ایسی خیرات جو سماجی ذمہ داری کی صورت میں ٹیکس بنی ہو اس طرز پر زکوۃ کی تعریف متعین ہوجاتی ہے۔ زکوۃ لوگوں کا آئینہ ہے۔ اس کا انحصار لوگوں پر ہے کہ وہ اسے بطور ٹیکس قبول کرتے ہیں یا رضاکارانہ طور پر ایک شخص دوسرے شخص کو زکوۃ عطاء کرتا ہے۔ زکوۃ کے ذریعے دل اور سینے کھل جاتے ہیں۔ زکوۃ تو اشیاء کا ایک دریا ہے۔ جو انسان سے انسان اور دل سے دل کے درمیان بہہ رہا ہے۔ زکوۃ غریبوں سے غربت اور امیروں سے عدم توجہی کا خاتمہ کرتی ہے۔ زکوۃ مادی فرق کو کم از کم کرکے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے {۶}۔

اسلام امارت کا خاتمہ کرنا نہیں چاہتا' بلکہ غربت اور بدبختی کو کم از کم کرنا چاہتا ہے۔ غربت کیا ہے؟ اس سے مراد اشیاء کی عدم دستیابی ہے ان لوگوں کے لئے جو معمولی زندگی بسر کرتے ہوں' جن کے پاس زندہ رہنے کے لئے جن کم از کم اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی موجود نہ ہوں اور کم از کم معیار زندگی کے بھی نچلے درجے کی زندگی گزار رہے ہوں۔ کم از کم معیار زندگی کے اندر اشیاء کا وہ مجموعہ شامل ہے جو ایک شخص اور اس کے خاندان کے لئے ان کی جسمانی اور معاشرتی ضروریات پورا کرنے کے لئے کافی ہوں۔ سوسائٹی اس چیز کی پابند نہیں ہے کہ وہ ہر شخص کو معاشی طور پر نیچے لے آئے اور سب کو برابر کردے' بلکہ معاشرہ ہر شخص کو زندگی کے مطلوبہ معیار کے برابر تو لے کر آئے۔ اسلام کے معاشی اقدامات غربت اور تنگدستی کے خاتمے تک محدود ہیں۔ اسلام تمام

{۶} سماجی انصاف کی فراہمی کے لئے ریاست کی طرف سے براہ راست مداخلت بہترین ذریعہ ہے۔

لوگوں کے لئے یکساں دولت تجویز نہیں کرتا کیونکہ اخلاقی اور اقتصادی طور پر ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔

ہر معاشرہ انسانی اور اخلاقی اقدار کے ساتھ اپنی بقاء کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ اس لئے اسلامی معاشرہ ازحد انسانی' ازحد مستعد ہونا چاہیے۔ یہ غیر اخلاقی اور غیر انسانی متصور ہوگا کہ کچھ لوگ دوسروں کے حقوق کی پامالی بھی کریں اور ان پر حکمرانی بھی کریں۔ یہ صرف اسلامی نظام ہے جو بعید ترین انتہاؤں کے درمیان کا راستہ فراہم کرتا ہے۔

زکوۃ کے متعلق عموماً یہ طے کیا جاتا ہے کہ کس کو کتنی مقدار میں دی جائے۔ اس بات سے اعداد و شمار دیکھنا اور تعداد وغیرہ مطلوب نہیں ہوتی' بلکہ اصل چیز زکوۃ کے اس اصول پر عمل کرنا ہوتا ہے کہ معاشرے کے صاحب ثروت لوگ ثروت سے محروم لوگوں کے حقوق کا خیال رکھتے ہوں۔ یہ معاشرے کی بہت بڑی خوبی شمار ہوتی ہے۔ بلاشک و شبہ ایک روز جب حقیقی اسلامی نظام قائم ہوگا تو وہاں زکوۃ کے اس اصول پر پوری طرح عمل ہوگا' نیز آبادی اور آمدنی میں یکسانیت اور ہم آہنگی ہوگی۔ نیز اس اصول کے ذریعے فاضل دولت رکھنے والے اپنی دولت کا فالتو حصہ اصول زکوۃ کے مطابق ضرورت مندوں میں تقسیم کردیں گے۔ ایسی زکوۃ غریبوں کا حق ہوگی (۷) اور اگر ضرورت ہوگی تو اسے بزور بھی حاصل کیا جائے گا (۸)۔

کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ قرآن کی بیاسی آیات اور مقامات سے زکوۃ کی فرضیت کا حکم نکلتا ہے۔ دینے اور عطا کرنے کے اس مستقل اسلامی حکم کے باعث "وقف" کے مسلم اداروں کے ذریعے مسلم معاشروں میں ایک خاموش انقلاب برپا ہوا۔ غیر مسلم

---

(۷) سورہ الفرقان آیت ۲۵۔

(۸) محروموں کو حق ملے گا تو ڈاکہ زنی' لوٹ مار' قتل' نشہ' رشوت اور سمگلنگ میں کمی ہوگی (مترجم)۔

اداروں میں "وقف" جیسے اداروں کی مثال پیش کرنا ناممکن ہے۔ دنیا کا کوئی ایسا مسلم ملک یا علاقہ نہیں ہے جہاں عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لے بڑی جائدادیں وقف نہ کردی گئی ہوں۔ قرآن میں وقف کا ذکر نہیں ہے' لیکن مسلم معاشروں میں یہ اچانک نہیں آگیا۔ باہمی تعاون کی روح اور زکوۃ کے ادارے کی مثال سے وقف وجود میں آئے۔ اس انسان پروری کی روش سے یہ راستہ کھلتا ہے کہ بہت سے سماجی و معاشرتی مسائل تشدد کی بجائے تعاون سے حل کیے جاسکتے ہیں۔ اخلاقی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر مال و جائداد کو وقف کردینے کی مثال ثابت کرتی ہے کہ مادی فوائد کو پس پشت رکھتے ہوئے بھی کئی تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں۔ {۹}اس لحاظ سے وقف اقتصادیات کے مروجہ قوانین کے بالکل برعکس ہے' سیاسی اقتصادیات میں تو اس کو ایک غلطی ہی شمار کیا جائے گا۔ تاہم ظاہر و باطن کی بدولت یہ "خالصتاً" اسلامی طرز عمل ہے۔

کیا زکوۃ کے ذریعے لوگوں پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ اپنے کام کے ذریعے اپنی حالت بہتر بنانے کے بارے جدوجہد کرنا چھوڑ دیتے ہیں؟ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کو ذاتی جدوجہد کے ذریعے حل نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً پیدائشی نقص ہیں' قدرتی آفات ہیں۔ اس سلسلے میں زکوۃ کی حیثیت امداد و اعانت کی بن جاتی ہے اور اس سے تمام مہذب اور غیر

{۹} اس موقع پر ہم "منفی محاصل" (Negative Taxation) کا موازنہ پیش کرنا چاہتے ہیں جس کو امریکی ماہر اقتصادیات اور نوبل پرائز انعام یافتہ ملٹن فریڈمین نے ۱۹۷۶ء میں پیش کیا تھا۔ اس کے خیال کے مطابق "معاشی ادارے اور شعبے ان تمام لوگوں کو امداد فراہم کریں گے جن کی آمدنی ناکافی ہے۔ امریکہ کے اندر غربت کب کی ختم ہوچکی ہوتی' اگر غیر ضروری اقدامات اور تعیشات پر رقم خرچ کرنے کی بجائے ضرورت مندوں میں تقسیم کی جاتی"۔ اس منفی محاصل کے نظریے سے زکوۃ کے نظریے کی حقانیت ثابت ہوتی ہے۔

مہذب معاشرے آشنا ہیں ۔ امریکہ کے ۱۹۶۵ء کے بجٹ میں ایک ارب ڈالر غریب امریکیوں {۱۰} کی امداد کے لئے مختص کیے گئے۔ "کسی شخص نے بھی اس شبہے کا اظہار نہیں کیا کہ اتنی معقول رقم، تجارت میں سب سے آگے قوم کی توانائیوں پر اثرانداز ہوگی اور انہیں کاہل بنادے گی" {۱۱}۔

اسلام کے دو اہم ستونوں یعنی صلوٰۃ اور زکوٰۃ سے ان کی دہری حیثیت ثابت ہوتی ہے، لیکن اگر بیرونی طور پر ان کا جائزہ لیا جائے تو اسلام کے دائرہ کار میں ان کے جامع کردار کی اہمیت یقینی طور پر واضح ہوجاتی ہے۔ اس زاویے سے نماز ایک روحانی عنصر اور زکوٰۃ ایک معاشرتی عنصر کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ نماز کا رخ انسان کی طرف اور زکوٰۃ کا رخ دنیا کی طرف ہے۔ کم و بیش تمام مسلم مفکرین اس چیز پر متفق ہیں کہ انسان کا ذاتی فعل نماز اس کے معاشرتی فعل زکوٰۃ کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی نہ ہو تو نماز بے مقصد ہوجاتی ہے۔

نماز اور زکوٰۃ کا قرآن نے بارہا یکجا ذکر کیا ہے کہ ان کے ایک دوسرے پر انحصار کو واضح کیا جاسکے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "تمہیں حکم دیا گیا ہے کہ نماز پڑھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور جو شخص زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اسے نماز سے کچھ حاصل نہ ہوگا"۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد ایک ایسے قبیلے کے خلاف فوج کشی کی اجازت دے دی جس نے

{۱۰} اس درجے میں وہ امریکی آتے ہیں جن کی سالانہ آمدنی دو ہزار ڈالر سے کم ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس وقت اس درجے میں آنے والے امریکنوں کی تعداد پینتیس لاکھ تھی۔

{۱۱} پروفیسر لیسٹر ٹروجن کا تعلق میساچوسٹس انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے ہے کہتے ہیں "جن قوموں میں امیر و غریب میں فرق کم از کم ہے وہ امریکہ سے آگے بڑھ رہے ہیں ان میں سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ڈنمارک، ناروے اور جرمنی شامل ہیں"۔

زکوۃ ادا کرنے سے انکار کردیا تھا۔ آپ کے یہ الفاظ تاریخ میں درج ہیں "میں قسم کھاتا ہوں کہ جو کوئی نماز اور زکوۃ میں فرق کرے گا میں اس کے خلاف لڑوں گا"۔

اسلام نے "نماز پڑھو اور زکوۃ دو" کا فارمولا بارہا بیان کیا' بالکل اس طرح جس طرح قرآن نے "ایمان لاؤ اور نیک عمل کرو" کا حکم دیا اور یہ قرآن کے مذہبی اخلاقی اور سماجی احکامات کا ایک طریقہ ہے۔ [۱۲] اس فارمولے میں دو اہم ستون بیان کردیئے گئے ہیں اور ان پر اسلام کی عمارت کھڑی ہوئی ہے ان دو کو اسلام کی اولین اور اعلیٰ ترین شکل سمجھا جانا چاہیے۔

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے وقت گواہوں کے سامنے اعلان کرنا اپنے اندر دو مفہوم رکھتا ہے اس اعلان کے ذریعے ایک فرد روحانی گروہ میں داخل ہو رہا ہوتا ہے یہ ایک ایسا فعل ہے جس کے لئے گواہوں کی ضرورت نہیں ہوتی' لیکن اس کے ساتھ ساتھ فرد ایک نئے سیاسی و معاشرتی نظام میں داخل ہو رہا ہوتا ہے اور اس کے بعد اسے اخلاقی و قانونی ذمہ داریاں ادا کرنا پڑتی ہیں۔ کسی مذہب میں داخل ہونے کے لئے کسی گواہی کی ضرورت نہیں ہوتی' کیونکہ یہ تو فرد اور خدا کا معاملہ ہوتا ہے اور اس معاملے میں تو ارادہ اور اندرونی فیصلہ ہی کافی ہو سکتا ہے۔ دوسرے لوگوں کے سامنے اعلان کرنا' تشہیر کرنا' دیگر مذاہب کے نقطۂ نگاہ سے بھی غیر ضروری ثابت ہو سکتا ہے۔

اسی طرح رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنے کا معاملہ ہے۔ مسلمان روزے کو پورے معاشرے کی روح کی تکمیل سمجھتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس قانونی فرض کی خلاف ورزی کو مسلمان بہت برا خیال کرتے ہیں۔ روزہ اسلام کا رکن اور ہر فرد کی انفرادی ذمہ داری ہی نہیں' بلکہ ایک معاشرتی فرض اور ذمہ داری بھی ہے۔ دوسرے مذاہب میں اس قسم کی

---

[۱۲] "جو ایمان لاتے ہیں ' نیک اعمال کرتے ہیں ' نماز ادا کرتے ہیں' زکوۃ ادا کرتے ہیں' ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے' ان کے لئے نہ خوف ہوگا۔ اور نہ غم"۔ (البقرہ آیت ۲۷۷)۔

سماجی ذمہ داری کا موجود ہونا ناقابل یقین ہے۔ اسلامی روزہ ایک تعلیمی اور تربیتی عمل ہے جس کے انتہائی خوش کن اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ شہنشاہ کا قصر ہو یا کسان کی جھونپڑی' فلسفی کی جائے قیام ہو یا ایک عام شہری کا گھر ہو سب اس کے اوپر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دل و دماغ کی کامل یکسوئی اور خدا خوفی کے ساتھ اس حکم پر عمل کیا جاتا ہے۔

اسلام کے پانچویں رکن حج کو لیجئے یہ مذہبی شعار ہے؟ تجارتی میلہ ہے؟ سیاسی اجتماع ہے؟ یا اس میں یہ سب باتیں جمع ہیں؟ حج خالصتاً ایک مذہبی اجتماع اور عبادت ہے' لیکن اس میں دیگر تمام چیزیں بھی اکٹھی ہو گئی ہیں۔

اسلام کی دہری پوزیشن' دیگر بہت سے ذریعوں سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے۔

"جھوٹی قسم کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے وہ کھانا جو تم اور تمہارے اہل خانہ کھاتے ہیں یا انہیں سادہ لباس دو یا ایک غلام آزاد کرو اور اگر اس کی قدرت نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھو" {۱۳}۔

یعنی مفید سماجی اعمال کو بھی عبادت ہی قرار دیا گیا ہے' بلکہ خالصتاً روحانی اعمال پر انہیں فضیلت دی گئی ہے اور بعد والے احکامات کی اجازت اس وقت ہے جب اولین احکامات پر عمل نہ کیا جا سکتا ہو' مذکورہ قرآنی آیت میں روزہ کفارہ' توبہ اور دعا کا بدل بیان کیا گیا ہے۔

{۱۳} سورہ المائدہ آیت ۹۴۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر تم برائی دیکھو تو اسے ہاتھ سے مٹا ڈالو' اگر یہ ممکن نہ ہو تو اسے زبان سے برا کہو۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو دل میں برا جانو اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے (بخاری و مسلم)۔

عہد نامہ قدیم میں بدلہ لینے اور عہد نامہ جدید میں درگزر کرنے کا حکم ہے۔ دیکھئے قرآن ان اجزاؤں کو ملا کر کس طرح مالیکول بناتا ہے۔

"برائی کا بدلہ برائی ہی ہے' لیکن جو کوئی معاف کردے اور صلح کرلے تو اس کو خدا کی طرف سے انعام ملے گا"

(سورہ الشوریٰ آیت ـ ۴۰)

"جان کے بدلے جان' آنکھ کے بدلے آنکھ' ناک کے بدلے ناک' کان کے بدلے کان' دانت کے بدلے دانت اور زخم لگانے کا قصاص دینا ہوگا' لیکن اگر کوئی بطور صدقہ معاف کردے تو یہ اس کے لئے کفارہ (معافی) بن جائے گا"۔

(سورہ المائدہ آیت ـ ۴۵)۔

نیز ارشاد ہوتا ہے :

"اے ایمان والو' اللہ نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے ان کو حرام مت ٹھہراؤ' لیکن زیادتی مت کرو' اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا"۔

(سورہ المائدہ آیت ـ ۸۷)۔

اسلام ایسا مذہب نہیں ہے جو انسان کو "زمین کی نعمتوں" سے محروم کردے یا ہر وقت یہ بتاتا رہے کہ وہ بھی منع ہے یہ بھی منع ہے۔ اسلام دنیا کو اور زمین کو "لعنت زدہ" قرار نہیں دیتا۔ {۱۴} اس کے برعکس اسلام اجازت دیتا ہے کہ اگر وضو کے لئے پانی نہ ملے تو مٹی کے ذریعے تیمم کرکے پاکی حاصل کی جاسکتی ہے۔ غیر مسلم معاشروں میں کچھ اصول ایسے ہیں جو اپنی اصل شکل اور اپنے عنوان کے لحاظ سے اسلامی محسوس

{۱۴} جس طرح عیسائیت یا بدھ مت کے پیروکار سمجھتے ہیں (مترجم)۔

ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جسم کی پاکیزگی اور نشہ آور اشیاء سے پرہیز انفرادی و اجتماعی حفظان صحت' جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ٹیکنالوجی اور شہری و متمدن آبادی میں سب سے بڑا مسئلہ شراب اور نشہ آور اشیاء ہی ہیں۔

اسلام کے مآخذ بھی اسی دوگانیت کے مظہر ہیں۔ قرآن اور حدیث اولین مراجع ہیں۔ تجربہ و مشاہدہ' وقت اور ابدیت' قول اور عمل' نظریہ اور زندگی اس میں یکساں ہیں۔ اسلام خیالی مذہب نہیں بلکہ کلیتہً عملی مذہب ہے۔ قرآن کے احکامات سے پتہ چلتا ہے کہ احادیث کے بغیر بہت سی چیزوں کا فہم حاصل کرنا ممکن نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی مثال سے اسلام نے اپنے آپ کو ایک عملی فلسفے اور جامع نظام کی صورت میں پیش کیا۔ اگر اسلام کے تیسرے فقہی مآخذ 'اجماع' کو بھی شامل بحث کیا جائے تو بھی صورت حال یہی رہتی ہے۔ اجماع کئی شرعی معاملات میں علماء کے اتفاق رائے کا نام ہے۔ طبری اور رازی کہتے ہیں' کہ یہ فیصلہ متفقہ ہونا چاہیے۔ اگر اسلام نے اجماع کا دروازہ نہ کھولا ہوتا' نیز صاحب علم دانشوروں کی رائے اور ان کے اتفاق کو اہمیت نہ دی ہوتی تو اسلام وہ نہ ہوتا جو آج ہے۔ اسلام میں دانش کے معیار اور کثرت آراء کی اہمیت بھی ہے۔

اس دوگانیت کی وضاحت کرتے ہوئے غار حرا اور مکہ کو بھی شامل کرنا مناسب رہے گا' کیونکہ یہ حقیقی دنیا اور اندرونی دنیا' نیز حرکت اور غوروفکر کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسلامی تاریخ کے دو ابواب پہلے مکہ اور پھر مدینہ کی زندگی کو ہر مؤرخ نے قلمبند کیا ہے' لیکن ایمان اور سیاست کی اصطلاح سے یہاں ایمانی معاشرہ اور منفعت بخش معاشرہ مراد ہیں۔

آخری بات یہ کہ شہید کو اسلام میں اعلیٰ ترین مقام حاصل ہے۔ اس سے خدا کی راہ میں جان دینے والا مراد ہے جو متقی بھی ہوتا ہے اور جنگجو بھی ہوتا ہے۔ شہید کی ذات میں وہ خصوصیات جمع ہیں جو مسیحیت کی رہبانیت میں دینی اور دنیاوی صورت میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ یہ تو خون اور ذہن کا یکجا ہونا ہے' یہ دو اصول ہیں جن کا سیاق الگ الگ ہے'

لیکن اسلام نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے۔

☐ مذہب اور فطرت کا ملاپ :

قرآن بار بار مطالبہ کرتا ہے کہ مشاہدے کے ساتھ ساتھ غور و فکر بھی کیا جائے۔
ایک مذہب ہے' دوسری سائنس ہے۔

قرآن نے بنے بنائے سائنسی اصول شامل نہیں کیے' بلکہ اس کی جگہ سائنسی اور مشاہداتی رویے کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے جو کہ مذاہب کے لحاظ سے عجیب بات سمجھی جاتی ہے۔ قرآن نے کائنات میں پھیلی ہوئی بہت سی حقیقتوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور انسان سے کہا ہے کہ وہ ان پر غور و فکر کرے۔ قرآن تو سائنس (پڑھنے) کے بارے میں حکم دیتا ہے اور اس کو خدا کے خلاف نہیں سمجھتا' بلکہ حکم دیتا ہے کہ اس کا آغاز ہی خدا کے نام سے ہو حکم ہوتا ہے۔ "اپنے رب کے نام سے پڑھو"۔ {۱۵}

انسان کو چاہیے کہ اس کائنات پر غورو فکر کرے جو خدا کا شاہکار ہے اور خود بخودوجود میں نہیں آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مشاہدہ سرسری نہیں ہے یہ سائنسی جستجو اور مذہبی جذبے کا مجموعہ ہے۔ قرآن نے فطرت کے بارے میں جو نشانیاں بیان کی ہیں' اس سلسلے میں وہ بہترین ثابت ہوئی ہیں اور کبھی کبھار وہ شعروں کے اوزان پر بھی پوری اتری ہیں: آیئے ان میں سے کچھ پر غور کریں۔

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں
رات اور دن کے
پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں

{۱۵} سورہ الفلق آیت ا۔

ان کشتیوں میں
جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے
دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں
بارش کے اس پانی میں
جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے
پھر اس کے ذریعے سے
مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے
اور زمین میں
ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے
ہواؤں کی گردش میں
اور ان بادلوں میں
جو آسمان و زمین کے درمیان
تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں
بے شمار نشانیاں ہیں
ان لوگوں کے لئے
جو صاحب عقل ہیں (۱۶)
دانے اور گٹھلی کو
پھاڑنے والا اللہ ہے
وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے
اور وہی
مردہ کو زندہ سے خارج کرنے والا ہے
یہ سارے کام کرنے والا تو اللہ ہے

پھر تم
کدھر بھٹکے چلے جا رہے ہو؟
پردہ شب کو
چاک کر کے وہی
صبح نکالتا ہے
اسی نے رات کو سکون
کا وقت بنایا ہے
اسی نے چاند اور سورج
کے طلوع و غروب کا
حساب مقرر کیا ہے
یہ سب اس زبردست قدرت
اور علم رکھنے والے کے
ٹھہرائے ہوئے اندازے ہیں
اور وہی ہے
جس نے تمہارے لئے تاروں کو
صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں
راستہ معلوم کرنے کا ذریعے بنایا
دیکھو
ہم نے نشانیاں
کھول کر بیان کر دی ہیں
ان لوگوں کے لئے

علم رکھتے ہیں

اور وہی ہے جس نے

ایک جان سے تم کو پیدا کیا

پھر ہر ایک کے لئے

جائے قرار ہے

اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ

یہ نشانیاں

ہم نے واضح کردی ہیں

ان لوگوں کے لئے

جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں

اور وہی ہے

جس نے آسمان سے پانی برسایا

پھر ان سے

تہ بہ تہہ چڑھے ہوئے دانے نکالے

اور کھجور کے شگوفوں سے

پھلوں کے گچھے کے گچھے

پیدا کیے

جو بوجھ کے مارے جھکے پڑتے ہیں

اور انگور' زیتون اور انار کے باغ لگائے

جن کے پھل

ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں

اور پھر

ہر ایک کی خصوصیات جدا جدا بھی ہیں

یہ درخت جب پھلتے ہیں

تو ان میں پھل آنے

اور پھر ان کے پکنے کی کیفیت

ذرا غور کی نظر سے دیکھو

ان چیزوں میں نشانیاں ہیں

ان لوگوں کے لئے

جو ایمان لائے ہیں {۱۷}

وہی ہے جس نے

آسمان سے تمہارے لئے پانی برسایا

جس سے تم خود بھی سیراب ہوتے ہو

اور

تمہارے جانوروں کے لئے بھی چارہ پیدا ہوتا ہے

وہ اس پانی کے ذریعے سے

کھیتیاں اگاتا ہے اور

زیتون اور کھجور اور انگور اور طرح طرح کے

دوسرے پھل

پیدا کرتا ہے

اس میں ایک بڑی نشانی ہے

ان لوگوں کے لئے

{۱۶} سورہ البقرہ آیت ۱۶۴۔

{۱۷} سورہ الانعام آیت ۹۹-۹۵۔

جو غور و فکر کرتے ہیں

اس نے تمہاری بھلائی کے لئے

رات اور دن کو

اور سورج اور چاند کو

مسخر کر رکھا ہے

اور سب تارے بھی اسی

کے حکم سے مسخر ہیں

اس میں بہت سی نشانیاں ہیں

ان لوگوں کے لئے

جو عقل سے کام لیتے ہیں

اور یہ جو بہت سی

رنگ برنگ کی چیزیں

اس نے

تمہارے لئے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں

ان میں بھی ضرور نشانی ہے

ان لوگوں کے لئے

جو سبق حاصل کرنے والے ہیں

وہی ہے جس نے

تمہارے لئے سمندر کو مسخر

کر رکھا ہے

تاکہ تم اس سے ترو تازہ گوشت

لے کر کھاؤ

اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو
جنہیں تم پہنا کرتے ہو
تم دیکھتے ہو کہ
کشتی سمندر کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے
یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ
تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور
اس کے شکرگزار بنو {۱۸}
اللہ نے آسمان سے پانی برسایا
اور یکایک
مردہ پڑی ہوئی زمین میں
اس کی بدولت جان ڈال دی
یقیناً اس میں ایک نشانی ہے
سننے والوں کے لئے
اور تمہارے لئے
مویشیوں میں بھی ایک سبق موجود ہے
ان کے پیٹ سے
گوبر اور خون کے درمیان ہم
ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں
یعنی خالص دودھ
جو پینے والوں کے لئے نہایت خوشگوار ہے

{۱۸} سورہ النحل آیت ۱۴۔۱۰۔

کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں

سے بھی ہم ایک چیز تمہیں پلاتے ہیں

جسے تم نشہ آور بنا لیتے ہو

اور پاک رزق بھی

یقیناً اس میں ایک نشانی ہے

عقل سے کام لینے والوں کے لئے

اور دیکھو

تمہارے رب نے شہد کی مکھی پر یہ بات وحی کر دی

کہ پہاڑوں میں

اور درختوں میں

اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں

اپنے چھتے بنا

اور ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس

اور اپنے رب کی

ہموار کی ہوئی راہوں پر چلتی رہ۔

اس مکھی کے اندر سے

رنگ برنگ کا ایک شربت نکلتا ہے

جس میں شفاء ہے لوگوں کے لئے

یقیناً اس میں بھی ایک نشانی ہے

ان لوگوں کے لئے

جو غور و فکر کرتے ہیں (۱۹)

"اور وہ اللہ ہی ہے

جس نے رات اور دن بنائے
اور سورج اور چاند کو پیدا کیا
سب
ایک ایک فلک میں
تیر رہے ہیں {۲۰}

کتنی ہی خطاکار بستیاں ہیں
جن کو ہم نے تباہ کیا ہے
اور آج وہ اپنی
چھتوں پر الٹی پڑی ہیں
کتنے ہی کنویں بیکار
اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں
کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں
کہ ان کے دل سمجھنے والے
یا ان کے کان سننے والے ہوتے
حقیقت یہ ہے کہ
آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں
مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں

{۱۹} سورہ النحل آیت ۶۹۔۶۴۔

{۲۰} سورہ الانبیاء آیت ۳۳۔

جو سینوں میں ہیں {۲۱}

اور کیا انہوں نے کبھی
زمین پر نگاہ نہیں ڈالی
کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں
ہر طرح کی عمدہ نباتات
اس میں پیدا کی ہیں {۲۲}

اور کیا یہ لوگ
کبھی زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں
کہ انہیں
ان لوگوں کا انجام نظر آتا
جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں
وہ ان سے زیادہ طاقت رکھتے تھے۔
انہوں نے زمین کو خوب ادھیڑا تھا
اور اسے اتنا آباد کیا تھا
جتنا انہوں نے نہیں کیا ہے
ان کے پاس ان کے رسول

{۲۱} سورہ الحج آیت ۴۶۔۴۵۔

{۲۲} سورہ الشعراء آیت ۷۔

روشن نشانیاں لے کر آئے
پھر اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا
مگر وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے {۲۳}

اچھا' تو کیا انہوں نے کبھی
اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا'
کس طرح ہم نے اسے بنایا
اور آراستہ کیا
اور اس میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے
اور زمین کو ہم نے بچھایا
اور اس میں پہاڑ جما دیئے
اور اس کے اندر ہر طرح کی خوش منظر نباتات اگا دیں
یہ ساری چیزیں
آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں
ہر اس بندے کے لئے
جو حق کی طرف رجوع کرنے والا ہے
اور آسمان سے ہم نے برکت والا پانی نازل کیا
پھر اس سے باغ اور غلے کی فصل اور
بلند و بالا کھجور کے درخت پیدا کر دیئے

{۲۳} سورہ الروم آیت ۹۔

جن پر پھلوں سے لدے ہوئے خوشے

تہ بہ تہ لگتے ہیں

یہ انتظام ہے

بندوں کو رزق دینے کا

اس پانی سے ہم ایک مردہ زمین کو زندگی بخش دیتے ہیں

(مرے ہوئے انسانوں کا)

زمین سے نکلنا بھی اسی طرح ہوگا {۲۴}

تو کیا یہ اونٹوں کو نہیں دیکھتے

کہ کیسے بنائے گئے

آسمان کو نہیں دیکھتے

کہ کیسے اٹھایا گیا ہے

پہاڑوں کو نہیں دیکھتے

کہ کیسے جمائے گئے؟

اور.......

زمین کو نہیں دیکھتے

کہ کیسے بچھائی گئی؟ {۲۵}

کیا تم نے کبھی سوچا

{۲۴} سورہ ق آیت ۱۱-۲۔

{۲۵} سورہ الغاشیہ آیت - ۲۰ - ۱۷۔

یہ بیج جو تم بوتے ہو

....

یہ پانی جو تم پیتے ہو

....

یہ آگ جو تم سلگاتے ہو؟ {۲۶}

مذکورہ بالا تمام آیات میں مکمل طور پر فطرت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اوپر جو آیات درج کی گئی ہیں ان سب میں فطرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دنیا کے مظاہر فطرت کو تسلیم کیا گیا ہے اور ان میں کہیں بھی فطرت کے ساتھ ٹکراؤ کی کیفیت نہیں ہے۔ اسلام کے اندر بہت سے اعلیٰ اعمال کے اندر مادے کو سمو لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر جسم اور نماز کا فعل ہے یا ریاست اور زکوۃ کا فعل ہے۔ مادی دنیا "شیطان کا کارخانہ" نہیں ہے۔ نہ ہی جسم گناہوں کی جائے قیام ہے"۔ یہاں تک کہ قرآن اس دنیا کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی بھی اسی دنیا کی مثالوں سے وضاحت کرتا ہے۔ مسیحی اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں دنیاداری کا شائبہ ہے جو مذہب سے متصادم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کی زندگی اسلام میں الگ سے کوئی چیز نہیں ہے۔

قرآن کے اندر بہت سی ایسی آیات ہیں جو فہمیدہ دماغوں اور تلاش کرنے والے ذہنوں کو بیدار کرتی ہیں۔ "ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے تخلیق کیا"{۲۷} یا "یہی پانی (درختوں اور پھلوں) کو دیا جاتا ہے' لیکن ان کے ذائقے الگ الگ ہوتے ہیں۔ یہ نشانیاں

{۲۶} سورہ الواقعہ آیت ۔ ۷۱ - ۶۳

{۲۷} قرآن مجید سورہ الانبیاء آیت ۳۵۔

ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں" {۲۸}۔

یہ آیت خاص طور پر ذہنوں کو غور و فکر پر ابھارنے والی ہے۔ اس میں ایک ایسی بات بیان کی گئی ہے جو علم کیمیا کی بنیاد ہے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے مادے اور ٹھوس اشیاء کے متعلق لامحدود بحث کو ختم کردیا جو عیسائیت کے زیر اثر تھی اور انہوں نے علم کیمیا کی طرف توجہ دی۔ متصوفانہ فلسفے سے منطقی سائنس کی طرف یہ ایک واضح قدم تھا۔ اوپر جو حوالے قرآن سے بیان کیے گئے ہیں ان میں یہی حکم دیا گیا ہے کہ مشاہدہ کریں اور مشاہدہ ایسی چیز ہے جس کے ذریعے انسان نے تمام کائنات اور اس کے مظاہر پر قوت و قدرت حاصل کی ہے۔

مغرب کے بارے میں ناقدانہ جائزہ لینے سے معلوم ہوگا کہ مغرب کی قوت کا راز ان کی فوجوں اور ان کی اقتصادیات میں پوشیدہ نہیں ہے۔۔ یہ تو کچھ چیزوں کی ظاہری نشوونما ہے۔ مغرب کی قوت کا راز مشاہدہ اور تجرباتی طریق فکر ہے اور یہ چیز اہل مغرب نے بیکن سے سیکھی ہے {۲۹}۔

جین فراسے لکھتا ہے :

"مغربی دنیا میں فطرت،معاشرے اور لوگوں کا مشاہدہ بنیادی تعلیم کا اولین درجہ ہے جو اہل مغرب اپنے بچوں کو ابتداء ہی میں سکھاتے ہیں۔ برہمن اور بدھ فلسفی تو اس خیال کی نفی کرتے ہیں' کیونکہ یہ دونوں مذاہب بیرونی دنیا سے اندرونی دنیا کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ سوچ غلط ہے کہ جن لوگوں نے گلیلیو' پاسکل' نیوٹن اور کلاڈ برنارڈ کی تجرباتی فکر کے اصولوں کو نہیں اپنایا وہ بعدازاں ترقی کی شاہراہ پر نہیں چڑھ سکیں گے۔ ہر معاشرتی اور اقتصادی

{۲۸} قرآن مجید سورہ المائدہ آیت ۴۔

{۲۹} اور بیکن نے یہ چیز مسلمانوں سے سیکھی ہے۔ اسی کتاب کا گیارھواں باب دیکھئے۔

ترقی کی بنیادی شرط فکری رویے میں تبدیلی پر منحصر ہے۔ ایک ایسی تبدیلی جو مطلق کو ٹھوس سے، منطق کو تجرباتی سے اور ٹھہراؤ کو ایجاد و اختراع سے بدل دے" {۳۰}۔

یہ ناممکن ہے کہ اسلام پر عمل کیا جائے جبکہ شعور اور فہم بالکل ابتدائی درجے پر ہو۔ نماز کو اسی وقت صحیح طریقے سے ادا کیا جاسکتا ہے جب وقت اور مقام کے بارے میں صحیح اندازہ ہو۔ نماز میں لوگ مکہ میں کعبے کی طرف رخ کرتے ہیں یعنی سمت کا تعین کرتے ہیں۔ نماز کی ادائیگی کے لئے اوقات کا تعین ضروری ہے اور یہ تعین فلکیاتی علم ہی سے ممکن ہے۔ نماز اس وقت ادا کی جاتی ہے جب کہ سورج کے گرد گھومتے ہوئے زمین اپنے مدار میں ایک خاص مقام پر ہوتی ہے۔ زکوۃ کی ادائیگی میں بھی شماریات اور حساب و کتاب کا دخل ہوتا ہے۔ حج کا تعلق سفر کے ساتھ ہے۔ یہ ضروری ہے کہ یہ طویل سفر کرنے والے کے پاس معقول معلومات ہوں۔ باقی تمام چیزوں کو چھوڑ کر صرف ان چار ارکان اسلام کا جائزہ لیجئے - صرف ان عبادتوں کی ادائیگی سے کوئی بھی شخص تہذیب کے کم سے کم درجے تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص مسلمان بھی ہو اور وحشت و جہالت کا شکار بھی رہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ رجحان پیدا کیا گیا۔ اسلامی سائنس کی تاریخ کے معروضی مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ظہور اسلام کے بعد اولین صدیوں میں سائنسی علوم کی ترقی کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب اسلام کی تعلیمات کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے سلسلے کا آغاز ہوا۔

وادیٔ فرات میں جب اسلام پہنچا تو اس کا سامنا ستارہ پرستی سے ہوا اور اس علم کے

{۳۰} Jean Fourastie : The Civilization of Tomorrow

(Zagreb) P. 47-48.

جاننے والوں کے پاس تین ہزار سال ماسبق کی معلومات تھیں، لیکن چونکہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کی قسمت کا ستاروں سے کوئی تعلق نہیں ہے"اسلام کی وحدانیت اور منطقیت نے ستارہ پرستی کو علم فلکیات میں تبدیل کردیا۔ بغداد کے قریب فلکیات کے مطالعے اور تحقیق کے متعلق ایک رصد گاہ تھی اس کے متعلق سیدلٹ کہتا ہے :

"آغاز ہی سے بغداد کے فلکیاتی طبقہ فکر کی نمایاں خصوصیت اس کا سائنسی طرز استدلال رہا ہے۔ معلوم سے نا معلوم کو تلاش کیا جائے اور کسی ایسی چیز کو تسلیم نہ کیا جائے جس کو مشاہدے کے ذریعے ثابت نہ کیا جاسکے"۔

خیام نے جو تقویم تیار کی وہ گریگورین کیلنڈر کے بہت قریب ہے جسے ہم آجکل استعمال کرتے ہیں" {۳۱}۔

طلیطلہ کے گوشوارے جن کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ انہیں ابراہیم الزرقانی نے تیار کروایا تھا، ان گوشواروں کی مدد سے سیاروں کی حرکات کا مطالعہ کیا جاتا تھا اور یہ طویل عرصے تک یورپی فلکیات کے ماخذ کا کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ البیرونی نے نظریہ پیش کیا کہ آسمان نہیں، بلکہ زمین اپنے محور پر گھومتی ہے۔ ابن بجاہ نے دعویٰ کیا کہ سیاروں کے مدار بیضوی ہوتے ہیں گول نہیں ہوتے۔

فطری سائنس اور فلکیات میں یہ گہری دلچسپی اولین صدیوں میں قرآن کے براہ راست مطالعے کا نتیجہ تھی۔ تاریخ کے ابواب میں وہ باب نہایت روشن ہیں جن میں مذہب نے سائنس کی طرف راہنمائی کی ہو۔

مذہب اور سائنس کو یکجا کرنے کی یہ کوشش جو خالصتاً ایک اسلامی رجحان ہے اس کا اندازہ مساجد اور مدرسوں کی یکجا تعمیر سے لگایا جاسکتا ہے۔ مساجد کے ساتھ مدارس کی تعمیر کا سراغ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور سے شروع ہوا۔ اس نظام کو خلیفہ

{۳۱} Llewelyn Powys: "Omar Khayyam" Rats in the Sacristy Freeport New York : (Books for Libraries Press 1969).

ہارون الرشید (۸۰۸-۷۸۶) کے دور میں دوبارہ منظم کیا گیا۔ مساجد اور مدارس کی الگ الگ تعمیر کا سلسلہ بہت بعد میں شروع ہوا اور دینی مدارس قائم کیے گئے' لیکن مدارس میں جو تعلیم دی جاتی تھی اس کے اندر ظاہر و باطن کی یکسوئی یعنی "دوگانہ یکجہتی" کے اصول کو کارفرما رکھا گیا۔

رائزلر کہتا ہے :

"پوری تاریخ میں مسجد صرف عبادت کی جگہ کبھی بھی نہیں رہی۔ اسلام کے اولین ادوار میں ہر وہ جگہ جہاں نیک لوگ اکٹھے ہوتے ہوں چاہے یہ مدرسہ ہو' بازار ہو' منڈی ہو یا چوپال ہو' اس کو مسجد سمجھ لیا جاتا تھا" {۳۲}۔

اس طرز فکر اور رجحان کا اظہار اسلام کے ثقافتی دائرے میں ہوا۔ مسجد ـــــ مکتب' ایک منفرد عمارت' جس نے دو خدمات سرانجام دینا ہوتی تھیں اور یورپ کی زبانوں میں اس لفظ مسجد ـــــ مکتب' کا متبادل لفظ موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ فرانسیسی زبان ہے جس میں دو الفاظ کو جوڑ کر Mosque Ecole بنایا گیا ہے"۔ {۳۳}

مسجد مکتب کی تعمیر اسلام کے اس نظریے کی مظہر ہے کہ مذہب اور سائنس الگ الگ نہیں ہیں اور اسلام کی اولین وحی میں یہی حکم دیا گیا تھا کہ "اپنے رب کے نام سے پڑھو"۔ {۳۴}

یہ مدارس جو پروگرام کرتے اور جو تربیت فراہم کرتے اس میں اسی بنیادی تصور کی

{۳۲} Risler : La Civilization: Arabe P. 128.

{۳۳} تاریخی گواہی موجود ہے کہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اولین مدرسہ مسجد نبوی کے ساتھ تعمیر کیا تھا اور اس کا نام صفہ تھا۔

{۳۴} قرآن مجید سورہ العلق آیت ۱

عکاسی ہوتی۔ بغداد کا معروف مدرسہ نظامیہ اسلامی مدارس کے قیام کے سلسلے میں اولین بہترین نمونے کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ اہل یورپ اسے "ایک اعلیٰ مذہبی مدرسہ" سمجھتے رہے ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے نصاب میں "مذہبیات" کا مضمون بھی شامل تھا اس میں تفسیر حدیث' اخلاق' عقائد پڑھائے جاتے تھے' لیکن قانون' فلسفہ' ادب' ریاضی' فلکیات کی تدریس بھی اس کے ساتھ لازم تھی۔ {۳۵}نظامیہ طرز کے مدرسے دوسرے مدارس کے لئے مثال بنے اور تمام بڑے بڑے اسلامی شہروں میں اس کی پیروی میں اسی طرز کے مدارس قائم ہوئے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی دنیا میں مدارس اور تعلیمی اداروں کی تقسیم اس طرز پر نہیں کی جاسکتی جس طرح یورپ میں مذہبی اور غیرمذہبی تعلیمی اداروں میں پائی جاتی ہے ایسے ادارے مسلمانوں کے لئے غیر فطری نہیں تھے کیونکہ ان کی تعلیم کا خمیر اسی سے اٹھا تھا۔ یہ روح اور جذبہ آج تک کارفرما ہے اور جہاں کہیں اس کے برعکس ہوا ہے اس کو بیرونی اثرات کا سبب کہا جاسکتا ہے۔ قاہرہ کی جامعہ الازہر' جو سب سے بڑی اور اسلامی جامعات میں سب سے پرانی ہے۔ (اس کی بنیاد ۹۷۲ء میں رکھی گئی تھی) وہ بھی بیک وقت مسجد اور جامعہ ہے۔ ابتداء میں یہ ایک جامعہ ہی تھی اور جس زمانے میں یہ جامعہ مذہبی تعلیم کے لئے مخصوص ہوکر رہ گئی وہ انتہائی انحطاط کا زمانہ تھا۔ ۱۹۶۱ء میں ہونے والی اصلاحات میں جامعہ الازہر نے اپنے پرانے کردار کو ازسرنو بحال کیا اور جامعہ کی عمارتی حدود کے اندر میڈیکل اور ٹیکنیکل فیکلٹی قائم کی گئی۔ پاکستان میں حکومت کی طرف سے اماموں کی یہ ذمہ داری لگائی گئی ہے کہ وہ خواندگی کی عوامی مہمات کے کورس چلائیں۔ یہ ایک صحیح اقدام ہے۔ اسی قسم کی مثال ایران میں ملتی ہے جہاں تعلیم یافتہ فوجی اپنی ملٹری خدمات کے ساتھ ساتھ ان پڑھ لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتے ہیں اور یہ مساجد

{۳۵} دیکھیے رائزلر

تعلیمی ادارے کا کردار ادا کرتی ہیں مسجد ـــــ مکتب ان علامتوں میں سے ہے جس میں نہ تو کسی چیز کا اضافہ کیا جاسکتا ہے اور نہ کمی کی جاسکتی ہے۔

اسلام کے طرز فکر نے انسان کے بارے میں خالص حقیقت پسندانہ رویے کو پروان چڑھایا۔ فطرت کی حقیقت کو قبول کرنے نے انسانی فطرت کو قبول کرنے کی طرف مائل کیا۔ اس دنیا کا انکار' جس کا لازمی نتیجہ انسانی جسم کا انکار ہے۔ ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ اسلام تو جسم کے وجود اور ضروریات کو تسلیم کرتا ہے جبکہ عیسائیت کو اس پر مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ جسم اور وجود کو سمجھے۔ قرآن کی کچھ آیات ایسی ہیں جو معروف دینی تصور سے ذرا مختلف محسوس ہوتی ہیں (مثال کے طور پر جن کا تعلق مسرت حاصل کرنے' صنفی محبت' جدوجہد اور حفظان صحت سے ہے) انسانیت کی تاریخ اور انسانی ذہن کی تاریخ میں یہ ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ لیکن یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلام "دونوں عالموں کا دین" ہے۔ یہ انسانی زندگی کے جملہ پہلوؤں کا دین ہے یہ اس چیز کا اظہار ہے کہ سائنس کی تلاش میں انسان کو مذہب کا انکار نہ کرنا پڑے گا اور مذہب کی خاطر بہتر زندگی کی جدوجہد کو ترک نہ کرنا پڑے گا۔ اسلام کی جامع حیثیت اس چیز سے واضح ہوتی ہے کہ اس نے مصائب و مشکلات کے وجود سے آنکھیں نہیں چرائی ہیں اور نہ ہی مصائب و مشکلات کو دور کرنے کی جدجہد اور جنگ کو ممنوع قرار دیا ہے جو انسانی تاریخ کا خاصہ ہے۔

انسان کی عظمت اور وقار کو تسلیم کرنے کے ساتھ اسلام نے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا ہے لیکن انسان بطور "فرد" کا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کا کردار "غیر شخصیت پرستانہ" ہے۔ اسلام ان خصوصیات کو تسلیم کروانے کی جدوجہد نہیں کرتا جو انسانی فطرت میں رچی بسی نہیں ہیں۔ اسلام نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ انسان فرشتے بن جائیں کیونکہ یہ غیر ضروری ہے۔ اسلام نے تو ہمیں وہ بنانے کی کوشش کی ہے جو ہم ہیں یعنی "انسان"۔ ترک دنیا سے واقف ہونے کے باوجود اسلام نے کبھی انسانی زندگی' صحت' ذہن' معاشرت' تمناؤں اور مسرتوں کو تباہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ترک دنیا کا ایک حد تک

درجہ تو ہے تاکہ ہماری خواہشات کو حدود میں رکھا جائے اور ہمارے جسم و روح کے درمیان ایک توازن قائم کردیا جائے اور ہماری حیوانی اور اخلاقی خواہشات کے درمیان عدل قائم کردیا جائے۔ وضو' نماز' روزہ' جماعت' سرگرمی' مشاہدے' جدوجہد' غور و فکر کے ذریعے اسلام انسان کو اجازت دیتا ہے کہ وہ فطرت کو اپنا کام کرنے دے۔ فطرت کی مخالفت کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ یہ سلسلہ تو اس وقت بھی چلتا رہتا ہے جب اہداف یکساں نہ بھی ہوں۔

اگرچہ دین اسلام کا یہ وہ رویہ ہے جس نے دوسرے گروہوں کے دلوں میں غلط فہمیاں پیدا کردی ہیں اور وہ آج تک باقی ہیں۔

کچھ لوگوں نے اسلام پر نظری حملے کیے' اس کی ظاہری دنیا پرستی کو ہدف تنقید بنایا اور اس کے لئے قرآن کی آیات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تک درج کیں۔ ہم صاف اور واضح انداز میں بیان کردینا چاہتے ہیں کہ ہاں اسلام ایک فطری زندگی کی وکالت کرتا ہے اور ترک دنیا کا مخالف ہے' خوشحالی کے حق میں ہے اور غربت کے خلاف ہے۔ اسلام اس بات کے حق میں ہے کہ صرف اس سیارے پر ہی نہیں' بلکہ ساری کائنات پر انسان کا اقتدار پھیلا دیا جائے' لیکن اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ہمیں فطرت خوشحالی' سیاست' سائنس' قوت اور علم پر بھی نگاہ ڈالنی چاہیے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے اس طریقہ کار سے ہٹ کر راہ عمل اختیار کرنا چاہیے جو اہل مغرب نے اختیار کر رکھا ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ انسان تمام ذمہ داری خود قبول کرے۔ غربت' ترک دنیا اور ایذابخش زندگی کو اسلام معیاری زندگی قرار نہیں دیتا۔ {۳۶}یہ انسان کو "زمین کا نمک" اور بڑے نمکین سمندر کو "چکھنے سے منع نہیں کرتا" {۳۷}۔

{۳۶} آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے"۔ حاشیہ {۳۷} آ گے ہے۔

اسلام ایک مکمل اور بھرپور زندگی کی تربیت دیتا ہے {۳۸} اس زندگی کے دو پہلو ہیں' ایک تو مسرت اور اختیار کی فطری خواہش ہے اور دوسرا اخلاقی کمال ہے۔ "جو فرد کی مستقل تخلیق ہے"۔ یہ خواہشات صرف منطق و فلسفہ میں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہے' لیکن عملی زندگی میں یہ دونوں یکساں ہیں۔ ہماری زندگی میں اور ہماری آنکھوں کے سامنے ان کا بار بار ظہور کئی صورتوں میں ہوتا ہے۔ یہ امکان صرف اور صرف انسان کو دیا گیا ہے اور وہی اس کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکتا ہے۔

انجیل روح کے متعلق بات کرتی ہے اور جذبات کی نفی کرتی ہے۔ قرآن جذبات کو ان کا مقام دیتا ہے کیونکہ یہ حقیقی ہیں۔ اگرچہ جذبات ہی بہت زیادہ اہم نہیں ہیں۔ قرآن ان جذبات کا ذکر کرتے ہوئے انہیں سمجھتا ہے' ان کا ذکر الزام کے طور پر نہیں کرتا۔ فرشتوں نے جب انسان کے آگے سر جھکا دیا {۳۹} تو انسانوں کی فرشتوں پر برتری ثابت ہو گئی۔ تمام انسان اس قدر نفیس اور شریف النفس نہیں ہیں کہ وہ تمام کے تمام نیکی کی طرف مائل ہوں۔ انسان کمزور ہوتے ہیں اپنے اندر تضاد رکھتے ہیں' خواہشات اور تمناؤں کے درمیان گھرے رہتے ہیں۔ اگر ہم یہ غیر فطری تمنا کریں کہ وہ گناہوں اور تمناؤں سے پاک صاف ہوجائیں تو ہمیں احساس ہوگا کہ ہمارے پاس' خون سے محروم جذبات سے محروم' ایسی شخصیات ہیں جو نیکی اور برائی کے تصور کو سمجھنے ہی کی اہل نہیں

{۳۷} Andre Gide : Fruits of the Earth. Trans. Dorothy Bussy (London : Secker and War-burg 1962).

{۳۸} اے ایمان والو ! اللہ نے کھانے کی جو اچھی چیزیں تمہیں دی ہیں ان سے مت رکو لیکن اسراف مت کرو۔

{۳۹} سورہ البقرہ آیت ۳۴

ہیں۔ اگر ان کو زمین سے الگ کردیا جائے تو ہم انہیں زندگی سے الگ کردیں گے اور اگر زندگی ہی نہ ہوگی تو نیکی بھی نہ ہوگی۔

فرائڈ نے ثابت کیا کہ جنسیت کو ختم نہیں کیا جاسکتا' دبایا جاسکتا ہے۔ دبی ہوئی صنفی خواہش مزید مشکلات پیدا کرتی ہے۔ طہارت اور حیاء کے متعلق مسیحی نظریات کتنے ہی شائستہ کیوں نہ ہوں' ایک محدود اور مناسب صنفی زندگی کا اسلامی نظریہ انسان کے لئے زیادہ بہتر ہے' کیونکہ اس طرح یہ انسان کی فطرت کو تسلیم کرلیتا ہے۔ اس لئے اسلام بنیادی طور پر صرف مذہب نہیں ہے۔ انسان کی صنفی زندگی کے دلائل منطقی، عقلی اور عملی ہیں مذہبی نہیں ہیں۔

اس وقت زیر بحث سوال یہ ہے کہ انسان کی اپنے ساتھ ہم آہنگی کتنی ہے' اس کے خیالات اس کے فطری' جسمانی' سماجی اور ذہنی رویوں کے درمیان کتنی ہم آہنگی ہے۔ اس بنیادی مسئلے میں تضادات ذہنی بیماریوں کو جنم دیتے ہیں اور ان کو تقویت اس وقت ملتی ہے جب انسان اور اس کے ماحول میں اختلاف اور تضاد پیدا ہوتا ہے۔

قرآن فرد کو بہت کم مخاطب کرتا ہے۔ اس کا مجموعی خطاب لوگوں سے ہے۔ معاشرے کا ممبر ہونے کے سبب انسان اس دنیا کا ایک بچہ ہے اور ایک شخصیت کے طور پر وہ جنت کا باسی ہے۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ خوشی اور غم میں شریک ہوتا ہے اور اس کی انسانی خصوصیات اسے ایک سماجی حیوان بنا دیتی ہیں۔ اگر فرد اور معاشرہ الگ الگ ہوں' ان کے خیالات اور ماڈلز الگ الگ ہوں تب تو معاشرے اور فرد کے درمیان اختلاف ابھر کر رہتا ہے۔ اسلام عیسائیت کی تشریح والی محبت کی بجائے انصاف کو اپنا نظام قرار دیتا ہے۔ {۴۰} اسلام چاہتا ہے کہ انسان کی بطور مسلمان اور بطور شہری تربیت بیک

{۴۰} سورہ النساء آیت ۱۳۵' سورہ المائدہ آیت ۹ سورہ الانعام آیت ۱۵۹' سورہ الاعراف آیت ۸۴'۲۸

وقت ہو' کیونکہ انصاف ایک ذاتی اور سماجی نیکی ہے۔ ارسطو نے اسے "سیاسی بھلائی" قرار دیا ہے۔ {۴۱} اسی لئے ہم ایک مسلمان سے یہ امید کرسکتے ہیں کہ کسی بھی دوسرے انسان کی نسبت وہ اس تربیت کے سبب اپنے ماحول کے لئے زیادہ بہتر ہوگا۔ مسیحی تعلیمات ناامیدی اور عدم تحفظ کی طرف لے جاتی ہیں کیونکہ یہاں حقیقت اور خواہش کے درمیان' نیز نظریے اور عمل کے درمیان اختلاف ہے۔

یورپی انسانوں کے اعصابی اور نفسیاتی امراض عیسائی تعلیمات کا نتیجہ ہیں' کیونکہ عیسائیت نے ایک مثالی انسان کا جو نقشہ پیش کیا ہے اور معاشرے کے سیاسی نمونے جس طرز پر پروان چڑھائے ہیں ان میں ناقابل عبور اختلاف ہے۔ چنانچہ ایک ایسی حالت پروان چڑھتی ہے جہاں گرجا روحانی ضروریات کا خیال کرتا ہے اور ریاست فرد کی جسمانی فلاح کے پروگراموں کو منظم کرتی ہے

"جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو' اور جو قیصر کا ہے وہ قیصر کے حوالے کردو"۔

مغربی انسان کو اجازت دی گئی ہے کہ اپنی نجی زندگی میں مسیحی بن جائے اور عوامی اور کاروباری زندگی میں میکیاولی کا پیروکار بن جائے' جو لوگ اس تضاد سے مفاہمت نہیں کرپاتے یا جو اس تضاد کو برداشت نہیں کرسکتے وہ اعصابی و نفسیاتی امراض کا شکار بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جن لوگوں نے مسلم دنیا کا مطالعہ کیا ہے انہوں نے فرد اور معاشرے میں ایک ناقابل تردید ہم آہنگی پائی ہے۔ انہوں نے فرد کو معاشرتی نظام میں مربوط دیکھا ہے اور ایک ایسی یگانگت پائی ہے جو مصنوعی نہیں' بلکہ قانونی' سیاسی' گہری اور ٹھوس ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ وہاں غربت بھی ہے اور قدامت بھی ہے۔

{۴۱} Aristotle: Politics Trans. H. Rackham (Cambridge Masachustess Unoversity Press 1959).

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ انتہائی طرز عمل کی مخالفت کی۔ آپ نے فرمایا'
مجھے دو چیزیں ناپسند ہیں' وہ ان پڑھ شخص جو امید رکھتا ہے اور وہ عالم جو یقین نہیں رکھتا۔
{۴۲} اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ اور چیزوں سے بھی بیزاری کا اعلان
کیا مثلاً ایسے اہل ایمان جو اقتدار سے محروم ہوں اور ایسے حکمران جو ایمان نہ رکھتے
ہوں' میلے کچیلے جسم میں ایک پاک روح اور ایک صحت مند جسم میں بدکار روح'' انصاف
کے بغیر قوت اور قوت کے ساتھ ظلم کو آپ نے ناپسند فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ
وسلم نے کبھی بھی خوشحالی اور فراغت کو ناپسند نہیں فرمایا' لیکن آپ پسند فرماتے تھے کہ
خوشحالی کے عالم میں نیکی کی جائے' ایسی نیکی کو پسند نہیں فرماتے تھے جو محفوظ نہ ہو اور
جس کی حفاظت نہ کی گئی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم' ظلم' جہالت' بیماری' فساد اور
غلاظت کے خلاف جدوجہد کو اعلیٰ درجے کی اخلاقی خوبی قرار دیتے تھے۔ مسلمان صوفی تو
نہیں ہیں چاہے وہ نمازیں پڑھتے ہوں اور روزے رکھتے ہوں۔ وہ عام مرد اور عورتیں ہیں
جو محبت اور زندگی کی شادمانیوں کے خواب دیکھتے ہیں۔ وہ زندگی کا حصہ ہیں' انسان ہیں اور
زندگی کی طرف لوٹتے ہیں۔ وہ بستیوں سے دور غاروں میں جاکر نہیں رہتے نہ وہ اپنی ذات
ہی سے غافل رہتے ہیں' نہ وہ اپنے آپ کو دشمنوں کے رحم و کرم پر چھوڑتے ہیں' نہ وہ
خدا کی ان نعمتوں کو جھٹلاتے ہیں' جو خدا نے انہیں عطا کی ہیں ۔ {۴۳} وہ اندرونی
آزادی کو کافی نہیں سمجھتے' ہر شخص آزادی پر یقین رکھتا ہے۔ وہ جسمانی اور ظاہری آزادی
پر یقین رکھتے ہیں اور غلاموں کی طرح رہنا پسند نہیں کرتے۔ اگرچہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا
کی یہ زندگی اصل زندگی نہیں ہے پھر بھی وہ اس زندگی سے دستبردار نہیں

{۴۲} Ralph Walds Emerson' The Conduct of Life Nature and other essays. (New York : E.P. Dutlon & Co. 1915).

{۴۳} سورہ المائدہ آیت ۹۰

ہوتے۔ قرآن زمین کے حقیقی وارثوں کا اس طرح ذکر کرتا ہے۔

(اللہ کے بندے اور زمین کے وارث تو وہ ہیں جو) زمین پر نرم چال چلتے ہیں' اور اپنے رب کی نعمتوں کو تلاش کرتے ہیں"۔

اسلام کی تعریف یہ بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ جسمانی اور دنیاوی زندگی گزارنے کی مکمل ضرورت کا نام ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ زندگی گزارتے ہوئے "مادی دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو"۔ اس تعریف کی رو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تمام انسان یا ان کی اکثریت پیدائشی طور پر مسلمان ہیں۔ {۴۴} یہی چیز آنحضرت محمد ﷺ نے اپنے ایک ارشاد میں بیان فرمائی ہے کہ پیدائش کے وقت ہر بچہ مسلمان ہوتا ہے اور بعد میں اس کے لواحقین اور حالات اسے کسی اور مذہب کا پیروکار بنا دیتے ہیں۔کوئی شخص عیسائی نہیں ہوسکتا کیونکہ "خدا کسی شخص پر ایسا بوجھ نہیں ڈالتا جو وہ اٹھا نہ سکتا ہو۔ اس کے باوجود انسان ایک حیاتیاتی وجود کے طور پر زندہ نہیں رہ سکتا نہ ہی معاشرے کے جزء کے طور پر رہ سکتا ہے۔ انسان صرف حیاتیاتی سچائیوں کے مطابق نہیں رہ سکتا اور نہ مذہبی اصولوں کے خلاف زندگی گزار سکتا ہے۔ زمین پر انسان کی زندگی انہی دو متضاد عوامل کے درمیان گھومتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام انسان کے لئے مناسب ترین ہے کیونکہ یہ اس کی فطرت کی دوگانیت کو تسلیم کرتا ہے۔ اگر کسی ایک پہلو کی طرف نگاہ رکھی جائے تو زندگی کا دوسرا پہلو متاثر ہوجائے گا۔ اس طرح انسانی قوتوں کا مکمل استعمال نہ ہوسکے گا اور ان کے اندرونی تضادات ظاہر ہونا شروع ہوجائیں گے۔

{۴۴} "اگر یہ اسلام ہے تو ہم سب اسلام میں رہ رہے ہیں" گوئٹے۔

❑ اسلام اور زندگی :

دوگانیت ایک اعلیٰ ترین انسانی فلسفہ ہی نہیں' بلکہ زندگی کی اعلیٰ ترین شکل بھی ہے۔ شاعری اصلاً تو دل کا معاملہ ہے' لیکن دنیا کے بڑے بڑے شاعر مثلاً ہومر' فردوسی' دانتے' شیکسپیئر' گوئٹے وغیرہ نے اپنی شاعری میں دلیل اور جذبات کو اکٹھا کر دیا ہے۔ فطرت اور حسن کو ملا دیا ہے۔ شاعری فرد کو مخاطب کرتی ہے معاشرے کو نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہومر کی شاعری نے یونانی قوم کی تعمیر میں مدد دی اور وا ٹیٹر کی ناراض نظموں نے امریکہ میں غلامی کے خاتمے میں مدد دی۔ ریاضی کا تعلق ذہن سے ہوتا ہے' تاہم ''ایک اچھے ریاضی دان کو ایک اچھا شاعر بھی ہونا چاہیے''۔{۴۵} اعلیٰ درجے کے ماہرین طبیعیات اور ماہرین فلکیات ایک لحاظ سے صوفی بھی تھے۔ مثال کے طور پر کوپر نیکس' نیوٹن' کیپلر' آئن سٹائن' اوپن ہائمر وغیرہ۔سزا اگرچہ ایک تادیبی اقدام ہے تاہم یہ ایک طاقتور اخلاقی محرک بھی بن سکتی ہے۔ خوف اخلاقیات کی بنیاد ہے جس طرح خدا کے خوف کا آغاز خدا کی محبت سے ہوتا ہے۔ تفریح اور کھیل بظاہر ایک جسمانی سرگرمی ہے' لیکن تعلیمی طور پر اس کا اپنا مرتبہ ہے۔ افلاطون جس کا ہر زمانے میں تذکرہ عالی دماغ انسانوں میں کیا جائے گا اس کی شہرت اس کی بہترین صحت کی وجہ سے بھی ہے۔ جسم نے ایک اعلیٰ دماغ کو پروان چڑھایا۔ جسم و روح،دل و دماغ سائنس اور مذہب' فزکس اور فلسفہ ایسے مقام پر ملتے ہیں جو زندگی کی بلندیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ خالص روحانیت اور اخلاقیات سے عاری ذہانت زوال کی علامت ہیں۔۔ نظافت روح کی تربیت میں بہترین کردار ادا کر سکتی ہے جیسا کہ نماز انسانی عبادت کی سب سے اعلیٰ مظہر ہے۔

{۴۵} Wierstass.

آیئے اس نقطۂ نظر سے کچھ اور چیزوں کا مشاہدہ کریں۔یہ جو "فطری تعلیم" کا غلغلہ ہے اس کا مقصد کیا ہے؟ روسو نے اس کا ایک واضح جواب دیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسی چیز کو یکجا کیا جائے جس کو یکجا کرنا بظاہر مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن جس کے یکجا کرنے پر تمام بڑے آدمی قادر رہے ہیں! اس سے مراد جسمانی اور ذہنی قوتیں یعنی فلسفی کا ذہن اور ا تھلیٹ کی قوت ہے۔{۴۶} تعلیم کے متعلق فونٹین کہتا ہے :

"بچے کی روح کو تقویت پہنچانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اعصاب کو مضبوط کیا جائے۔ {۴۷} روسو اصرار کرتا ہے کہ لاک، فلوری اور دی کروسا بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں اور خود روسو نے بھی اس مضمون کو دہرایا ہے۔"دماغ کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کے لئے جسم کو مضبوط ہونا چاہیے۔ ایک خادم کو مضبوط ہی ہونا چاہیے۔ جذبات کی زیادتی ہمارے جسم کو کمزور بنادیتی ہے اسی طرح جسم پر تشدد اور فاقہ کشی منفی اثرات مرتب کرتے ہیں، لیکن ان کی وجوہات مختلف ہوتی ہیں۔ جسم جس قدر کمزور ہوگا اتنے ہی زیادہ مطالبات کرے گا۔ جتنا یہ مضبوط ہوگا اتنا ہی زیادہ مطیع ہوگا۔ تمام شہوانی جذبات کمزور جسموں میں ہوتے ہیں۔جتنا زیادہ وہ اطمینان حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں اتنا ہی زیادہ انہیں پریشانی سے گزرنا پڑتا ہے"۔

اس کو اصولاً سمجھ لیجئے کہ اگرچہ قوت کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں ہے تاہم حقیقی زندگی میں قوت کے بغیر انصاف ممکن نہیں ہے۔ انصاف اور قوت کے تصورات کی تشکیل انصاف میں مجتمع ہو جاتی ہے۔ مذہب اور کلیسا نے کئی صدیوں تک جو

{۴۶} Rousseau : EMILE

{۴۷} Michel de Montaigne : The Education of Children (New York : D' Appleton. 1899)

ناانصافی جاری رکھی' کیا بعد کی تحریکوں نے ان کا قلع قمع نہیں کردیا؟ مساوات' برابری' آزادی اور بھائی چارے کے خیالات تو مذہب کی طرف سے آئے ہیں۔ لیکن سیاست اور تشدد نے انقلاب برپا کر کے ان کو مادی صورت دے دی۔ یہ مذہب کی ناکامی ہے کہ اس کے مطالبات صرف ضعیف اور دبے ہوئے لوگوں سے ہوں۔ تشدد اور سیاست کی کسی نہ کسی پہلو سے وضاحت کی جاتی ہے کیونکہ مذہب کے بہت سے پہلوؤں کو قوت کی مدد کے بغیر روبہ کار نہیں لایا جاسکتا۔

انسانی جدوجہد کی مثال لیجئے۔ پہلی نظر میں اس کے دو پہلو نظر آتے ہیں۔ اس کا پہلا حصہ حرکت ہے جو بذات خود تو مفید نہیں ہے تاہم اس کا دوسرا حصہ "کارکردگی" فائدے کی طرف لے جاتا ہے۔

مذہب نے کائنات میں انسان کی منزل ان الفاظ میں متعین کردی ہے۔ "اپنی پلکوں کے پسینے سے تم اپنی روٹی کھاؤ گے" {۴۸} جبکہ سائنس اور مادیت کسی محنت کے بغیر ارضی سلطنت چاہتی ہے جہاں مشینیں انسانوں کی جگہ کام کریں گی اور جہاں اوقات کار کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے۔ مذہب چاہتا ہے کہ کام کام کی غرض سے کیا جائے کیونکہ یہ گناہوں کے خلاف ڈھال ہے۔ عموماً یہ بھی کہا جاتا ہے' "ایک بیکار شخص کا دماغ شیطان کی رہائش گاہ ہوتا ہے" اس کے برعکس تمدن و ثقافت کا تعلق کام کے نتائج سے ہوتا ہے یا زیادہ واضح الفاظ میں "پیداوار" سے ہوتا ہے۔ مارکسی مصنف ہنری لیفیبور زور دیتا ہے کہ مارکسیت میں کام ایک پیداواری عامل ہے اخلاقی عامل نہیں۔ {۴۹} یورپ میں کام کرنے والوں کا گروہ بنیادی طور پر پراٹسٹنٹ ہے' اشتراکی نہیں ہے' جیسا کہ

{۴۸} انجیل باب پیدائش ۱۹' ۳۔

{۴۹} Henri Lefebvre : Paper read at the Geneva International Encounters.

عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ مذہب چاہتا ہے کہ تمام لوگ کام کریں چاہے اس کے نتائج کچھ بھی مرتب ہوں۔ اس کے برعکس تہذیب صرف نتائج کو مدنظر رکھتی ہے اور یہ کوشش کرتی ہے کہ دوسرے لوگوں کو کام پر لگا کر نتائج پیدا کروے۔ پہلے زمانوں میں غلاموں کو مشقت پر لگایا جاتا تھا اور اب مشینوں کو یہ کام سونپ دیا گیا ہے۔

کام ایک مثبت سرگرمی ہے اور کام کی ایک اخلاقی اور معاشی حیثیت ہے۔ یہ جس طرح برائیوں کے خلاف جہاد ہے اسی طرح غربت کے خلاف بھی جہاد ہے اس لحاظ سے کام کرنا خالصتاً اسلامی عمل ہے۔

فائدے اور اخلاقی عنصر کو ایک عمل میں دیکھا جاسکتا ہے اور وہ انسان کی فطری اور سماجی زندگی ہے۔ انسانی خاندان کے ارتقاء کے دوران یہ بقاء کا مسئلہ بن جاتا ہے۔ سائنس اور اخلاقیات کے رویے یہاں آکر مل جاتے ہیں۔

قریبی رشتہ داروں سے شادی کی ممانعت دنیا کے تمام حصوں اور تمام ادوار میں پائی جاتی رہی ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو آپ اسلام کے قریب قرار دے سکتے ہیں۔ یہاں محسوس ہوتا ہے زندگی نے اپنے آپ کو اسلامی راستے پر خود بخود ڈھال لیا ہے {۵۰}۔

قریبی رشتہ داروں سے شادی نہ کرنے کی ممانعت اخلاقی ہے یا اس کے پیچھے حیاتیاتی پہلو بھی ہیں اس کا دو ٹوک جواب تو نہیں دیا جاسکتا۔ حیاتیاتی پہلو تو ناقابل انکار ہیں۔ معروف روسی ماہر حیاتیات تمیریازیف لکھتا ہے :

"اس چیز کے واضح شواہد موجود ہیں کہ والدین کی بہت قریب کی رشتہ داری بچوں کی صحت کے لئے نقصان دہ بن سکتی ہے۔ آج کے زمانے میں اس کو

{۵۰} آسٹریلیا اور افریقہ کے قدیم قبائل سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان ممنوعات پر کاربند ہیں اور لڑکے کی شادی دوسرے خاندان میں کرتے ہیں۔

دوبارہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ تجربات کے ایک طویل سلسلے نے ثابت کردیا ہے کہ یہ فطری قانون ہے اور نہ صرف انسانوں میں ہے' بلکہ جانوروں اور پودوں میں بھی ہے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جو مادی دنیا پر حاوی ہے۔ اس کے برعکس محرمات سے شادی نہ کرنے کا اصول بھی بہت پرانا ہے اور اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ اس کی اصل بنیاد اخلاقی اصول ہیں"۔

اگر ہم کائنات کے دلچسپ نظام پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ میڈیکل سائنس کی حقیقتوں میں بھی طب کو بیک وقت حکمت' اخلاق اور روحانی نظام سمجھا جاتا ہے۔ دور جدید میں کچھ ایسی بیماریاں دریافت ہوئی ہیں جن میں بظاہر تو جسم کی خامی یا نقص نظر نہیں آتا۔ مریض محسوس کرتا ہے کہ اس کی نفسیاتی زندگی میں شدید خلل ہے۔ایک جدید طریق علاج نے مقبولیت حاصل کی ہے اور اسے Psychomatic Medicine کہتے ہیں۔اس کے اندر جسم اور ذہن کے مشترکہ رویے کو پیش نظر رکھ کر علاج تجویز کیا جاتا ہے۔ السر' سانس کی نالیوں کا دمہ' ذیابیطس' موٹاپا' مستقل دردسر اور جوڑوں کا درد وغیرہ ایسی بیماریاں ہیں جن کی ابتداء نفسیاتی وجوہات سے ہوتی ہے۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ بیماریاں اور انہی جیسی دوسری بیماریاں نفسیاتی خلفشار' ذہنی دباؤ اور دوسرے درجے کی حیاتیاتی تبدیلیوں کی وجہ سے لاحق ہوتی ہیں اور کبھی کبھار تو حیاتیاتی تبدیلیاں بالکل ہی غائب ہوجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مکمل علاج کو جسمانی و کیمیائی تجزیے' سرجری' میکانیکی تحقیق تک محدود نہیں رکھاجاسکتا۔ کیونکہ حقیقت میں تو بیماری کا وجود نہیں' بلکہ بیمار لوگ موجود ہیں۔ ادویہ کا تعلق عمل سے نہیں' بلکہ لوگوں سے' یا شخصیات سے ہوتا ہے۔ یکساں علامات یکساں امراض کی نشاندہی نہیں کرتیں' نہ ہی دو افراد کے امراض اور علاج یکساں ہوسکتے ہیں۔ اس لئے جب ہم پرانے زمانے کی کہانیوں میں دعا' قربانی' نیز منتر' فاقے اور عقائد کا ذکر سنتے ہیں تو ہمیں یقین کرلینا چاہیے کہ یہ سوچ اور فکر

اب تک جاری و ساری ہے۔ پیرس کے کئی ہسپتالوں میں موسیقی کے ذریعے علاج کیا جارہا ہے۔ {۵۱} کیونکہ بیمار ہونا نہ صرف ایک جسمانی حالت ہے' بلکہ جسم کی کیمیائی حالت میں مداخلت کا نام ہے۔ کیمیا اور فلکیات کے برعکس طب ہمیشہ دو ستونوں کے درمیان گھومتی ہے کیونکہ کیمیا اور فلکیات نے تحقیق کے لئے مادے کو منتخب کیا ہے۔ طب کا مرکز و محور "زندگی" اور زیادہ واضح الفاظ میں "انسانی زندگی" ہے۔ انسانوں کے ساتھ متعلق ہر چیز کی طرح طب کو بھی سائنس اور مذہب کی یگانگت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

اس نقطہ نظر سے اگر ہم دیگر اشیاء کا جائزہ لینا شروع کردیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہر فن میں ایک فنکار کی محنت پوشیدہ ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص ہنر اور حرفت کے فرق کو نظرانداز نہیں کرسکتا ان کی مشترکہ خصوصیات کا بھی انکار نہیں کرسکتا۔ یہ جان لینا چاہیے کہ اول فن حرفت سے الگ رہا ہے'۔ دوم یہ علیحدگی کبھی بھی مکمل نہیں ہوئی اور کوئی فن ایسا نہیں ہے جس میں تکنیک استعمال نہ ہوئی ہو۔ دیگر مظاہر میں بھی یہ دوگانیت مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ مثلاً فنکار اور فنی نمونے کو فروخت کرنے والا تاجر مصنف اور پبلشر' نقشہ نویس اور سرمایہ کار وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح موسیقی کا معاملہ ہے کہ باخ' موزارٹ اور بیتھوون موسیقی کی ترتیب پر کام کرتے رہے۔

حیاتیاتی لحاظ سے زندگی طبعی' کیمیائی اور نفسیاتی محرکات کی جامع ہے' جبکہ تاریخی لحاظ سے یہ معاش' معاشرت اور قیادت کی جامع ہے۔ تاریخ میں انسانی اثرات کا انحصار قوت' ارادہ اور شعور سے متعلق رہا ہے۔ تاریخی واقعات میں شریک لوگوں کی روحانی قوت جس قدر مضبوط رہی ہے۔ اسی قدر وہ بیرونی دباؤ سے آزاد رہے ہیں۔ اصولی طور پر انسان مکمل طور پر آزاد ہے اور بیرونی قوانین اس پر کوئی زور نہیں رکھتے۔ انسان

{۵۱} Yehud : Menuhin is the Chairman of the Committee for Musico therapy.

نے اپنی قوت ارادی کی بدولت بیماریوں اور خطرات سے نپٹنا سیکھ لیا ہے۔ اگر ایک شخص شیروں کے درمیان پھنس جائے تو اس کی زندگی کی ضمانت نہیں ہوتی' لیکن اگر شیروں کو سدھانے والے کا سامنا شیر سے ہوجائے تو صورت حال مختلف ہوگی۔ تاریخ ان جرأت مند بہ عجلت فیصلہ کرنے والوں اور دانش مند و دانالوگوں کے گروہوں کا نام ہے' جنھوں نے تاریخ کے واقعات کی فہرست میں انمٹ نشانات ثبت کیے ہیں اور انھوں نے تاریخ کے دھاروں کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

انسانی پہلو جتنا کم ہوتا چلا جاتا ہے حالات کا عنصر اتنا ہی غالب ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ سلسلہ جس قدر بڑھتا ہے انسان کی حیثیت کم تر اور چیز کی حیثیت برتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہمیں کائنات اور فطرت پر اقتدار عطا کیا گیا ہے اور اگر ہمیں اپنے آپ پر اختیار ہو تو ہم تاریخ پر بھی اختیار حاصل کرسکتے ہیں' تاریخ کے بارے میں اسلام کا یہ نقطہ نظر ہے۔ اسلام انسان کو دعوت دیتا ہے کہ جدوجہد اور عمل سے تاریخ کے نئے ابواب مرتب کیے جائیں۔

باب ہشتم

قانون کی اسلامی ماہیت

❑ قانون کے دو پہلو :

قرآن کی اگر یہ تعریف متعین کی جائے کہ فائدہ مند چیز انسان کا حق ہے تو اہل مذہب اور اہل اشتراکیت اس تعریف کو جوں کا توں تسلیم نہ کریں گے۔ مذہب کے نزدیک حقوق اور فرائض اللہ تعالی کی طرف سے عائد کیے جاتے ہیں' جبکہ اشتراکیت کے نزدیک انسان کی اس کے علاوہ کوئی حیثیت نہیں ہے کہ وہ معاشرے کا ایک جزو Commodity ہے اور ریاست سے ہٹ کر اس کے کوئی حقوق نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی مدنظر رکھا جانا چاہیے کہ بادشاہ' پارلیمنٹ اور برسراقتدار طبقے کی خوشنودی ہی اصل اور قانون نہیں ہے' بلکہ ہر انسان کا اپنا وقار اور اپنا مرتبہ ہوتا ہے اور قانون سازی کرتے وقت اس چیز کو سب سے پہلے مدنظر رکھنا چاہیے۔

کارل مارکس اپنی کتاب The Jewish Question میں لکھتا ہے (یہ کتاب ۱۸۴۴ء میں لکھی گئی) "حقوق سے مراد خود غرض انسانوں کے مخصوص حقوق ہیں اور یہ استحصال کے سوا کچھ بھی نہیں ہے"۔

مادہ پرست مصنف جیری بینتھم انسانی حقوق کے متعلق حقارت سے لکھتا ہے :

"انسانی حقوق بکواس ہیں' اور فطری انسانی حقوق چوٹی بکواس ہیں"۔ایک اور تحریر میں بینتھم انسانی حقوق کے فرانسیسی منشور" کو "مافوق الفطرت کام" قرار دیتا ہے اور ایک لحاظ سے یہ ایسا ہی ہے آزادی، مساوات اور بھائی چارے (Liberte egalite Fraternite) کی تلاش ہمیں یورپ میں روسو تک اور ۱۷۷۶ء کے امریکہ کے منشور آزادی تک لے جاتی ہے۔ جیلنک کہتا ہے کہ انسانی حقوق کا منشور' تحریک اصلاح کا نتیجہ ہے' انقلاب کا نتیجہ نہیں ہے۔{۱}

ارنسٹ بلاخ' جس نے مارکسزم اور فطری انسانی حقوق کو ملانے کی کوشش کی یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ "یہ بات قبول نہیں کی جاسکتی کہ انسان آزاد ہے اور پیدائش کے لحاظ سے برابر ہے۔ پیدائشی حقوق نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ حقوق صرف جدوجہد سے حاصل ہوتے ہیں اور جدوجہد سے ہی حاصل ہوں گے{۲}۔

ان کے نقطہ نظر سے تاریخ حقوق کی کشمکش کا نام نہیں ہے' بلکہ مختلف قسم کے مفادات کے درمیان ٹکراؤ کا نام ہے۔ اس جانفشاں کوشش میں جو طبقہ فتح مند ہوتا ہے وہ اپنے مفادات اور خواہش کو قانون بنا دیتا ہے اسی لئے مارکسی حضرات کہتے ہیں "قانون تو حکمران طبقے کے ارادے کا نام ہے جس کو قانونی ضابطہ بنادیا جاتا ہے"۔ اسی طرح نہ کچھ صحیح ہے نہ غلط ہے' نہ انصاف ہے نہ بے انصافی ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ اس ٹکراؤ میں کون سا مفاد فتح مند قرار پاتا ہے{۳}۔

اگر بات یہی ہے تب تو طاقتور کو ہی حقوق حاصل ہوں گے۔ تاہم فطرت کے مطابق

{۱} Jellinek : die Erklarung der Menschenrechte 1904.

{۲} Ernest Bloch : Natural law and Human Dignity (Belgrade : 1977). P. 178

{۳} یہ حاشیہ طوالت کے باعث اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں۔

ہر ایک فرد انفرادی طور پر غیر مؤثر ہے۔ کمزور کا حق طاقتور کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اسے کسی قانون کی ضرورت ہے۔ قانون تو کمزور کے اس راستے کا نام ہے جس کے ذریعے وہ طاقتور کی مخالفت کرتا ہے' بالکل اس طرح جیسے آزادی رائے اور عقیدہ بنیادی طور پر دوسری رائے اور دوسرا عقیدہ اختیار کرنے کی اجازت کا نام ہے۔ وہ قانون جو شہری کو یہ "حق" عطا کرتا ہے کہ حکمران طبقے کی شان میں قصیدے گائے اور اس کی حمدوثنا پڑھے وہ قانون تو نہیں ہے قانون کا مذاق ہے۔ کسی بھی سماجی نظام کو پرکھنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنے مخالفین اور اقلیتی گروہوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھتا ہے۔ طاقتور کی طاقت ایک حقیقت ہے' قانون نہیں ہے' قانون اس وقت شروع ہوتا ہے جب اس قوت کی حدود شروع ہوتی ہیں اور جہاں طاقتور کے مفاد کا مسئلہ شروع ہوتا ہے تو یہ کمزور کا ساتھ دینا شروع کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم "دستور" کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور ہر بادشاہ اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

بلاخ صاف صاف کہتا ہے کہ "ہر آمریت قانون کی معطلی ہے" اور اس میں پرولتاریوں کی آمریت بھی شامل ہے۔ کیا یہ پرولتاری آمریت نہیں ہے؟ "ایسا اقتدار جو قانونی طور پر لامحدود ہو اور جس کی بنیاد تشدد پر ہو"۔ (لینن)۔ کیا تجربے سے یہ ثابت نہیں ہوگیا ہے کہ پرولتاریوں کی آمریت ریاست کی مشینری کی آمریت میں تبدیل ہوگئی

{۳} قانون کی انہی تعریفوں میں سے ایک تعریف یہ ہے۔ "قانون سے مراد وہ حقوق ہیں جو برسر اقتدار طبقہ چاہتا ہے۔ ان اصولوں کا نفاذ ریاست کی طاقت کے ذریعے ہوتا ہے تاکہ وہ سماجی تعلقات اور حالات پیدا ہو جائیں جو حکمران طبقے کی خواہش اور مفاد کے مطابق ہوں"۔

Vishinsky : The Main Tasks of the Science of the Soviet Socialistic Law 1987.

ہے؟ یہ بیان کہ قانون حکمران طبقے کی مرضی کا نام ہے بنیادی طور پر قانون کی روح ہی کے خلاف ہے۔ بلا شک وشبہ قانون کی یہ نفی متوازی طور پر مذہب کی نفی ہے اور یہ مادہ پرستانہ فلسفے کا لازمی نتیجہ ہے۔ کیا مذہب کے علاوہ بھی کوئی راستہ ہے جس کے ذریعے طاقتور کی طاقت کو محدود کیا جاسکے؟ کوئی قوم کسی ایسی اقلیت کو کیوں برداشت کرے جس کو وہ آسانی سے نکال باہر کرسکتی ہو اور اس کی جائیدادوں پر قبضہ جما سکتی ہو؟ ہجرت کرکے امریکہ آنے والے سفید فاموں نے کس اصول کی پیروی کرتے ہوئے مقامی آبادی کو دیس نکالا دے دیا تھا؟ اگر قانون برسراقتدار گروہ کی خواہش کا نام ہے تو اس طبقے کو یہ حق حاصل ہے کیونکہ وہ گروہ مضبوط تھا اور مادی طور پر زیادہ ترقی یافتہ تھا' دوسرے الفاظ میں یہ "برسراقتدار" طبقہ تھا۔ سرمایہ داری نظام کے حامی کن اصولوں کی خلاف ورزی کررہے تھے جس کو مارکس نے سرمایہ کی ابتدائی ذخیرہ اندوزی قرار دیا تھا؟ {۴} اگر قانون برسراقتدار طبقے کی یعنی سرمایہ داروں کی رضا کا نام ہے تو اس برسراقتدار طبقے یعنی سرمایہ دار نے "قانون" کے سوا کوئی ظلم نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ جو لوگ مزاحمت کررہے تھے وہ قانون توڑ رہے تھے' کیونکہ وہ عظیم الشان "برسراقتدار طبقے" کے خلاف کام کررہے تھے۔ {۵} اس اصول کی نوعیت کے مطالعے سے ہمارا سامنا انہی مسائل سے ہوتا ہے جن کا سامنا زندگی' ادب اور آزادی سے ہوتا ہے۔ کسی بھی معاشرے کے سچے

{۴} Vishinsky : The Law of the Soviet State trans. Hugh W. Babb (New York : the Macmillan Company 1948).

مارکس کہتا ہے۔ "معاشرہ قانون پر نہیں چلتا۔ یہ تو قانون دانوں کا پاگل پن ہے"۔

{۵} غلامی کو قانونی درجہ دینے والا رومی قانون بھی انسانی آزادی کے اصول کو تسلیم کرتا تھا Ab initio Mones Libori Nascebantur (شروع ہی سے تمام انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں)۔

قوانین وہی ہوسکتے ہیں جن میں سزا دلانے اور شہریوں کے ضمیر کو مطمئن رکھنے کی صلاحیت ہو۔ ہر قانونی نظام ایسا ہے اور یہ کوشش کرتا ہے کہ ایسا ہو۔ عملی طور پر پرولتاری آمریت جمہوریت بننے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ قانون جو برسر اقتدار طبقے کا پیرو ہوتا ہے وہ "خواہش" ہی نہیں رہتا "انصاف" "سچائی" بلکہ قانون بن جاتا ہے یہ "ثنویت" فراموش نہیں کی جاسکتی۔

اگر اس ثنویت کو تباہ و برباد کردیا جائے تو قانون غائب ہوجائے گا۔ پہلے مسئلے میں قانون صرف محکوم کے لئے ہوتا ہے، یعنی منافع، قوت، سیاست اس سے ماورا ہوتا ہے۔ دوسری صورت میں یہ سچائی کے ایک مطلق تصور یا اخلاقی اپیل کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ قانون نہیں رہتا۔

اسی طرح قانون کی بنیاد صرف ایک اصول نہیں ہوسکتا۔ عیسائیت اور نظام سرمایہ داری قانون کا نظام پیدا نہیں کرسکتے۔ عیسائیوں کے نزدیک قانون اس کائنات میں امن پیدا کرنے کی کوشش کا نام ہے اور یہ کوشش بالآخر ناکام ہوگی۔ عیسیٰ علیہ السلام محبت بحال کرنے آئے تھے، عہدنامہ قدیم کا انصاف بحال کرنے نہیں آئے تھے۔ علاوہ ازیں، محبت اس کائنات کی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ بہشت کی نیکی ہے۔ {۶} عیسیٰ علیہ السلام نے منصفین کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا، جبکہ ہیوگو گروٹیئس "پہاڑی کے وعظ" اور "فطری قانون کے درمیان تعلق کی نفی کرتا ہے کیونکہ اس کے خیال میں پہاڑی کا وعظ "بہت اعلیٰ درجے" کا ہے، لیکن انسانوں کے لئے موزوں نہیں ہے۔

صرف مذہب یا صرف سرمایہ داری سے قانون نہیں بنایا جاسکتا نہ ان سے ہٹ کر ہی

{۶} St. Thomas Aquinas : Basic Writings of Saint Thomas Aquinas : "Sumatheologia" II'# 191 ed Anton C. Pegis. (New York : Random House 1945).

بنایا جاسکتا ہے۔ جب تک عیسائیت انسان کی شخصیت، اس کے ارادے، سچائی، حق پرستی، بنیادی انسانی حقوق وغیرہ کی اہمیت کو تسلیم نہ کرے اس کے دائروں میں کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی اہمیت اور قدروقیمت سمجھے بغیر، نیز قوت کی اہمیت کے بغیر (قوت کو یہودیت نے بڑی اہمیت دی) قانون کا کوئی مطلب نہ ہوگا۔ مسیحی نقطہ نظر کے بغیر یہ ممکن نہ ہوگا اور یہودی نقطہ نظر کے بغیر اس کا نفاذ نہ ہوگا۔ اس تفصیلی گفتگو کے بعد یہ ثابت ہوا کہ ہر قانون کی روح اسلامی ہے۔

تاریخی طور پر گفتگو کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ کسی تمدنی زندگی کے اعلیٰ درجے کے مظہر کا نام قانون ہے۔ یہ اس وقت ظہور پذیر ہوتا ہے جب مذہبی جذبات اور سماجی و سیاسی جذبات میں ہم آہنگی اور اعتدال پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ ایسا وقت ہوتا ہے جب مذہبی جذبات بھی مضبوط ہوتے ہیں اور وہ لوگوں کی زندگی پر بھی اثرات مرتب کرسکتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ آنے والی تہذیب کے دلائل سے بھی واقف ہوتے ہیں۔ انسان کے علاوہ جس کی قدروقیمت مذہب نے متعین بھی کی اور قائم بھی کی، معاشرہ ایک آزاد وجود کی حیثیت سے بھی سامنے آتا ہے۔

اس مسئلے کا جائزہ تاریخ کے تین اہم قوانین یعنی رومی، اسلامی اور یورپی قوانین کی روشنی میں لیا جاسکتا ہے۔

رومی قانون کا اولین دور "شہری قانون کا زمانہ" کہلاتا ہے۔ اولین دور میں سلطنت کی تین صدیاں شمار کی جاتی ہیں۔ اس دور کی نمایاں ترین خصوصیت قانون اور مذہب کی یگانگت ہے۔ شہری قانون مذہبی اصول کی حیثیت رکھتا تھا اور مذہبی اصول شہری قانون تھا۔ بعد میں یہ اصول کی حیثیت سے الگ کردیئے گئے۔ رومیوں کی تہذیب اور رومیوں کی سیاسی سوچ میں رواقیت (Stoicism)، نیز اخلاقی اور مذہبی فلسفہ بھی شامل ہوگیا تاکہ وہ اس قانون کو مزید نشوونما دے سکیں رومیوں کے آمرانہ اصول Lex Universalis Utilitas. {۷} کا نظری اصول بھی شامل ہوگیا، کیونکہ نہ ہی رومی تہذیب نہ ہی

رواقی فلسفہ رومی نظام قانون از خود تیار کرسکتے تھے {۸}۔

اسلام کے اندر ہم قانون اور مذہب کی "وحدت ذات" محسوس کرتے ہیں۔۔ اسلام کے ہر بڑے مفکر نے اسلامی فقہ و قانون پر کتابیں لکھی ہیں۔ {۹} اہل یورپ کے لئے یہ مشکل ہے کہ ان تحقیقات کو دیکھ کر قانون اور مذہب کے درمیان فرق کرسکیں۔ ایک لحاظ سے قانون اسلام کی فطری پیداوار ہے۔ الفریڈ وی کارمر لکھتا ہے :

> عرب (مسلم) واحد قوم ہیں جنہوں نے ازمنہ وسطیٰ میں قانون کی سائنس کو ترقی دے کر غیر معمولی نتائج اور کامیابی حاصل کی۔ قانون پر مسلمانوں نے اس قدر کام کیا ہے کہ اپنی عظمت میں رومیوں کے قانون کے بعد اسی قانون کو اہمیت حاصل ہے' جبکہ رومیوں کو دنیا کے اولین قانون ساز کہا جاتا ہے"۔

یورپ کی تاریخ میں قانون کے ارتقاء کا آغاز کلیسا کی مغلوبیت سے ہوتا ہے اور یورپی سائنس میں اشتراکی نظریات کے ظہور تک جاری رہتا ہے۔ ان چند صدیوں میں جب یورپی تمدن و ثقافت یکجا ہوئے تو اسی دور میں عظیم منشور اور ضابطے وجود میں آئے۔ ثنویت اپنی روح کے اعتبار سے اسلامی ثنویت ہے اور اس کا اظہار ہیوگو گروٹیئس کے عدالتی فیصلوں سے ہوتا ہے جو یورپی عدالتی قانون کی مرکزی شخصیت ہے۔ تحریک اصلاح

{۷} رومی قانون کے بہترین اصول رواقیت کے زیر اثر تیار ہوئے۔ مثال کے طور پر یہ اصول دیکھیے۔ "قانون کے یہ اصول ایمانداری سے رہنے کے لئے ہیں' کسی پر حملہ کرنے کے لئے نہیں ہیں اور ہر شخص کو اس کا حق دینے کے لئے ہیں"۔

{۸} رومی قانون ساز' سماجی فطری قانون سے ۱۵۰ قبل مسیح میں متعارف ہوئے جب ایک مشہور رواقی پنیٹیس روم پہنچا۔ سسرو نے اس سلسلے میں اعلیٰ درجے کے نظریات پیش کئے

{۹} مثال کے طور پر معروف امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ نے مالیات پر "کتاب الخراج" لکھی اور الشعبانی نے جنگی قانون پر کتاب لکھی۔

کے آخر میں اس نے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ قانون سازوں کی تحقیقات اور تصنیفات کو یکجا کیا اور ثابت کیا کہ قانون بیک وقت اخلاقیات اور مذہب کے ساتھ متعلق بھی ہے اور ان پر انحصار بھی کرتا ہے۔ اس ثنویت کی بدولت کچھ مصنفین مثلاً ورنز اور اہرنز نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قانون اور اخلاقیات کے درمیان تمیز کرنا گروٹیئس کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے جبکہ کچھ دوسرے حضرات مثلاً کرچمان نے اس کے برعکس ثابت کرنے کوشش کی اس دعوے کے ساتھ کہ خدا ہی تمام قانون کا ماخذ اصلی ہے گروٹیئس نے قانون اور مذہب کے باہمی تعلق پر اپنے عقیدے کا اظہار کیا۔

سیاسی انتہا پر گامزن مارکسی ریاست بھی قانون کی آزادی کو تباہ نہ کر سکی۔ نظریاتی طور پر واضح خیالات کے باوجود عملی طور پر یہ ممکن نہیں ہے کہ قانون کو ریاست کی مرضی کے ساتھ شناخت کیا جاسکے۔ ان کے درمیان ہمیشہ ایک ناقابل عبور فاصلہ حائل رہتا ہے۔ اشتراکیت اور ایک ترقی یافتہ آزاد نظام قانون متضاد ہیں۔ {۱۰} ہر قانون کچھ فاصلے اور معیار رکھتا ہے۔ اشتراکیت سرعت' معروضیت اور براہ راست عمل پر کاربند ہوتی ہے۔ اشتراکیت کی سوچ میں بھی طبعی اور حیاتیاتی پہلو ہوتے ہیں یہاں تو قانون کی کوئی گنجائش نہیں ہے' کیونکہ قانون تو فطری رجحانات کی نفی ہے یہ "ہونا چاہیے" کو تسلیم نہیں کرتا' "ہے" کو تسلیم کرتا ہے {۱۱}۔

{۱۰} اب ۱۹۷۸ء میں بھی جبکہ عوامی جمہوریہ چین کی آزادی کو تیس برس ہو چکے ہیں اس کا نہ تو کوئی فوجداری ضابطہ ہے نہ دیوانی ضابطہ ہے۔ طویل عرصے تک قانون کے علاقے کو "ممنوعہ" سمجھا گیا۔ ۱۹۷۸ء میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس میں ایک معروف چینی قانون دان ہان پی تنگ نے یہ بیان دیا تھا۔

{۱۱} سوویت یونین کا معروف نظریاتی قانون دان جے ونج ایبنیج سیکالنس جو دو عظیم جنگوں کے دوران معروف رہا تھا اور سٹالن کے دور میں منظر سے ہٹ گیا لکھتا ہے بقیہ آگے ہے

عوامی جمہوریتوں میں عدالتوں کی جو خراب کارکردگی ہے' یہ قانون کے ساتھ نظریاتی تعلق کی بدولت ہے جو تمام تر دباؤ کے باوجود فطری قانون رہتا ہے حکمران طبقے کی آرزو نہیں بن جاتا۔ عدالتیں' قانون نافذ کرنے کے لئے ہوتی ہیں اور قانون کی جو بے بسی ہوتی ہے انہیں اس کا بھی اندازہ ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ عدم رغبت کا اظہار ہونا چاہیے۔ (یہی بات قانونی پیشے کے متعلق بھی درست ہے)۔ اس قسم کی ہر حکومت چاہتی ہے کہ قانون کو سیاست کی صفوں میں لے آئے اور عدالتوں کو سیکرٹریٹ میں تبدیل کردے' لیکن جب وہ اس میں کامیاب نہیں ہوپاتی تو عدالتوں کو نظرانداز کردیتی ہے اور جب ضروری محسوس ہوتا ہے' پولیس کے ذریعے براہ راست استغاثہ دائر کر دیتی ہے۔ انتظامی اداروں کو استعمال کرتی ہے اور یہ تمام ذرائع غیرعدالتی ذرائع ہیں۔ ریاست اور حکومت مادی طاقت کے مظہر ہیں۔ عدالتیں اور قانون اخلاقی طاقت کی مظہر ہوتی ہیں۔ یہ تسلیم کرنا کہ قانون اور عدالتوں کی اخلاقی طاقت ریاست کی مادی طاقت کو اعتدال پر رکھ سکتی ہے دراصل اشیاء کے اوپر نظریے کی اور مادے کے اوپر ذہن کی برتری ہے۔ عدالت کی آزادی کا تصور ایک الحادی ریاست کے نظام کے ساتھ لگا نہیں کھاتا۔

اس صورت حال کا لازمی حصہ اپنے ہی قوانین کا عدم احترام ہے اور اس سے افراط کے ساتھ ضوابط پیدا ہونے لگتے ہیں۔ {۱۲} "راست اقدام" کا یہی نتیجہ نکل سکتا ہے۔ یعنی قانون کی جگہ سیاسی عمل شروع کردیا جائے یا سیاسی ضابطوں' خطوط' پیغامات اور قائدین کی تقاریر کو دستور اور قوانین کے اوپر حاوی کردیا جائے۔ مثال کے طور پر چیئرمین

"دنیا میں نہ کوئی پرولتاری قانون ہے اور اس لئے کوئی سوشلسٹ قانون بھی نہیں ہے۔

Allegemeine Rechtslebre and Maxsimus 1929. P. 33.

{۱۲} سوویت روس میں ۴۷-۱۹۷۳ء کے دوران' ۷۰۳ قوانین منظور ہوئے' لیکن فوراً ہی مختلف وزارتوں نے سات لاکھ ضابطے بنا لیے

ماوزے تنگ کے اقوال کا جو استعمال ہو رہا ہے اس قسم کی تمام ریاستوں میں ہمارا سا بااختیار ہستیوں سے ہوتا ہے' جبکہ منتخب ادارے داؤ پر لگ جاتے ہیں اور عدالتوں' نیز قانون کی جگہ پولیس سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ ایسی ریاستیں کوشش کرتی ہیں کہ عدالتوں کو انتظامی اداروں کے ہاتھوں میں فرمانبردار آلہ بنا کر رکھا جائے' لیکن وہ اس مہم میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتیں۔ قانون کو انسان کی طرح دبایا جاسکتا ہے یا کچھ حد تک جھکایا جاسکتا ہے' لیکن نہ اس کو تباہ و برباد کیا جاسکتا ہے نہ مٹایا جاسکتا ہے۔

تمام لوگ روح پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے مطابق کام کرتے ہیں' چاہے اس کے مطابق وہ بات نہ کرتے ہوں۔ اگر کسی شخص نے ایک قتل کیا ہے اور وہ اس کا اعتراف کرتا ہے لیکن یہ بھی اصرار کرتا ہے کہ یہ قتل بے جانے بوجھے ہوا ہے' تب استغاثہ' اور صفائی کے وکیل' گواہان' ماہرین اور عدالت کیا کرے گی؟ وہ کیوں بھاری بھرکم تقاریر جھاڑتے ہیں' ہر تفصیل کا تجزیہ کرتے ہیں وغیرہ جبکہ فعلِ قتل کا اعتراف کرلیا گیا ہوتا ہے اور اس کے نتائج بھی واضح ہیں۔ یہ تمام کوششیں بیرونی معروضی حقیقتوں کے ساتھ متعلق نہیں ہیں ان کا تعلق ایک اندرونی مسئلے سے ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ اصل میں کیا چیز وقوع پذیر ہوئی تھی۔ سوال یہ ہے کہ قاتل کے دل میں کیا بات چھپی ہوئی تھی؟ حتیٰ کہ جب ہم حقائق کا مطالعہ کررہے ہوتے ہیں اس وقت بھی ہم روح کی حالت کو جاننے کی کوشش میں مصروف ہوتے ہیں یعنی اس کی اصل میں نیت کیا تھی۔ علاوہ ازیں جو مقدمے میں ملوث ہوتا ہے بے ساختگی کے ساتھ یقین کرلیتا ہے کہ نتائج کی نسبت ارادہ زیادہ اہم ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہر شخص لاشعوری طور پر روح کو حقائق پر ترجیح دیتا ہے۔ ایک کان کن لاشعوری طور پر جب کان میں چھوٹی سی غلطی کرتا ہے تو ہزاروں کان کن اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ اس کو کم درجے کا جرم سمجھا جاتا ہے اور اس کی سزا بھی کم ہوتی ہے بہ نسبت اس شخص کے جو ایک بوڑھی عورت کو لوٹنے کے بعد اس کو قتل کرڈالتا ہے۔ کیا یہ غیر عقلی سزا ظاہر نہیں کرتی کہ نیت کی اہمیت یہاں بھی موجود ہے

اور ہم اس بنیاد پر فیصلہ نہیں کرتے کہ فی الحقیقت دنیا میں کیا واقعہ ہوا' بلکہ اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ ملزم کی نیت کیا تھی؟۔

انصاف اپنے فیصلے میں خدا کے فیصلے کی نقالی کی کوشش کرتا ہے۔ فیصلہ کرتے وقت ہم جس قدر کسی شخص کی نیت کا جائزہ لینے میں کامیاب رہتے ہیں اسی قدر ہم خدا کے قریب ہوجاتے ہیں۔ "لیکن اگر فیصلہ کرنے میں تم غلطی کر جاؤ تو اس کا الزام تم پر نہیں ہے۔ اصل چیز تو تمہارے دلوں کا ارادہ ہے"۔ {۱۳} ارادے کو تسلیم کرلینے کے ساتھ' ہم خدا کے وجود کو تسلیم کرلیتے ہیں اور اس طرح مادہ پرستی کا انکار کردیتے ہیں۔

❑ تعزیرات اور سماجی دفاع :

تعزیرات مبنی برحق ہوتی ہیں یا نہیں ہیں یہ ایک اخلاقی بحث ہے۔ اس سلسلے میں دو کیفیتیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ سزا کا استعمال جائز ہے کیونکہ جرائم کی روک تھام اور مجرموں کو کیفرکردار تک پہنچانا ضروری ہے بے شک ہر شخص کو جبر کے بغیر زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے لیکن یہ آزادی دوسروں کی آزادی کا حق تسلیم کرنے کے ساتھ مشروط ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ سزا دینے کا فعل بے فائدہ ہے کیونکہ جرم انسان کی سرشت میں داخل ہے۔اس سے کسی نہ کسی مرحلے میں غلطی کا ارتکاب ناگزیر ہے۔ اس لئے سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' لیکن معاشرے کے لئے دفاع کے ایسے اقدامات کیے جاسکتے ہیں کہ بے گناہ افراد کو نقصانات سے بچایا جاسکے۔

سزا اور سماجی دفاع کا تنازعہ قدیم ہے' تاہم اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گنجائش موجود ہے۔

{۱۳} سورہ الاحزاب آیت ۔ ۵

حمورابی کے قوانین کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ قانون کے بارے میں سب سے پرانی کتاب ہے اور اس میں بھی سزا کا تذکرہ ہے۔ اس کے برعکس وان ویر میر نے وضاحت کی ہے کہ سماجی دفاع کا نظریہ قدیم یونانیوں میں موجود تھا {۱۴}۔

انفرادیت پسند (Individualists) یقین رکھتے ہیں کہ انسان اپنے گناہوں کا خود ذمہ دار ہے۔ اثبات پسندوں (Positivists) کا خیال ہے کہ معاشرہ اور حالات انسان کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں اور جرم کا ذمہ دار معاشرہ اور حالات ہوتے ہیں۔ گروہ اول کا خیال ہے کہ انسان آزاد' خود مختار اور اپنے افعال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ بہت سے وجودوں کے درمیان ایک وجود انسان بھی ہے جو کہ فطری اور حیاتیاتی قوانین کا پابند ہے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے قابل نہیں ہے۔ پہلا گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ انسان اچھا اور برا راستہ اختیار کرنے کا اہل ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ انسان نہ اچھا ہوتا ہے نہ برا ہوتا ہے کیونکہ اس کے افعال و کارکردگی حالات کے مرہون منت ہوتے ہیں۔ اثبات پسند آزاد انسان کے وجود میں یقین نہیں رکھتے جو اپنی مرضی سے انتخاب کرے اور اس کا ذمہ دار بنے۔

تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ یہ سوچنا غلط ہے کہ ان دونوں مکتبہ ہائے فکر میں سے زیادہ شدت پسند یا زیادہ نرم کون سا ہے اس کے پس پشت بھی کچھ حالات ہی کارفرما ہوتے ہیں۔

سماجی دفاع کے اصول سے آغاز کرتے ہوئے ہم مختلف نتائج اخذ کرسکتے ہیں۔ ہم یہ رائے قائم کرسکتے ہیں کہ شدید سزا کا تصور مبنی بر عدل نہیں ہے' کیونکہ جرم تو حالات کے

{۱۴} Van der made : "Contribution al'Etude de l'Historic de la defense Sociale Revue de Crimonologie et de droit Penal 1949-50 P.944.

نتیجے میں سرزد ہوتا ہے اس لئے ہر قسم کی سزا بے مقصد ہوگی۔ تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ معاشرے کے مفادات اور اس کے متعلقات کو مدنظر رکھا جائے اور اس کی مداخلت کو فیصلہ کن سمجھا جائے اور مجرموں کو ایسی سزائیں دی جائیں جو انتہائی سخت اور عبرتناک ہوں۔ قانون جرائم کی تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ذاتی جرم کا اصول انتہائی شدید سزاؤں تک لے گیا ہے۔ مثلاً بے دینی کے خاتمے کے لئے قائم کی جانے والی مسیحی اور رومی عدالتیں (Inquisitions) جنہوں نے قانون کو چیستان بنادیا۔ تاہم پھانسی دینا جو ایک شدید جذباتی مسئلہ ہے دونوں گروہوں کے پیروکار اس کے حق میں اور خلاف دلائل دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ {۱۵} انفرادیت پسند گروہ کا خیال ہے کہ جو شخص جرم کا ارتکاب کرتا ہے اس کے خلاف پابندی عائد کی جاسکتی ہے۔ سماجی دفاع کے مؤکلین کے نزدیک اس کا مطلب معاشرے کے ایک عضو کو پستی کے طرف دھکیل دینا ہے۔ پہلے درجے میں اس کی توجیہہ یہ ہوگی کہ یہ ایک ہمدردانہ فعل ہے اور دوسرے درجے میں اس کو میکانکی' غیر انسانی فعل سمجھا جائے گا۔ ان وضاحتوں میں ایک فلسفیانہ یا مابعدالطبیعیاتی پس منظر نظر آتا ہے۔ پہلے درجے سے ہمیں "تمہید بہشت" (Prologue to Heaven) کی یاد آتی ہے اور دوسرے درجے سے ڈارون اور ارتقاء کا ہمارے ذہن میں تصور ابھرتا ہے۔ ایک چیز تو بہرحال یقینی ہے کہ انفرادیت پسند گروہ تو ہمیشہ نرمی اور منکسرالمزاجی کی بات کرے گا اور سزا کی بات نہیں کرے گا۔ اینسل کے مطابق ان اقدامات کا مقصد یہ ہے کہ مجرم کو "اعتدال" پر لایا جائے۔ {۱۶} اعتدال کی اصطلاح فزکس سے مستعار لی گئی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ مجرم کو الگ تھلگ کرکے یا طبی علاج سے یا دوبارہ تعلیم سے جرم کرنے کا نااہل بنا دیا جائے۔

{۱۵} مثال کے طور پر ایم گریو' سوئٹزرلینڈ کا قانون دان ہے اور سماجی دفاع کی تحریک کا بہت بڑا علمبردار ہے وہ بھی سوئٹزرلینڈ میں پھانسی کی سزا کو دوبارہ جاری کرنے کے حق میں ہے (۱۶) آگے

مختصر الفاظ میں یوں کہیے کہ سزا اور حفاظتی اقدام میں فرق یہ ہے کہ سزا کا ہدف انصاف اور شخصیت ہوتا ہے جبکہ حفاظتی اقدام کا ہدف مفاد اور معاشرہ ہوتا ہے۔ سزا جرم کے مطابق ہوتی ہے جبکہ حفاظتی اقدام میں مجرم کے سماجی نقصانات کو مدنظر رکھا جاتا ہے یعنی دیکھا جاتا ہے کہ معاشرے کے نقطہ نظر سے فرد کتنا خطرناک ہے۔ سماجی دفاع کو مدنظر رکھ کر یہ فرض کرنا ممکن ہوگا کہ ارتکاب جرم سے پہلے ہی مجرم کو بہت سے حقوق سے محروم کردیا جائے۔ سماجی دفاع کے اقدامات کچھ شدید اور غیر منصفانہ شکل بھی اختیار کرسکتے ہیں چاہے حفاظت کا مسئلہ ہو یا احتیاطی تدابیر ہوں۔ اس قسم کے اقدامات کچھ ممالک میں سیاسی منحرفین کے خلاف استعمال کیے جاتے ہیں۔ ایک خوفناک مثال سٹالن کے عمل "صفائی" کی ہے۔ کچھ اعدادوشمار کے مطابق صفائی کے اس عمل میں ایک کروڑ افراد کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ اس کی وضاحت یہ کی جاتی ہے کہ یہ صفائی سزا نہیں ہے' بلکہ یہ تو غیر "ضروری" افراد سے معاشرے کو پاک کرنے کا عمل ہے' بلکہ "اعتدال" اور "صفائی" میکانکی اصطلاحات اور میکانکی طریقے ہیں۔ اس کے برعکس تعزیر ایک اخلاقی نظریہ ہے اور پرانی مذہبی کتابوں میں اسے خدائی سزا سے موسوم کیا جاتا رہا ہے جس سے مذہب اور نظریہ سزا کے درمیان اصطلاحی اور تاریخی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ قانون سازی کے ساتھ ایک نظریاتی فلسفہ ہے اور جن سزاؤں کے ساتھ سماجی دفاع کا اصول ہے اس کو اثبات پسندوں کی رضا حاصل ہے۔

سزا کا سلسلہ قانونی طریقہ کار کے ساتھ ساتھ چلتا ہے جبکہ سماجی دفاع تدبیر پر یقین رکھتا ہے۔ ایک نقطہ نظر سے مقدمہ ایک ڈرامہ ہوتا ہے جس کے اندر آزادی' ذمہ داری

{۱۶} کانٹ اور ہیگل نے "دانت کے بدلے دانت" کی وکالت کی جبکہ مادہ پرستی کے وکیل ہالباخ نے قانونی جرائم کے اصول میں مداہنت کا انکار کیا۔ دیکھیے۔

Holback. System de la nature.

اور انصاف کے بارے میں پر جوش اور مبالغہ آمیز سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ مقدمہ چلنے کا عمل ایک طے شدہ رسم ہوتی ہے جس کو دیکھ کر ڈرامے یا رسم کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ {۱۷}اس کے برعکس سماجی دفاع کا اقدام ایک بامقصد فعل ہے اور اس کا تعین ایک ڈاکٹر ماہر نفسیات، ماہر عمرانیات یا منتظم کرتا ہے جج نہیں کرتا۔ مستثنیات سے ہٹ کر عملی طور پر سماجی دفاع ایک مکمل خیالی ریاست کا جزولاینفک ہے۔ خیالی ریاست میں نہ عدالتیں ہوتی ہیں نہ مقدمات چلتے ہیں کیونکہ اس میں نہ تو آزادی ہوتی ہے اور نہ ہی ذمہ داری ہوتی ہے اور نہ وہاں اخلاقیات ہوتی ہیں اور نہ ہی قانون ہوتا ہے۔

اس طرح ایک آزاد شخص کو سزا دے کر اپنے آپ کو ہم معاشرے کے ایک فرد کے شر سے محفوظ کر لیتے ہیں۔ معاشرے کا فرد نہ گنہگار ہوتا ہے نہ ذمہ دار ہوتا ہے وہ یا تو فائدہ مند ہوتا ہے یا نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہ سوال انتخاب کا نہیں، بلکہ حقیقت کا ہے اور حقائق شعور و جذبات سے عاری ہوتے ہیں۔ انسان پروری کا مطلب بے جا رحم و کرم تو نہیں ہوتا۔ ا۔پیکٹیٹس کہتا ہے "تم لولے اور اندھے پر رحم کھاتے ہو، بدکاروں پر کیوں نہیں؟ وہ اپنی مرضی کے خلاف بدکار بنے ہوئے ہیں۔ یہ رحم و کرم کی ایک مثال ہے لیکن انسانیت یا مذہب کی مثال نہیں ہے۔ انسانیت انسان کے آزاد اور ذمہ دار فرد ہونے کی تصدیق کا نام ہے۔ عدم ذمہ داری کے اعلان سے زیادہ کوئی چیز انسان کو حقیر نہیں بناتی۔ انسان ذمہ دار اور جوابدہ ہے جانور اور اشیاء جوابدہ نہیں۔ یہیں سے رواقیت اور مذہب کے درمیان اختلافات کا آغاز ہوتا ہے۔ رواقیت رحم اور معافی کو سب سے آگے رکھتی ہے جبکہ مذہب ذمہ داری کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔{۱۸} سماجی دفاع، بنیادی طور

{۱۷} ارنسٹ بلاخ کہتا ہے کہ ڈرامے کے دو مصادر ہوتے ہیں۔ عدالت اور اسرار۔ بنجمن نے وضاحت کی ہے کہ المیے کے تین اجزاء ہوتے ہیں یعنی مقام، وقت اور عمل، اور عدالتوں میں بھی ہمیں یہی کچھ نظر آتا ہے۔

Benjamin Ursprung des Deutschen Tranrspiels 1928, p. 111.

پر غیرانسانی ہے چاہے اس میں سے انسان کو منہا ہی کردیا جائے۔ اس کے برعکس جرم کا نظریہ انسانیت پر مبنی ہے چاہے اس کے ساتھ کئی شدید سزائیں بھی ملحق ہوں۔ انصاف مجرم کا انسانی حق ہے اور اس سے انحراف دیگر انسانی حقوق سے بھی انحراف ہے۔ ہیگل نے بار بار زور دیا کہ سزا بطور "علاج" مجرم کی انسانی عظمت سے ہم آہنگ ہے اور اس کا کوئی اور مقصد نہ ہونا چاہیے۔ ذمہ داری' انسانی عظمت کا ایک پہلو ہونے کے ناطے ایک اخلاقی حیثیت رکھتی ہے۔ زمین پر ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ ذمہ داری خدا کے وجود کے ساتھ متعلق ہوتی ہے۔ قانون سازی کے تمام مراحل زمین پر خدا کے عدل کی نقالی کی کوشش ہیں۔

ذمہ داری' انصاف اور سزا ایسے پہلو ہیں جن کا مادیت کی ایجادات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ موجودہ دور میں سزا سے مراد صرف یہ ہے کہ جرم کے بدلے میں تادیب دی جائے یہاں اصلاح کا جذبہ نہیں ہوتا' جبکہ مذہب میں اس کا مقصد یہ ہے کہ اس اخلاقی معیار کو از سرنو قائم کردیا جائے جو جرم سرزد ہونے کی وجہ سے مائل بہ زوال ہوگیا تھا۔ بقول ہیگل سزا "انکار" نہیں "علاج" ہے۔ اگرچہ یہ تعریف کسی حد تک انصاف سے محروم محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے حقیقی معنی اور مفہوم بہرحال محفوظ رہیں گے۔ سزا ایک غیراخلاقی فعل کا اخلاقی جواب ہے چاہے ظاہر میں یہ بے مقصد ہی محسوس ہوتی ہو۔ اس کے برعکس سماجی دفاع کے لئے جو اقدامات تجویز کیے جاتے ہیں اس کے پیچھے افادیت' مفادات کے تحفظ، کم اہم کی قربانی اور فرد کے مفاد کو معاشرے کے مفاد کے تابع بنانے کے مقاصد کارفرما ہوتے ہیں۔ سزا اخلاقی فضا مہیا کرنا چاہتی ہے' جبکہ حفاظتی

{۱۸} اخلاقی جرم کے غلبے کے اصول کا عمل اطالوی فوجداری ضابطے میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی برعکس مثالوں میں سکنڈے نیوین ممالک کے فوجداری قوانین دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر آئس لینڈ کے فوجداری قانون کا ضابطہ۔

تدابیر کا مطمح نظر سماجی فائدہ ہوتا ہے۔

جزا اور سزا کے جذبے کے پیچھے یہ مذہبی جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ جرم کرنے سے اللہ تعالٰی ناراض ہوتا ہے۔ دیگر تمام اقدامات اور اصلاحات سے قطع نظر یہ نظریہ ہمیشہ سماجی قانون کا جزو لاینفک رہے گا۔ کچھ حلقوں میں خدا کی ناراضگی کے بجائے اخلاقی معیار کی خرابی کے خوف کو مدنظر رکھا جاتا ہے جو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک اصطلاحی فرق ہے کیونکہ خدا ہی اخلاقی نظام کو پیدا کرنے والا اور اس کی حفاظت کرنے والا ہے۔

اب تک ہم سوال کے نظری پہلوؤں پر بحث کرتے رہے ہیں۔ اس کتاب کے زاویہ نظر سے دو حقیقتیں اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ اخلاقی جرم کے نظریے کے ساتھ سماجی دفاع کا نظریہ اس کے متضاد اور برابر کے طور پر سامنے آتا ہے۔ دوسرا یہ کہ عملی طور پر تمام قانون ساز "خالص ترین" قانون نہیں بناتے چاہے ان کا فلسفہ کچھ بھی ہو۔ حقیقی قوانین میں سے کسی کو بھی لے لیجئے ہمیں ایسے اصول ملتے ہیں جو نظریے کی تردید کرتے ہیں۔ لہذا کوئی بھی تعزیری قانون سزا کے کامل اصول پر مبنی نہیں ہوتا۔ نہ ہی کوئی تعزیری قانون سماجی دفاع کے نظریے پر مبنی ہوتا ہے۔ دراصل ہم کسی چھوٹے یا بڑے اصول کو زیادہ اہمیت دینے کی بات کرسکتے ہیں۔

سماجی دفاع کی جدید تحریک جس کا آغاز انیسویں صدی کے انتہائی مخدوش حالات میں ہوا تھا اور اس کو ناقابل احتراز مراحل سے گزرنا پڑا۔ مارس اینسل جو اس تحریک کے سرخیلوں میں رہا ہے لکھتا ہے "قانون سازی کے دو معرکے جو ہوئے اس میں درمیانی راہ کو فتح حاصل ہوئی جبکہ جرم کے بدلے سزا اور سماجی دفاع کا نظریہ ناکام ہوگئے {۱۹}۔

وہ مزید لکھتا ہے :

"کیا یہ ضروری ہے کہ سماجی دفاع کے نظریے کے ساتھ تمام دیگر ضروری

{۱۹} Ancel : La defense Sociale Nouvelle (Paris 1954).

کارروائیوں سے انحراف کرلیا جائے اور آخرکار سزا ہی سے راہ فرار اختیار کرلی جائے۔ کیا ہم اس چیز کا آخری فیصلہ کریں گے کہ تعزیری قانون اور سماجی دفاع میں کیا فرق ہے؟ سماجی دفاع کے معاونین و مبلغین اس رائے کے حامی ہیں کہ تعزیری قانون اور سماجی دفاع کو یکجا کرکے نئے قالب میں ڈھال دیا جائے" {۲۰}۔

۱۸۸۹ میں قائم ہونے والی "تنظیم برائے بین الاقوامی تعزیرات" شروع میں تو سماجی دفاع کی بہت بڑی مبلغ اور مشتہر تھی۔ اب اس تنظیم نے دوسرے نظریے سے بھی ہمدردی کا اظہار شروع کردیا ہے۔ ۱۹۱۴ء میں اس تنظیم نے اعلان کیا کہ "ہم دونوں نظریات کے حامی ہیں"۔ قانون کے نظریے میں انقلاب کا اظہار سزا کے نظریہ اضافیت سے ہوا اور عملی قانون سازی میں اس نے "دفاعی سزا" کی شکل اختیار کی جو قانون کے میدان میں دوگانہ وحدت کی مثال ہے۔ یعنی عملی میدان میں آخرکار "تیسری راہ" کی فتح ہوئی۔

اسلام نے بطور مذہب "بدلے کے نظریے" سے آغاز کیا اور اس نے سماجی دفاع کے اصولوں کو بھی تسلیم کیا۔ {۲۱} بنیادی طور پر تو یہ نظریہ "اس دنیا میں ذمہ داری" پر ہی مبنی ہے۔ دعا کی جگہ صلوۃ' خیرات کی جگہ زکوۃ' روحانی لوگ کی جگہ امت کی اصطلاحات بھی اسلام ہی کی عطاء ہیں۔ اسلام کے تعزیری قانون نے کمتر لوگوں کے لئے خصوصی نظام تعلیم کو تسلیم کیا جو آج کے جدید دور کے تصور سے ہم آہنگ ہے جس میں آزادانہ شہادت کے ساتھ مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ نیز جرم اور مجرم کے سماجی پہلوؤں کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔

{۲۰} Ancel Ibid.

{۲۱} اسلام میں یہ چیز آغاز ہی سے ہے اور چودھویں صدی کی اختراع نہیں ہے۔

مارک اینسل کہتا ہے۔ چودھویں صدی کے اسلامی قانون نے سات سال سے کم عمر کے بچے کی عدم ذمہ داری کے اصول کو تسلیم کیا اور اس بات کا حکم دیا کہ سات سال کی عمر سے لے کر بلوغ کی عمر تک پہنچنے والے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جائے۔ ان اقدامات کی نوعیت سزا کی نہیں ہے۔ ان مجرموں کے لئے جو نابالغ نہ ہوں' بلکہ سمجھ بوجھ والے ہوں۔ ایک نظام وضع کیا گیا اور اس کے چند پہلوؤں کو سماجی دفاع کے پہلو کہا جاسکتا ہے۔ قرآن نے جن پانچ جرائم کا ذکر کیا ہے ان سمیت عدالتوں کو یہ اجازت دی گئی کہ جرم کی نوعیت' جرم کن حالات میں صادر ہوا اور مجرم کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے آزادانہ فیصلے کریں (۲۲)۔

---

(۲۲) Said Mustapha Al-Said Bey :

LA Notion de responsabilite Penal Travau dela Semaine droit Musulman (Paris : n .p. 1953).

باب نہم

حقیقت اور تصورات

❏ تمہید :

عملی زندگی میں داخل ہو کر مذہب اور خیالی ریاست مسخ ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اپنی کامل ترین شکل میں تو یہ صرف کتابوں میں ملتے ہیں۔ عموماً فطرت کے حیوانی حصے کو تسلیم کر کے اسے "فطری" بنالیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خیالی ریاست کو انسانی (Humanise) بنا کر اخلاقی خصوصیات شامل کر لی جاتی ہیں۔ عیسائیت اور مادہ پرستی کی مسخ شدہ صورت انسان کی حیوان نما تصویر پیش کرتی ہے ایک رخ تو خدائی خصوصیت کا پرتو ہوتا ہے اور دوسری صورت حیوانیت کا عکس ہوتی ہے۔

مسیحیت کی تاریخ کے چند معروف واقعات اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ زندگی کے تال میل سے ان کی ہیئت بدل گئی۔ اس سلسلے میں کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں' مثلاً مذہب کو ادارے کی صورت میں منظم کرنا' کلیسا کی تنظیم اور ورثہ' شادی کی اجازت' کام کی اہمیت کو تسلیم کرنا' جائیداد' قوت' تعلیم' علم کے بارے میں جدید رجحانات (پہلے تو یہ کہا جاتا تھا کہ روحانی لوگوں کے لئے آسمان کی ہی بادشاہت ہے) کو تسلیم کیا گیا وغیرہ۔

اسی طرح ہمارے آج کے دور میں بھی مارکسیت کے ساتھ اشتراکیت کی راہیں تلاش کی جارہی ہیں۔

حقیقت میں مارکسیت اور مادہ پرستی ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔ انقلاب فرانس کے چند انسانی اصولوں کو تسلیم کرلیا گیا۔ شہریوں کے حقوق جو ماضی کے ساتھ تہذیبی اثرات کے طور پر منتقل ہوئے تھے مثلاً شخصی آزادی' فکری آزادی' ڈاک کی حفاظت اور تنہائی وغیرہ' اخلاقی محرکات مثلاً کام کے بدلے جزا (اس دعوے کے بجائے کہ انسان صرف فائدے کے پیچھے دوڑتا ہے) سیاست کا اہم کردار' قائدین کی شخصیت پرستی یا اپنے قوانین کو ہی اصلی اور حقیقی قوانین سمجھنا' (جو قانون کی تعریف کے خلاف ہے)' شادی' خاندان' اور ریاست کو تسلیم کرنا (جو مارکسیت کی تاریخی تعبیروں کے خلاف ہے) تعزیری قوانین میں گناہ کے تصورات پر اصرار' مثالی شخصیات (ہیروز) کو تسلیم کرنا' بھائی چارے کے تصور کی برقراری (برادرانہ امداد' برادرانہ جماعت سازی' وطن پرستی کی جنگیں وغیرہ (جو بورژوا حب الوطنی کے خلاف ہیں) اور یہ مطالبہ کہ مارکسی سرزمین کی اشتراکی عظمت کے لئے زندہ رہنا اور کام کرنا' نظریاتی اور تصوراتی عقائد وغیرہ۔

اپنی اصل کے اعتبار سے تو مذہب کا مطمح نظر یہ ہے کہ اگلی دنیا کے لئے زندہ رہا جائے۔ لوگوں نے مذہب کو ہمیشہ روزمرہ امیدوں اور تصورات و خواہشات کے ساتھ جوڑا ہے۔ اصل میں وہ اسلام چاہتے ہیں۔ عیسائیت کے اولین دنوں میں عوامی ذرائع نئے دین کو پھیلانے میں ایک اہم کردار ادا کرتے تھے۔ یہی چیز نماز اور ترک گناہ میں بھی معاون ثابت ہوئی۔ ترتولین نے تو اس چیز کا بھی اعتراف کیا ہے کہ نماز کا اصل مطلب ہی یہ ہے کہ یہ گناہوں سے بچ جانے کا نام ہے۔ قرون وسطیٰ میں چلنے والی اکثر تحریکیں بیک وقت سیاسی اور مذہبی تھیں اور یک طرفہ طور پر ان کی نوعیت کا سمجھنا مشکل ہے۔ آج بھی بہت سی مذہبی تحریکیں مقدس کتابوں کے حوالہ جات اپناتے ہوئے کام کرتی ہیں۔ مندرجہ بالا حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ خالص مذہب اور خالص سیاست صرف خیالات ہی کی

صورت میں باقی رہ سکتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں ہمیں ان کی صرف قسمیں نظر آتی ہیں اور کچھ صورتوں میں یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کردیا جائے۔

❑ مسیح علیہ السلام اور نصرانیت :

اس دنیا کے لئے ایک خالص دین کے سوال پر بحث کرتے ہوئے ایک اور پہلو کو نگاہوں سے اوجھل نہیں کیا جاسکتا اور وہ پہلو نصرانیت کی تاریخی ناکامی ہے۔
نصرانیت کو سمجھنے اور اس کے تاریخی ارتقاء کو جاننے کے لئے ضروری ہے کہ مسیح علیہ السلام کی زندگی کو ہم عیسائیت کی تاریخ سے الگ رکھ کر دیکھیں۔ آغاز ہی سے مسیح علیہ السلام کا ایک زاویہ رہا ہے اور نصرانیت کا دوسرا زاویہ رہا ہے۔ وقت گزر چکا ہے اور اختلاف اب الہامی اور انسانی' تفریق میں مستقلاً تبدیل ہوچکا ہے۔ اسی پہلو سے مسیح علیہ السلام کے خدا کا بیٹا ہونے کے عقیدے کے اختلاف کا بھی پتہ چلتا ہے۔ عیسائیت کے عقائد میں بندے اور خدا کے درمیان ایک خاموش اظہار موجود ہے کہ خالص مسیحیت اصلی زندگی میں موجود نہیں رہ سکتی۔ "آخری مسیحی نے بھی صلیب پر جان دے دی"۔ {۱}

{۱} نتشے کہتا ہے "میرے بھائیو' یقین کرو (مسیح علیہ السلام) جلد ہی فوت ہوگیا' اگر وہ میرے زمانے تک زندہ رہتا تو وہ بھی عیسائیت کے عقائد سے تائب ہوچکا ہوتا۔ مسیح علیہ السلام عظیم شخص تھا وہ لامحالہ تائب ہوکر ہی رہتا"۔

Fredrich W. Nietsche : The Antichrist.

George Burman Friedrich Nietsche

(New York : The Macmillan Co. 1931, p. 214.

کچھ مصنفین کا خیال ہے کہ سروانتے کی کتاب Don Quixote (سیاہ صحیفہ) کا لکھا جانا عیسائیت کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے' کیونکہ اس کتاب میں مسیح علیہ السلام کا مزاحیہ خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ مسیح علیہ السلام نے اپنے اولین پیروکار پطرس پر الزام لگایا کہ وہ "خدا کے متعلق نہیں سوچتا' انسان کے متعلق سوچتا ہے"۔ یاد رہے کہ "پطرس وہ ستون اعظم ہے جس کے اوپر عیسائیت کی عمارت تعمیر ہوئی ہے"۔ یعنی سب سے پہلے مسیح علیہ السلام ہی نے اس چیز کو محسوس کرلیا تھا کہ عیسائیت کیا رخ اختیار کرے گی یعنی عیسائیت کلیسا بن کر مسیح علیہ السلام کی تعلیمات سے الگ راہ اختیار کرلے گی۔

وہ تاریخی عمل جس کے ذریعے مسیح علیہ السلام کی پاک تعلیمات صرف کلیسا کی تعلیمات اور نظریات کی صورت میں باقی رہ گئیں آج کی دنیا کے ڈرامائی واقعات میں سے ایک ہے۔

تین سو سال تک مسیحیت اور بت پرستی کے درمیان کشمکش جاری رہی اور مسیحیت کے پیروکاروں کو ایذائیں دی گئیں۔ اس کے بعد روم کی یونانی سلطنت نے حالات کے نئے رخ کو تسلیم کرنا شروع کردیا۔ ۳۱۱ء میں شہنشاہ گیلریس نے عیسائیت کے ساتھ نرم روی اختیار کرنے کا فرمان جاری کیا اور اس کے تھوڑے عرصے بعد بازنطینی حکومت نے اس نئے مذہب کو قبول کرلیا۔ روحانی قائدین کی مدد سے ایک مضبوط تنظیم قائم کرکے اور کلیسا کو ریاست کے اختیارات سے نواز کر شہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت کے چہرے کو مسخ کرنے میں ایک تاریخ ساز کردار ادا کیا۔ چوتھی صدی کے دوران مجلس کلیسا نے عیسائیت کے عقائد کا اعلان کردیا اور نماز و دعا کے اندر مزید رنگ برنگی رسوم شامل کردی گئیں جو بت پرستوں سے مستعار لی گئی تھیں۔ اسی دوران میں راہبوں' ننوں اور کنواری مریم علیہ السلام کا نظریہ ظہور پذیر ہوا۔ پانچویں صدی کے آغاز میں شہنشاہ تھیوڈوسیس دوم نے عیسائیت کو سرکاری مذہب بنانے کا اعلان کردیا اور ۴۳۵ء میں بت پرستوں کے لئے رواداری کا قانون بنادیا۔ اس کے فوراً بعد پیشہ ور پادریوں کا سلسلہ شروع ہوا اور

سرکاری طور پر جو اعلان جاری ہوا وہ یہ تھا۔ "کلیسا نے پادریوں کے تجزیے کے بعد دو حصے کردیئے ہیں اور یہ تاریخ میں بھی موجود رہے ہیں' ان سے مراد یونانی اور مشرقی ہیں۔ پہلے گروہ سے تعلق رکھنے والا پادری خدا کے غلام کا منتخب منتظم (Magistrate) ہے اور دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والے کا تعلق روحانی اسرار و رموز سے ہوگا اور وہ حقیقتاً "واسطے" کا کام کرے گا۔ {۲} عہد نامہ جدید کا بہت سا حصہ دوسری صدی عیسوی کے آخری زمانے میں لکھا گیا اور ۳۲۵ء میں نیقیہ کی کونسل میں صلیب کو عیسائیت کی علامت کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ مذہب' مذہبی تصورات کی وضاحت اور مذہبی عبارات کی تفسیر و تشریح کے لئے ایک مستحکم ادارہ قائم کیا گیا۔ بشپ (اسقف اعظم) کو روحانی و اخلاقی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی نگرانی سونپ دی گئی اور مذہبی معاملات میں وہ مطلق العنان بااختیار ہستی بن گیا۔ حکومت بشپ کو سرکاری خزانے سے تنخواہ ادا کرتی تھی۔ بعد ازاں بپتسمہ اور عشائے ربانی (Eucharist) کی رسمیں شامل کی گئیں۔ بشپ حضرات کا اسی طرح "مجلس کلیسا" میں اجلاس ہوتا جس طرح ہمارے ہاں پارلیمنٹ میں ہوتا ہے' وہ مذہبی عقائد' مذہبی تعلیمات اور مذہب کے متعلق دوسرے پہلوؤں کی تعبیر و تشریح کرتے اور اس طرح کلیسا کے قیام کی تکمیل ہوگئی۔

تمام مخلص اور عظیم مسیحی' چاہے وہ کسی بھی دور میں ہوں ان کا خیال تھا کہ مسیح کی تعلیمات کبھی بھی سائنس نہیں بن سکتیں۔ (سائنس کے لفظ کی اصل تعریف کے مطابق) {۳} "ذاتی عقیدہ وجدان سے پھوٹتا ہے اور مذہبیات کا تعلق ریاضیات سے ہوتا ہے" اور

{۲} Iucien Henri : The Origin of Religion.

{۳} گارڈینی وضاحت کرتا ہے۔ کوئی بھی نظام اخلاق یا مذہبی رویہ یا نظام زندگی مسیحیت میں ایسا نہیں ہے جس کو مسیح علیہ السلام کی زندگی سے الگ کیا جاسکے اور جس کے بارے میں کہا جاسکے کہ یہ مسیحیت ہے ۔ مسیحیت مسیح علیہ السلام کی ذات کا نام ہے۔ ایک عقیدہ اس وقت مسیحیت بنتا ہے جب وہ مسیح علیہ السلام کے منہ سے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوا ہو۔

کلیسا نے عیسائیت کو ایک طے شدہ تعلیم میں تبدیل کردیا جس طرح ریاضی یا حیاتیات کی تعلیم ہوتی ہے۔ {۴} کیتھولک مفکر بارتھ اپنی کتاب Dogmatica میں لکھتا ہے۔ "علم العقائد ایسی سائنس ہے جس میں کلیسا اپنے علم کی حدود کے اندر محدود رہتے ہوئے اپنی تعلیمات کی خود وضاحت کرتا ہے۔ یہ ایک پیچیدہ علم ہے ...." جہاں تک بھائی چارے اور محبت کو سائنسی تحقیق کا موضوع بنانے کا تعلق ہے تو یہ اس وقت تک ممکن نہ ہوگا جب تک اس کی اپنی حیثیت ختم نہ ہو۔ عیسائیت کی روحانی آوارہ گردی کا آغاز اس طریقے پر ہوا۔ مقدس اخفاء اور عقائد کے متعلق ناقابل اختتام مباحث نے مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کا رخ اخلاقیات سے علم کلام کی طرف پھیردیا۔ علم کلام کو سائنس کی بنیاد بناکر کلیسا کی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے اندر ورثہ' روایات' تاریخی غلطیاں اور رسومات بھی شامل رہیں۔ اس کے برعکس صوفیاء و رہبان کے جو گروہ مذہبی راہنمائی سے پروان چڑھے ان کا ظہور ہمیشہ کلیسا کی تنظیم سے ہٹ کر ہوا {۵}۔

خیال اور حقیقت سے ہٹ کر کچھ اور پہلو بھی اتفاقی ہیں۔ مسیحیت کے باوا آدم حضرت مسیح علیہ السلام ہیں' جبکہ کلیسا کا بانی پال ہے یا آگسٹین ہے۔ فرد اول مسیح علیہ السلام نے مسیحیت کو اخلاقیات عطا کیں' جبکہ پال نے اسے علم کلام کا گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیا۔ یاد رہے کہ افلاطون اور ارسطو کے درمیان کلیسا کے بارے میں جو ہچکچاہٹ رہی ہے اور جو قرون وسطی کے زمانے میں کلیسا کا طرہ امتیاز رہی ہے اس کے پس پردہ بھی یہی اختلاف کارفرما ہے۔ اپنی کتاب "تاریخ اخلاقیات" میں جو دل لکھتا ہے "عملی زندگی کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ صحیفوں کی تعلیمات سے دور اول کے مسیحیوں کا

{۴} برٹرینڈ رسل کا خیال ہے کہ مذہب کے پیش نظر ریاضی کا خاکہ رہا ہے۔ قدیم یونان' قرون وسطی اور یورپ میں کانٹ تک یہی سلسلہ جاری رہا ہے۔

{۵} السیس کے سینٹ فرانسس کی تعلیمات کو اس لیے رد کردیا گیا کہ وہ ایک غریب آدمی تھا۔

طرز عمل مختلف تھا۔ اسی طرح بعد کے ادوار میں لوگوں کا طرز عمل مختلف ہی رہا ہے اس وقت یہودیت ہو یا بت پرستی کا زور ہو۔ "علاوہ ازیں" ہر دور میں عیسائیت کو اخلاقیات کا مذہب سمجھا جاتا رہا ہے اور عہد ناموں میں اس کی طرف اسی نقطہ نظر سے رجوع کیا جاتا رہا ہے کہ عیسائیت ایک راز ہے' نجات کا مذہب ہے۔ صحائف میں مقید ہے۔ کلیسا ہمیشہ پال اور عہد نامہ جدید میں شامل خطوط کی طرف رہنمائی کرتا ہے' جبکہ ایمان اور عقیدے کا رشتہ ہمیشہ مسیح علیہ السلام اور صحائف سے جڑتا ہے۔ پال کے دور کا آغاز سادہ لفظوں میں مسیح علیہ السلام کی عظیم الشان تاریخ کا اختتام ہے اور اس کے بعد مسیحیت ایک منظم ادارے کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ پال کی تعلیمات میں شاعری' معیشت' درجہ بندی' شادی' اطاعت' عدم مساوات بلکہ غلامی تک کو چھوا گیا ہے جو عہد ناموں سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔ مسیح علیہ السلام اور عہد نامے ایک طرف ہیں' جبکہ کلیسا اور مذہبیات دوسری طرف ہیں۔ پہلا تصور صرف خیال ہے دوسرا تصور حقیقت ہے۔

مارکس اور مارکسیت

نظریاتی طور پر تو مارکسیت نظریے کا نام جامع ہے لیکن عملی طور پر ایسی نہیں ہے۔ مارکسیت کا دعویٰ ہے کہ انسان حیاتیاتی اور عمرانی طور پر اپنے ماحول کی پیداوار ہے۔ اور اس کا سماجی وجود اس کے شعور کا تعین کرتا ہے نیز کسی شخص کے عقائد اور اعتقادات اس کے معاشی درجے کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ تاریخی واقعات خیالات یا انسان کے شعوری اعمال سے وقوع پذیر نہیں ہوتے' بلکہ ان معروضی حقائق کی بنا پر وجود میں آتے ہیں جو انسان پر انحصار نہیں کرتے اور تاریخ ہر دور میں تنقیدی جبر کا شکار رہی ہے۔ غلامی کے خاتمے کی وجہ اخلاقی اصول نہیں ہیں' بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اقتصادی ضروریات اور مفادات کے لئے زیادہ مناسب نہ رہی تھی۔ جاگیرداری نظام کے خاتمے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ کچھ لوگ اس نظام کا تیاپانچا کرنا چاہتے تھے' بلکہ پیداوار کے اضافے' نیز مادی و صنعتی حاصلات نے ایسی صورت حال پیدا کردی تھی۔ سرمایہ داری کا ارتقاء' اقتصادی ضروریات' نیز پیداواری قوتوں وغیرہ کا حاصل ہے اور اس کے ترقی پانے میں فلسفیوں' ماہرین معاشیات' ماہرین قانون اور مفکرین اخلاق کے نظریات کا کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ فرض کرنا بھی بالکل منطقی ہے کہ اشتراکی نظام کا قیام سیاسی جماعتوں خواہشات اور خیالات پر منحصر نہیں ہے' بلکہ اس کا تعلق پیداواری قوتوں کی ترقی سے ہے۔ ایک سماجی انقلاب اس وقت وقوع پذیر ہوتا ہے جب تکنیکی ترقی اور صنعتی کارکنوں کی فوج کے درمیان صنعتی تعلقات کی نوعیت کا توازن بگڑ جاتا ہے اور کسی بھی لمحے تبدیلی واقع ہونے والی ہوتی ہے۔ تمام مارکسی مکتبہ ہائے فکر اسی چیز کی وضاحت کرتے ہیں۔

حقیقی زندگی میں --- جس طرح اہل ایمان خدا کی بہت زیادہ مداخلت پر ایمان نہیں رکھتے اسی طرح ملحد لوگ بھی "واقعات کے فطری ارتقاء" پر بہت زیادہ یقین نہیں رکھتے۔ وہ ان "معروضی حقائق" سے کوئی چیز متعلق نہیں رہنے دیتے' بلکہ لوگوں اور واقعات کو ترتیب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کمیونزم کا نظریہ "فطری طور پر" ظاہر نہیں ہوتا اس کو درآمد کرنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے ہمیں کمیونسٹ ایسے ممالک میں بھی برسر اقتدار نظر آتے ہیں' جہاں محنت کش طبقہ موجود ہی نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کا دعویٰ ہے کہ تاریخ کے راستے میں شخصیات کا کوئی کردار نہیں ہے وہ ہی معصوم لیڈر پیدا کرتے ہیں۔ ایسے خدا' جن کے سر دوسرے انسانوں سے زیادہ بلند ہوتے ہیں' ہر چیز میں ہمیں جن کی حکمت و دانائی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ چاہے میدان جنگ کی فتوحات ہوں یا لسانیات میں ارتقائی ترقی ہو۔ مارکسی ضابطے کے مطابق تبدیلی اسی طرح آتی ہے۔ صنعت کو فروغ دیجئے۔ محنت کش طبقہ اور سیاسی جماعت وجود میں آجائے گی لیکن حقیقت میں یہ ترتیب الٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ ترقی پذیر اقوام میں کمیونسٹ حکومتوں نے صنعتوں کو استحکام بخشنے اور اس کے ساتھ محنت کش طبقے کو قوت فراہم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ شعور سے وجود بنتا ہے، سیاست سے تاریخ اور ڈھانچے سے بنیاد وجود میں آتی ہے۔ مارکس نے جو منصوبہ پیش کیا ہے اس میں صرف کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی قوت باقی رہتی ہے کوئی دوسری قوت باقی نہیں رہتی اور یہ پارٹی بھی کارکنوں پر مشتمل نہیں ہوتی' بلکہ سماجی طور پر مختلف النوع اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے (1)۔

مارکس کے بقول ترقی ایک سنگدلانہ تدریج ہے نہ اس میں مداخلت کی جا سکتی ہے نہ اس کو تابع بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود مارکسی حضرات کوشش کرتے ہیں کہ اس طریقہ کار کو تمام ممالک کے سماجی اور اقتصادی نظاموں سے بالاتر کردیا جائے جبکہ انہیں اس حقیقت کا بھی علم ہوتا ہے کہ ایک ملک کے سماجی اور اقتصادی حالات دوسرے ملک سے قطعاً مختلف ہوتے ہیں اور اس کو یہ لوگ نظرانداز کردیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ریاستہائے متحدہ امریکہ کی کمیونسٹ پارٹی کا منشور اور منصوبہ کو سٹاریکا یا انڈونیشیا کی پارٹیوں سے الگ نہ ہوگا۔ دنیا میں اسی سے زیادہ کمیونسٹ پارٹیاں مختلف اقتصادی اور سماجی حالات میں مصروفِ عمل ہیں چاہے افریقہ کے قبائلی ممالک ہوں یا یورپ کے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک ہوں، اس کے باوجود یہ سب کی سب کم و بیش ایک ہی اقتصادی اور معاشرتی و سیاسی ڈھانچہ پیش کرتی ہیں یعنی ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت' اجتماعی کاشتکاری' یک جماعتی سیاسی نظام' سیاست اور نظریات پر اجارہ واری' وغیرہ وغیرہ۔ اگر "بنیاد" اور "کارکن" کا نظریہ درست ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یہ فارمولا ہر مقام پر اور ہر ملک میں درست ثابت ہوگا۔ یہ کس طرح ہوگا کہ مختلف سماجی و اقتصادی حالات میں سوشلزم کا نفاذ ایک ہی طرز پر ممکن ہو۔

تاریخی واقعات کی مادہ پرستانہ تعبیر میں جو عدم توافق ہے اس کا تجزیہ تاریخ کے کسی دور کے مطالعے سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی حسن اتفاق ہے کہ اس صدی کے

---

(۱) سیاسی سماجی اور روحانی زندگی کا ڈھانچہ مادی زندگی کی پیداوار کے راستے کے ساتھ ملحق ہوتا ہے' لوگوں کا سماجی وجود ان کے شعور سے شناخت نہیں پاتا' بلکہ ان کا شعور سماجی وجود سے راستہ پاتا ہے۔

Karl Marx : Zur Kritik Der Politischen Okonomie

(آج ۱۹۹۳ء میں صورت حال بدل چکی ہے۔ مترجم)۔

پہلے نصف اول میں جو کمیونسٹ تحریکیں اور ریاستیں وجود میں آئی ہیں وہ تمام کی تمام مادہ پرستانہ نظریات کی واضح تردید اور تغلیط ہیں۔ کمیونسٹ انقلابات ان علاقوں میں برپا نہیں ہوئے ---- نظریے کے مطابق ----انہیں جہاں برپا ہونا چاہیے تھا۔ جدلی مادیت کے نقطہ نظر سے کمیونسٹوں کے خاتمے میں ناقابل تردید مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ کمیونسٹ تحریکیں ان علاقوں میں کامیاب نہیں ہوئیں جہاں اس کے لئے موزوں حالات مہیا تھے' بلکہ وہاں برپا ہوئیں جہاں حالات غیر موزوں تھے۔ یعنی جہاں بیرونی مضبوط قوت یا سیاسی جماعت موجود تھی۔

یہ تو واضح ہے کہ عملی طور پر مارکسیت کو "تاریخی جبریت" کا سامنا کرنا پڑا' لیکن عملی طور پر یہ ناکام رہا۔ ہر مادہ پرستانہ نظریے کی بنیاد پہلے نظریے پر ہے اور اس کا مظہر دوسرے نظریے کی صورت میں نکلتا ہے' لیکن اس کا خلفشار لازمی ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اینجلز نے کونرڈ سمتھ کے نام اپنے خط مرقومہ ۸ مئی ۱۸۹۰ء میں لکھا کہ اگر "مارکسی نظریے کو لفظ بہ لفظ لاگو کردیا جائے" تو کبھی کبھار ناقابل یقین فضولیات ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ وہ پال برتھ کے اس دعوے سے اختلاف رکھتا ہے کہ مارکسی معیشت پر شعور کے تمام اثرات کی نفی ہوتی ہے۔ اینجلز نے "نظریہ شرائط" پر بہت سختی سے عمل نہ کرنے کی سفارش کی۔ خیالات کے معکوس اثر کے بارے میں وہ لکھتا ہے :

> ان کا عمومی انحصار معاشی حالات پر ہوتا ہے۔ مارکسیت کو ان حالات میں سے اکثر کا اعتراف کرنا پڑا۔ اثباتی مفکرین مارکسیت کو ایک سائنس تسلیم کرنے سے انکاری ہیں' کیونکہ اس میں سیاسی' اخلاقی' نظریاتی حتی کہ تصوف کے بارے میں بھی بہت کچھ ہے۔ تاہم اثبات پسندوں کی بات کتابوں میں رہی اور مارکسیت کے پرستاروں نے دنیا کو فتح کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مارکسیت کبھی بھی "مستقل مادیت" کی شکل اختیار نہ کرسکی"۔

انحراف کے بارے میں تعلیمات جو کارل مارکس کے ابتدائی کاموں سے متعلق ہیں اپنی اصل کے لحاظ سے غیر حقیقی ہیں۔ اس کی بنیادیں ہیگل کے فلسفے میں تلاش کی جا سکتی ہیں ـــــ نظریہ انحراف پر عرصہ دراز تک خاموشی سے عمل ہوتا رہا۔ مارکس کی معاشی اور فلسفیانہ تحریریں اسی نام سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئیں۔ (کمیونسٹ مینی فیسٹو کے اسی سال بعد اور داس کیپٹل کی پہلی جلد کے ساٹھ سال بعد) اگرچہ اس کو ۱۸۴۴ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ اپنی کتاب Thesis on Feuer-bach میں بھی اس نے ختم ہوتی ہوئی مادیت کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں جو کہ انسان پرستی کی روش سے سرشار ہو کر لکھی گئی ہیں۔ مارکس کی نوجوانی کے خیالات کا بہترین نمونہ ہیں۔ تاہم اس کے بعد کے دور کی تحریروں میں خالص مارکسیت جھلکتی ہے DAS KAPITAL اور Zur Kritik Der Politischen نیز' Kritik کے پیش لفظ میں مارکس نے تاریخ کے مادی تصور کا خلاصہ پیش کر دیا۔

جب مارکسیت کو عملی زندگی میں نافذ کیا جانے لگا' تو غیر مادہ پرستانہ اور غیر مارکسی عناصر کو بھی شامل کرنا پڑا۔ اگر مارکس خود بھی جائزہ لیتا تو موجودہ دور کے مارکسی ممالک میں اپنی مارکسیت کو پہچاننے میں اسے دشواری پیش آتی۔ اس سلسلے میں ایک اور حقیقت کو مدنظر رکھا جانا چاہیے کہ پروٹسٹنٹ ممالک نے اپنے آپ کو کیتھولک رومانویت اور تصوف سے تو الگ کر لیا لیکن مارکسیت سے وہ بھی بہت قریب رہے ہیں۔ جدید لاطینی قوموں اور ترقی پذیر ممالک میں مارکس کے نظریات تیزی سے مقبول ہوئے۔ پروٹسٹنٹ ممالک نے انہی بنیادوں پر کمیونزم کا انکار کیا جن پر انہوں نے کیتھولک ازم سے علیحدگی اختیار کی تھی۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ کمیونزم کو قوت بھی انہی ذرائع سے ملتی ہے جن ذرائع سے کیتھولک ازم اور رہبانیت کو فروغ ملا۔

تاریخی مادہ پرستی کے خالص نقطہ نظر سے ہم مبنی بر انصاف یا مبنی بر غیر انصاف کا فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ عملی طور پر ہی ممکن ہے۔ اس نقطہ نظر سے تعلقات منصفانہ یا غیر

منصفانہ نہیں، بلکہ بروقت ہوتے ہیں۔ خیال رہے کہ "منصفانہ" ایک اخلاقی اصطلاح ہے اور "موقت" (وقت کے ساتھ باقی رکھنا) ایک مادی اور میکانکی اصطلاح ہے۔ جہاں تک مادہ پرستی کی تکنیکی بنیاد کا تعلق ہے (جسے ہم مارکس کی اصطلاح میں پیداواری قوت کہیں گے) اس نظام نے اپنے آپ کو برقرار رکھا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے آپ کو موزوں بھی ثابت کیا ہے۔ اخلاقی اصول فیصلہ کن ہوتے ہیں، بلکہ معروضی حقائق فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی تمام بنیادیں اہم اور مبنی برحق تھیں جب تک یہ پیداواری قوتوں کی ہم نوا رہیں۔ مارکس نے صاف الفاظ میں لکھا ہے : "جب تک نظام پیداوار کی ضرورت ہے اسی وقت تک انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال بھی ضروری ہے" یہ تو نظریاتی پہلو ہے، آیئے دیکھیں عملی کیفیت کیا ہے؟

مارکسی حضرات تک اس واضح دلیل کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کیونکہ اس طرح انسانی عمل بے مقصد ہو جاتا ہے۔ منطقی تعریفوں کا مقام تو مدرسے کے نصاب کے کتابیں ہی ہیں تاہم ہم سب وہ تصورات اختیار کرتے ہیں جو کم سخت ہوں۔ نیز انسانوں اور زندگی کے کے قریب ہوں۔ مارکسی اور ان کے سیاسی قائدین "استحصال" کو واضح الفاظ میں اس کے اخلاقی اور انسانی مفاہیم میں استعمال کرتے ہیں۔ دوسروں کے کام سے فائدہ اٹھانے کا استحصال (یعنی پیداواری عمل میں معاشی یا تکنیکی تعاون) تو بہرحال ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ مارکس نے اپنی کتاب "سرمایہ" میں بھی استحصال کو اچھے اور برے کی اصطلاحات سے واضح کیا ہے۔ استحصال کرنے والا مجسم برائی بن جاتا ہے اور استحصال شدہ شخص نیکی اور انصاف کی کامل شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مارکس نے بھی "اشتراکیوں کی جمعیت" سے پہلے "حق والوں کی جمعیت" تشکیل دی تھی۔ مزدوروں کے استحصال کی بات کرتے ہوئے مارکس کھلے کھلے الزامات لگاتا ہے جس طرح کہ ہم عہد نامہ قدیم کے انبیاء کو دیکھتے ہیں جنہوں نے ناانصافی اور برائیوں کو للکارا۔ مذہبی مصلحین کے رویے کو تو

اب بھی آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے جن کا خیال ہے کہ برائی کو دور کیا جاسکتا ہے جب کسی برے کام کی مذمت کی جاتی ہے تو یہ دراصل اس بات کا اعتراف ہے کہ انسان کو کوئی بھی راستہ اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہے ورنہ مذمت بے مقصد ہے۔ ایک لازمی استحصال کی مذمت کرنا صریحا دو رخاپن ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ ہم استحصال کو رد کرتے ہیں اور مارکس بھی استحصال کو رد کرتا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان تعلقات کو کبھی بھی صریح معاشی اصطلاحات میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ {۲} ضروری "استحصال" کی مذمت کرتے ہوئے مارکس، حق پر تو نظر آتا ہے لیکن مدلل محسوس نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ مشہور ترین مفکر مادہ پرستی بھی مکمل طور پر مادہ پرست نہ ہوسکا اور نہ وہ ہو ہی سکتا تھا۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ لینن کی مادہ پرستی اور الحاد کس قدر خالص تھا' جبکہ اس کا پسندیدہ ترین مصنف اس کے اپنے الفاظ میں ٹالسٹائی تھا۔ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ مارکسزم کو قوت "ناہمواری" سے حاصل ہوتی ہے اور ان کے ہاں ناہمواری سے مراد اخلاقی اور نظریاتی عناصر ہیں جن سے مارکس نجات حاصل نہ کرسکا۔ مارکسیت نے اپنے طور پر ایک سائنس کی شکل اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن انصاف' امید اور انسان پروری کے لئے یہ ایک مسیحائی پیغام تھی۔ {۳} اپنے ارادوں

{۲} اپنے دوست کگلیمن کی بیوی کو مارکس نے تجویز دی کہ وہ اس کی کتاب "سرمایہ" کے مطالعے کا آغاز آٹھویں باب "کام کا دن" سے کرے کیونکہ اسے یہ کتاب سمجھنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ مارکس کی یہ اہم تحریر کئی ممالک میں شائع کی گئی ہے۔ یہ باب لوگوں سے بہت قریب ہے کیونکہ اس کا انداز کار تاریخی نہیں اخلاقی ہے۔

{۳} برٹرینڈ رسل نے بھی ایسا تبصرہ کیا ہے۔ "مارکس نے اپنے آپ کو ملحد قرار دیا' لیکن وہ بین الاقوامی امید کا علمبردار تھا جس کی تعریف مذہب ہی متعین کرسکتا ہے"۔

اور خواہشات کے برعکس مارکس نے سرمایہ داروں اور مزدوروں کو اعمال قرار دیا' بلکہ انہیں اخلاقی کردار ٹھہرایا جنہوں نے اچھائی اور برائی کے زندہ نمونوں کی صورت اختیار کرلی۔ ایک استحصال کرنے والا ہے دوسرا وہ ہے جس کا استحصال کیا جارہا ہے اور یہ درجہ بندی اخلاقی طور پر لوگوں کی شناخت بنتی ہے۔ کارکنوں اور سرمایہ داروں کے ربط سے یورپ کا انسان ازسرنو اسی دشمنی کا شکار ہوگیا ہے جوکہ ابتدائی دور میں یہودیوں میں حق اور ناحق کی بنیاد بنی تھی۔

کوئی بھی شخص نہ تو خالصتاً ملحد ہو سکتا ہے نہ مادہ پرست ہی ہو سکتا ہے چاہے وہ دل کی گہرائیوں سے ملحد یا مادہ پرست ہونا بھی چاہے۔

❑ شادی :

شادی کا ادارہ انسانیت کی طرح قدیم ہے اور آج بھی اس پر بحثیں جاری ہیں۔ الہامی دین پاکبازی کا مطالبہ کرتا ہے مادہ پرستانہ نظام مکمل جنسی آزادی کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن دونوں تعلیمات اپنے نفاذ کے دوران بہت سی مشکلات کا شکار ہوئیں اور انہوں نے "شادی" کو درمیانے راستے کے طور پر تسلیم کرلیا ہے۔

حقیقی عیسائیت میں شادی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ مسیح علیہ السلام نے مکمل پاکیزگی حاصل کرنے کی تلقین کی۔ "تم لوگوں کو زنا کرنے سے منع کیا گیا تھا اور میں تم سے کہتا ہوں "تم میں سے جو کوئی کسی عورت کی طرف اس ارادے سے نظر ڈالتا ہے اس نے اپنے دل میں زنا کا ارتکاب کرلیا(۴) ان الفاظ کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کے مطابق ہر شخص پاکیزگی کی زندگی اختیار کیے رکھے۔ ٹالسٹائی لکھتا ہے :

{۴} مرقس باب ۵' آیت ۲۸-۲۷

"جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ شادی کی رسم انہیں پاکباز رہنے کی ذمہ داری سے آزاد کردیتی ہے تاکہ اس طرح وہ حیا کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ سکیں' وہ غلط ہیں۔ سینٹ پال اپنے خطوط میں سے ایک میں اشارہ کرتا ہے "غیر شادی شدہ لوگ اس پریشانی کا شکار ہوتے ہیں کہ خدا کو کس طرح خوش رکھا جائے' شادی شدہ' لوگ اس غم کا شکار رہتے ہیں کہ اپنی بیوی کو کس طرح خوش رکھا جائے۔ {۵}

عمومی طور پر عیسائیت شادی کو" ناگزیر برائی قرار دیتی ہے جس کو تکمیل حاصل کرنے کے لئے متروک کیا جانا ہی اچھا ہے۔ بشر کے لئے بہتر ہے کہ وہ عورت کو نہ چھوئے لیکن بدکاری سے بچنے کے لئے مرد کے لئے عورت ہونی چاہیے اور عورت کے لئے مرد ہونا چاہیے۔ {۶}اس خط میں ہمیں عیسائیت کے واضح اصول ٹوٹتے اور حقیقت کے قریب پہنچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ "مفاہمت" ہے۔ مسیحی نقطہ نظر سے شادی کسی اصول پر مبنی حل نہیں ہے' بلکہ عمل سے جس پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ("...... زناکاری کو روکنے کے لئے ..... سینٹ پال)۔

مادہ پرستی بھی تاہل اختیار کرنے سے روکتی ہے لیکن اس کے مقصد الگ ہوتے ہیں "انفرادی شادی کا مطلب یہ ہے کہ ایک جنس دوسری جنس کی ماتحت ہوجائے ......"۔

مردوں اور عورتوں کے درمیان گہری دشمنی کا آغاز شادی کے بعد پیدا ہونے والے مسائل مثلاً ملک کی تقسیم وغیرہ سے ہوا ...... ذرائع پیداوار کو عوامی ملکیت میں دینے کے بعد' واحد خاندان معاشرے کی اقتصادی وحدت نہ بنا رہا۔ خانہ داری سماجی صنعت میں

{۵} کارینتھینین باب ۷ آیت ۳۸

{۶} کارینتھینین' باب ۱ آیت ۲

تبدیل ہو جاتی ہے بچوں کی نگرانی اور ان کی تعلیم ایک قومی معاملہ بن جاتا ہے۔ معاشرہ تمام انسانوں کی طرف سے ایک ہی رویہ اختیار کرتا ہے چاہے وہ بچے جائز طور پر پیدا ہوئے ہوں یا ناجائز طور پر پیدا ہوئے ہوں۔ یہ چیز نتائج کی فکر سے محفوظ بنا دیتی ہے اور یہ فکر آج کے دور کا سب سے بڑا سماجی اخلاقی بلکہ اقتصادی مسئلہ بنی ہوئی ہے جو ایک لڑکی کو اس بات سے روکتی ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس شخص کے حوالے نہ کرے جس سے وہ محبت کرتی ہے۔ کیا یہ چیز زیادہ مناسب نہ ہوگی کہ بے قید اختلاط کو بتدریج پروان چڑھایا جائے اور اس کے ساتھ زیادہ باشعور عوام پیدا کی جائے جو کنواری کی عصمت اور "عورت کی حیا" کو سمجھ سکے {۷}۔

عیسائیت کے دنیا کے بارے میں نظریے اور اس کے حیا کے نظریے میں ایک واضح تعلق موجود ہے۔ {۸} مغرب میں مادہ پرستانہ سوچ سے اتفاق رکھنے والے ایسے اہل علم موجود ہیں جن کا خیال ہے کہ رد عمل کے معاشی نظاموں اور جنسی دباؤ میں ایک تعلق ہے۔ ولہم ریخ، ٹراٹسکی اور "فرینکفرٹ سکول" کا تعلق انہی نظریات والوں سے ہے۔ ہربرٹ مرکیوس کہتا ہے کہ سرمایہ داری انسان کی جنسی قوت کو دبا دیتی ہے تاکہ اس کی اس جنسی قوت کو دوسرے میدانوں میں استعمال کیا جا سکے۔

مجرد رہنے کے تصور کی بنیاد نہ تو خدا کے احکامات پر مبنی ہے نہ کلیسا کی اولین روایات

{۷} Engels :

The Origin of Family Private' property and the state.

عملی زندگی میں یہ ناممکن بات ہے۔ آگ اور پھونس کا اکٹھا ہونا اور عورت اور مرد کا اختلاط ہم معنی باتیں ہیں۔ اس کے لئے وہ قیود نافذ کرنا ضروری ہیں جو مذہب نے ضروری سمجھی ہیں۔ موجودہ یورپ کے معاشرے کے حالات اس کا ثبوت ہیں کہ بے قید اختلاط سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے (ادارہ)۔

{۸} یہ دعویٰ کبھی کبھار غیر معمولی شکل بھی اختیار کر گیا۔

ہی میں اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ (۹) تاہم شادی نہ کرنا مادہ پرستانہ ثقافت کا ایک فطری عنصر ہے آخری ویٹی کن اجلاس میں کوشش کی گئی کہ ترک شادی کی رسم کا خاتمہ ہو لیکن یہ کوشش ابتدا ہی میں ناکام ہو گئی۔ حقیقت میں ان اصولوں کو مکمل طور پر کبھی بھی سمجھا نہ جاسکا۔ انتہائی محدود لوگوں کی مختصر سی تعداد ترک دنیا اور ترک ازدواج پر یقین رکھتی ہے جبکہ سوویت یونین میں جنسی آزادی کے منفی تجربے کے بعد شادی کے ادارے کو از سرنو شروع کیا گیا۔

شادی کے ادارے کی طرف رجوع دونوں صورتوں میں موجود ہے' لیکن ان کا آغاز الگ الگ نکات سے ہوتا ہے۔ مسیحیت مکمل حیا کے مطالبے سے آغاز کرتی ہے اور مادہ پرستی مکمل جنسی آزادی کے مطالبے سے شروع ہوتی ہے! اس طرح عیسائیت شادی کو ایک مقدس ضابطے میں بدل دیتی ہے' جبکہ مادہ پرستی شادی کو ایک معاہدہ بنا دیتی ہے اور کبھی کبھار یہ ضابطہ بہت سے ضابطوں کا پابند ہوتا ہے۔ روس میں شادی کا قانون اس کی واضح دلیل ہے لیکن کیتھولک اور سول شادی کے ضابطوں میں بہت سے اختلافات ہیں اور اس میں سب سے اہم پہلو طلاق کا ہے۔ اگر شادی ایک مقدس رشتہ ہے تو اس مقدس رشتے کو ٹوٹنا نہیں چاہیے کیونکہ یہ اگر ٹوٹ گیا پھر تو یہ معاہدہ ہو گیا مقدس رشتہ نہ ہوا۔ اسی طرح اگر شادی کے معاہدے کو فسخ کرنے کا کوئی راستہ نہ ہو تب تو شادی ایک معاہدہ نہ رہ گیا' بلکہ عجیب و غریب قسم کا جبر بن گیا۔

اسلامی ازدواج نے ان دونوں قسم کی شادیوں کو یکجا کر دیا' یورپی نقطہ نظر سے اسلامی شادی مذہبی اور معاشرتی مظہر ہے۔ یہ بیک وقت سماجی بھی ہے اور مذہبی و روایتی بھی ہے۔ یہ رسم "مولوی صاحب" کی موجودگی میں ادا کی جاتی ہے اور وہ حکومت کا نمائندہ بھی ہوتا ہے۔ اسلامی شادی کو توڑا بھی جاسکتا ہے کیونکہ یہ ایک معاہدہ ہے' لیکن طلاق

---

(۹) ۱۱۳۹ء کی چرچ کونسل میں اس کا آغاز ہوا۔

کی اجازت اسی وقت ہوگی جب اس کے لئے مضبوط دلائل ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "طلاق کو حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ" قرار دیا ہے۔ اس سے اسلام کی اخلاقی اور مذہبی تعلیمات کا اندازہ کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ اس لئے شادی ایک نمونے کا اسلامی ادارہ ہے۔ اسلام میں شادی کا ادارہ اس سوال کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کس طرح انسان کی روحانی ضروریات اور جسمانی ضروریات کا حل پیش کیا جائے۔ محبت کا انکار کیے بغیر پاکی کے راستے پر کس طرح چلا جائے اور ایک ایسے جانور کی صنفی خواہش کو کس طرح قابو میں لایا جائے جو فرشتہ تو نہیں بن سکتا تاہم آدمی بن سکتا ہے۔ یہ بلند نصب العین خالصتاً اسلامی ہے۔

شادی کو انصاف پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ ادارہ مسیحیت کے اقدامات کی نسبت زیادہ حق اور سچائی فراہم کرسکتا ہے کیونکہ مسیحیت نے پاکبازی اور عالمگیر محبت کا نعرہ دیا ہے۔

ٹالسٹائی نے ان تمام حقائق کو سمجھا' لیکن اس سے نتائج بالکل متضاد اخذ کیے' وہ لکھتا ہے :

> "کیونکہ خالص مسیحی تعلیمات میں شادی کے ادارے کی کوئی بنیاد نہیں ہے اس لئے ہماری مسیحی دنیا کے لوگ اس تعلق کو دریافت کرنے میں ناکام رہے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ادارہ اپنی نوعیت کے ساتھ خالص مسیحی ہے۔وہ مسیح کی مثالی زندگی کی طرف نہیں دیکھتے جو صنفی پاکیزگی کی مثال ہے اور موجودہ عقیدے میں اس کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ وہ قومیں جن کی اخلاقی تعلیمات درجے میں عیسائیت کی تعلیمات سے بھی فروتر ہیں۔ ان میں قحبہ گری' اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے اور ایک سے زیادہ شوہر رکھنے کے رجحان کے بارے میں کچھ ضابطے ہوتے ہیں لیکن عیسائیت میں تعدد ازواج کی انہی

پابندیوں کے سبب بہت سی داشتائیں اور بہت سے مردوں کے ساتھ جنسی تعلق قائم رکھنے کا طویل رجحان رہا ہے"۔

❑ دو قسم کے اوہام :

ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اگر یہ درست ہے تب دو قسم کے رویے جنم لیتے ہیں۔ سائنس جو انسان کی اندرونی زندگی کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتی ہے اور مذہب جو فطری مظاہر کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

روحانی دنیا کی وضاحت کرتے ہوئے سائنس اس کا معروضی مطالعہ کرتی ہے اور روحانی دنیا کو ایک وجود اور ایک معمول بنا دیتی ہے۔ مذہب جب فطرت کی وضاحت کرتا ہے تو اس کو ذات بنا لیتا ہے اور اس کو "غیر فطرت" میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ہمیں ایک ہی قسم کے خلط ملط تصورات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کا رشتہ معکوس ہوتا ہے۔

ابتدائی ادیان اپنے جادوگروں اور رسم تحریم کے سبب اوہام کے زیادہ قریب تھے' ان کا موازنہ کیا جانا ممکن نہیں ہے۔ حقیقت میں یہ مذاہب انسان کے اندرونی عدم توافق کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کا اظہار انسانیت کے دو اولین مشغلوں سے ہوتا ہے۔ یعنی روحانی شغل' جب انسان اپنے آپ کو انسان محسوس کرتے ہوئے اردگرد کی فطری اشیاء سے الگ محسوس کرتا ہے۔ ثانیاً جسمانی طور پر اس امر کی ضرورت کہ وہ مخالفتوں اور خطرات کی دنیا میں باقی رہنے کی جدوجہد کرے۔ ابتدائی مذہبی شعور کے ساتھ باقی رہنے کے جذبات کی بدولت جب انسان اس دنیا کی طرف پلٹا تو دنیا اس کے لئے اور فطری ہو گئی۔ (کامیاب شکار' زرخیز فصل' مخاصمانہ فطرت' بیماری' وحشی جانور سے حفاظت) جب کہ ذرائع اور طریقہ ہائے کار مذہبی ہی رہے (جادو' روحانی رقص' نغمے، مظاہر پرستی)۔ ابتدائی ادوار کے مذاہب شعور پر مبنی تھے اور دنیاوی ضروریات کے ساتھ ساتھ روحانی ضروریات

پر بھی مشتمل تھے۔ لیکن چونکہ یہ مذاہب حقیقی زندگی میں کوئی مقصد نہ حاصل کرسکے اس لئے ابتدائی دور کے مذاہب سے انسان کی کمزوری اور کور بصری کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسی طرح جو مذہب آزاد روی کو رہبانیت کے ساتھ سائنسی سچ کو عقائد کے ساتھ اور سماجی اعمال کو رسوم کے ساتھ بدلنا چاہے اس کا سائنس کے ساتھ ٹکراؤ ہوکر رہے گا۔ اس کے برعکس ایک سچا مذہب سائنس کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے اور بہت سے عظیم سائنس دان اس قسم کی "خدا پرستی" سے آشنا ہیں۔ اسی طرح اوہام و خرافات کے خاتمے میں سائنس ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ اگر مذہب اور سائنس کو الگ الگ کردیا جائے تو مذہب قدامت کی طرف کھینچنا شروع کردے گا اور سائنس الحاد کی طرف لے جائے گی۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ سائنس کے اپنے "توہمات" شروع ہوتے ہیں جب یہ "فطرت" کے میدان سے باہر نکلتی ہے۔ غیر نامیاتی دنیا کے مسائل پر انسان کا ذہن مات نہیں کھاتا' لیکن زندگی کے معاملات پر اس کی ذہانت محدود اور غیر یقینی ہے۔ زندگی کے معمولات پر تجزیہ اور مقداریت کے معیار کو اختیار کرنے سے سائنس کو زندگی اور روحانی معاملات کے چند پہلوؤں کی نفی کرنا پڑی ہے اور ان کا وجود صرف ظاہری رہ جاتا ہے' جس طرح مذہب کی عمرانیات نے مذہب کی روح کو فراموش کیا۔ حیاتیات نے زندگی کو فراموش کیا، نفسیات نے روح کو فراموش کیا، عمرانیات نے انسان کی شخصیت کو فراموش کیا اور تاریخ نے انسان کے اندرونی مفاہیم کو فراموش کیا{۱۰}۔

فلسفیانہ اور تاریخی مادیت سے بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن سے سائنسی طریقہ ہائے کار کی ناکامی کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر "مذہب عوام کی افیون ہے"۔ "قانون

{۱۰} F.B. Skinner : Beyond Freedom and dignity

(New York : Alfred A. Knopf 1971)

حکمران طبقے کی پسند ناپسند کا نام ہے"۔ غلامی کا خاتمہ "ترقی یافتہ سرمایہ داری کے مفاد" میں ہے۔ "کانٹ اور گوئٹے" سرمایہ دارانہ نظام کے محافظین ہیں اور لایعنیت (Absurdism) کا فلسفہ "سرمایہ دارانہ نظام کی آزمائش کا مظہر" ہے' وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے مارکسی ادیب کہتے ہیں کہ جان پال سارتر کا "خوف اور موت کے" متعلق فلسفہ "نظام پیداوار" کی ناکامی کے اظہار کے سوا کچھ بھی نہیں ہے {۱۱}۔

عظیم فرانسیسی مصنف ' بالزاک نے بھی اسی قسم کی غلطی کی جب اس نے اپنے مشہور و معروف ناول کا دیباچہ لکھا۔ اس دیباچے میں اس نے سائنسی اور اثباتی طرز پر بنی نوع انسان کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ انسان کی اندرونی زندگی کا تجزیہ کرنے میں سائنسی طریقہ کار کس طرح ناکام رہتا ہے اس کی واضح مثال یہ دیباچہ ہے۔ انسانوں کے متعلق سچ کو بالزاک نے Human Comedy میں جس حقیقت پسندانہ اور جاندار انداز میں بیان کیا ہے اس کا دیباچے کی فاضلانہ وضاحتوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

جب سائنس کسی فنی شہ پارے کی وضاحت کرتی ہے تو وہ اسے نفسیاتی مظہر تک محدود کرکے رکھ دیتی ہے۔ سائنس کے نزدیک فنکار "شخصی انتشار" کا شکار ہوتا ہے۔ نفسیاتی تجزیہ نگار ہیٹیکل بیان کرتا ہے کہ میری تحقیق نے مجھ پر یہ ثابت کردیا ہے کہ شاعر اور ذہنی طور پر معذور شخص میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سائنسی نقطہ نظر سے فنکارانہ تخلیق کا بہترین تجزیہ ایک دوسری سائنس سے کیا جاسکتا ہے جس کا نام "نفسیاتی تجزیہ" ہے۔ اس تحقیق کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تخلیق اور دماغی خلل میں ہم آہنگی ہے {۱۲}۔

اگر عقلی طور پر دیکھا جائے تو مصنوعی قصبوں یا ملٹری بیرکوں پر کوئی اعتراض عائد نہیں کیا جاسکتا۔ مائزوان دیر روحے کہتا ہے :

{۱۱} Iucien Goldman in the Magazine "Art" Writing about Existentialism.

{۱۲} Dr. V. Jerotic: Sickness and Creation (Belgrade 1976).

"اگر ہم تعمیر ایمانداری سے کرتے ہیں تب تو کلیسا کی تعمیر کو فیکٹری کی تعمیر سے مختلف نہیں ہونا چاہیے"۔

حیاتیاتی سائنس نے تو یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ انسان حقیقت میں جانور ہی ہے یعنی جانور ایک چیز کا نام ہے اور زندگی آخرکار میکانکس ہے' یعنی زندگی نہیں ـــــ غیر زندگی ہے' اخلاقیات میں بھی اسی قسم کی اختراع ہوئی۔ عقل نے فیصلہ دیا کہ اخلاقیات خودغرضی کی ترقی یافتہ مہذب اور شائستہ شکل ہے یعنی اخلاقیات' اخلاقیات کی نفی کا نام ہے۔ نفسیاتی تخیل نے بیماری اور فنکارانہ تخلیق کا امتیاز ختم کردیا ہے۔ اس طرح انسان کے معاملات میں سائنسی تحقیق کا خاتمہ بہت سے انکاروں کے ساتھ ہوا۔ سب سے پہلے خدا کے وجود کا انکار کیا گیا۔ بعد ازاں زوال پذیر درجہ بندی کے ذریعے انسان کا انکار کیا گیا پھر زندگی کا انکار شروع ہوا اور آخرکار نوبت یہاں تک جاپہنچی کہ ہر چیز ایک کھیل ہے اور مالیکیولر قوتوں کا بالعکس متناسب تعامل ہوتے ہیں۔ انسانی ذہن دنیا کے اندر میکانیت اور حادثات کے سوا کچھ نہ پاسکا۔

باب دہم

اینگلو سیکسن دنیا

یورپ نے اپنے بنیادی تصورات قرون وسطیٰ کے ابتدائی مدرسوں میں سے اخذ کیے۔ دور طفولیت کے یہ تجربات یورپی ذہن سے ابھی تک محو نہیں ہوسکے ہیں اگرچہ یورپ کا ذہن بلوغت کو پہنچ چکا ہے۔ معاملات مذہبی ہوں یا غیرمذہبی یورپ ہمیشہ مسیحی متبادلوں کے درمیان سوچ کا چا ہے خدا کی بادشاہی ہو یا زمین کی بادشاہی ہو۔ یورپ یا تو سائنس کا انکار کرتا ہے یا مذہب کا انکار کرتا ہے۔ یورپ کی کوئی بھی مذہبی تحریک معاشرتی پروگرام کی حامل نہیں ہو سکتی یورپی مذہب اور الحاد دونوں غیر معمولی اور تبدیلی پسند ہیں۔

مغربی دنیا کا ایک حصہ اپنی جغرافیائی پوزیشن اور تاریخ کے باوجود قرون وسطیٰ کی نصرانیت اور اس کے طاقتور دور کے براہ راست اثرات سے محفوظ رہا ہے۔ یورپ کے اس حصے نے ایک درمیانے راستے کی تلاش جاری رکھی ہے جو ظاہری طور پر تیسرے راستے یعنی اسلام سے مشابہت رکھتا ہے۔ یہاں اس وقت گو برطانیہ مراد ہے لیکن بڑی حد تک اینگلو سیکسن دنیا اس میں شامل کی جاسکتی ہے (1)۔

انجیل مقدس کے پہلے سرکاری انگریزی ترجمے کے پیش لفظ کا آغاز ان الفاظ سے

ہوتا ہے' "آغاز ہی سے اینگلیکن کلیسا میں عبادت کا طریقہ دو انتہاؤں کے درمیان کا راستہ رہا ہے"۔ یہ اصول انگریزوں کی مذہبی اور عملی زندگی میں "اصول اول" کی حیثیت کا حامل رہا ہے اور اب بھی ہے۔

عیسائیت نے مغربی دنیا کی تاریخ کو دو الگ اور متضاد ادوار میں تقسیم کردیا۔ قرون وسطٰی اور جدید دور جس نے مذہب و سائنس اور کلیسا و سیاست کے دو راستے دریافت کئے، یہ تاریخ ساز منصوبہ اور پلان برطانیہ میں تو کامیاب نہ ہوسکا۔ کم از کم اس لحاظ کامیاب نہیں ہے جس لحاظ سے یورپ میں رہا ہے۔

اسی لئے یورپی تاریخ کے برطانوی تجربے کو الگ سے سمجھا جانا چاہیے۔ برطانیہ سے علیحدہ یورپ کے دو دور ہیں۔ پہلے دور کو کلیسا کا دور اور دوسرے دور کو ریاست کا دور کہتے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے گفتگو کرتے ہوئے یورپ کا درمیانی "اسلامی" دور برطانیہ میں پایا جاتا ہے۔ یورپ میں جمہوریت' لامذہبیت اور مافوق الفطرت اصولوں کا ملغوبہ ہے اور یہ خالصتاً انگریزی ایجاد ہے۔ نیٹشے جس کا یورپ سے تعلق کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ ہے اور اس نے انگریزی اور یورپی ذہن کے درمیان فرق کی وضاحت اپنے اس سوال کے ذریعے کی۔"یورپ کو برطانیہ سے اور برطانیہ کو جمہوریت سے کس طرح بچایا جائے؟"۔

تاریخ کے فلسفے کے نقطہ نظر سے برطانیہ کا ظہور اور مغرب کی تاریخ میں اینگلو سیکسن روح کی کارفرمائی ایک ہی وقت کی مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ سپینگلر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور کرامویل میں مماثلت ثابت کرنے کوشش کی۔ {۲}اس کی نگاہ میں یہ دونوں تاریخی شخصیات "ہم عصر" ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے متحدہ ریاست بلکہ عالمی قوت کا آغاز کیا۔ دونوں خالص عقیدہ رکھنے والے اور بڑی

{۱} عیسائیت کی بہت سی اصلاح شدہ اور ترمیم شدہ حالتیں اب بھی موجود ہیں۔

{۲} Spengler : the decline of the west.

ریاستوں کے بانی تھے۔ اینگلو سیکسن ذہن اور اسلامی ذہن کو یہ چیز بالکل معتدل نظر آتی ہے لیکن یورپی ذہن کے لئے یہ چیز عجیب ہوگی۔ لوئیس نے فرانسیسی ریاست کو تباہ کیا جبکہ اسلامی دنیا میں ہر قسم کی سیاسی اور سماجی ترقی کا آغاز مذہبی تجدید سے ہوا۔ جیسے ہی یورپی ریاست وسیع ہوئی اس نے پاپائیت کی شکل اختیار کرنا شروع کر دی بالکل اس طرح جس طرح کلیسا نے چند صدیوں قبل اختیار کی تھی۔۔ اس طرح نہ برطانیہ اور نہ اسلام ہی کو کلیسا کونسل کا سامنا کرنا پڑا۔ انگریزی تحریک اصلاح ناکام ہوگئی کیونکہ اس کے پس پشت ایک وراثتی منطق تھی دو انتہائیں تھیں' اسقف اعظم اور بادشاہ کا غلبہ۔ پندرھویں اور سولھویں صدی کے یورپ کے نزدیک برطانیہ انقلابی تھا۔ موجودہ دور کے یورپ کے نزدیک آج کا برطانیہ "قدامت پرست" ہے۔ برطانیہ میں Conservative کی اصطلاح سے دراصل یہ اپیل مراد ہوتی ہے کہ مصدقہ انگریزی روح کو محفوظ رکھا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اس سے مراد یہ ہے کہ درمیانے راستے کو اختیار کیا جائے۔

انگریزی طرز زندگی کی اس دو پہلو رکھنے والی حیثیت کو زیادہ بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے' اگر ہم یہ بات ذہن میں لائیں کہ برطانیہ کی روحانی ترقی کا بانی اور پیش رو راجر بیکن تھا۔ آغاز ہی سے اس نے انگریزی فکر و فلسفہ کی دو الگ بنیادیں رکھیں۔ اندرونی تجربات جو روحانی تجلیات کی طرف لے جاتے ہیں (یعنی مذہب) اور مشاہدہ جو حقیقی سائنس (عملی تجربات) کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

اگرچہ مذہبی اجزاء کو اسی طرح بیان کیا گیا ہے جس طرح اسلام نے بیان کیا ہے۔ لیکن بیکن مستقلاً دو پہلوؤں (Bipolarity) کا قائل رہا۔ اس نے کبھی بھی کوشش نہیں کی کہ سائنسی یا مذہبی پہلو کی تشریح کرتے ہوئے ایک کو دوسرے پر قربان کر دے۔ اس نے ان کے درمیان توازن قائم کیا۔ بیکن کے ذہن کا یہ پہلو بہت سے انگریزوں کے نزدیک انگریزی سوچ کا مصدق ترین اظہار ہیں' بلکہ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزی فلسفہ بیکن کے اصول تفکر کی ترقی اور تشریح کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انگریزی فلسفے اور

سائنس پر اس کے واضح اثرات کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے:

بیکن سے ایک اور چیز بھی متعلق ہے جس کا تفصیلاً مطالعہ نہیں ہُوا ہے اور وہ چیز یہ ہے کہ انگریزی فلسفہ و سائنس کا یہ باوا آدم عربی زبان کا حقیقی طالب علم تھا۔ بیکن نے اسلامی مفکرین، خصوصاً ابن سینا کے اثرات کو قبول کیا تھا، بلکہ ارسطو کے بعد وہ ابن سینا کو سب سے بڑا فلسفی سمجھتا تھا۔ {۳} بیکن کی فکر اور اس کی فکر کے توسط سے درمیانے راستے کو اختیار کرنے کے عمل نے انگریزی فکر و عمل کو یورپی ہم عصروں سے بالکل نمایاں کردیا اور یہ اصول اس کی وضاحت کرتا ہے {۴}۔

اس سلسلے میں ابھی تک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے اور برطانوی ابھی تک اس فکری تسلسل کے وفادار ہیں جس کا ثبوت ایک اور عظیم انگریز شخصیت، برنارڈشا، سے ملتا ہے۔ شا بیک وقت ڈرامہ نگار، فلسفی اور سیاستدان تھا جو اشتراکی اور رومانوی خیالات کی بیک وقت تبلیغ کرتا تھا۔ کچھ لوگوں نے اسے "ناقابل تقلید مجموعہ تضادات" قرار دیا۔ وہ بیک وقت صوفی، نقاد، معاشرتی اصلاح کا درد رکھنے والا اور ناقابل علاج مثالیت پسند (Idealist) تھا۔

آیئے، اس مثال پر غور کریں۔ یورپ میں تجربے پر یقین رکھنے والے (Empiricist) بطور اصول ملحد ہوتے ہیں۔ برطانیہ میں تجربیت پسندوں کا سرخیل، جان

{۳} Bertrand Russel : History of Western Philosophy.

{۴} اس سلسلے میں برٹرینڈرسل کی وضاحت بھی بڑی دلچسپ ہے۔ رسل کے بیان کے مطابق انگریز تمام نظریات کو عمومی اصول بناکر پھیلا دیتے تھے۔ اور اس کے پس منظر میں خانہ جنگی میں ان کا منفی تجربہ تھا۔ خانہ جنگی میں بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان نزاع شروع ہوئی اور اس وقت سے ان لوگوں پر "مفاہمت" سے محبت اور کسی نظریے کو منطقی نتیجے تک پہنچانے کا خوف طاری ہوگیا اور یہ چیز اب تک موجود ہے۔

لاک خدا کے تصور کو اپنے اخلاقی نظریے کے مرکز میں جگہ دیتا تھا اور اخلاقی اصولوں کی برتری ثابت کرنے میں حیات بعد الموت کے معاملات جزا وسزا کی وکالت کسی پادری کی طرح شدت سے کرتا تھا۔ اگر انسان کی امید کو اس دنیا تک محدود کر دیا جائے، اگر زندگی کا لطف ہم صرف یہاں اٹھاسکیں تو یہ بات نہ عجیب ہونی چاہیے نہ غیر منطقی کہ مسرت کی تلاش کی جائے اور ہر اس چیز سے احتراز کیا جائے جو اس دنیا میں غیر مسرت بخش ہو اور ہر اس چیز کے پیچھے دوڑا جائے جو ہمیں مسرت عنایت کرے۔ اگر قبر کے پار کچھ بھی نہیں ہے تب تو یہ نتیجہ اخذ کرنا ہی پڑے گا۔

"آیئے کھائیں پیئں اور لذت بخش چیزوں سے سرور حاصل کریں کیونکہ کل تو ہم مرجائیں گے"۔ {۵}

(بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست)

علاوہ ازیں معروف تجربیت پسندوں نے خدا کے وجود کے لئے اپنے دلائل قائم کیے ہیں۔ {۶} انگریز اہل فکر کا یہ مثالی طریقہ ہے۔ یورپی اہل دانش نے بعد ازاں لاک کے نقطہ نظر کو ناقابل فہم قرار دیا۔ تاہم حقیقت تو یہی ہے کہ بیکن اور ہابس کے درمیان چلنے والی نزاعی بحثیں انگلستان کی علمی اور سماجی ترقی کا باعث بنیں۔ شافٹسبری کے نزدیک اخلاقیات خود غرضانہ اور غیر خودغرضانہ جذبات کے درمیان حالت عدل و توازن کا نام ہے۔ اس توازن میں خودغرضی کی بدولت عدم جھکاؤ کی طرف معروف "عوام الناس کا فلسفہ" اور فرد اور سوسائٹی کے ملا دینے کے لئے حل کا فارمولہ یہاں بیان کیا جاسکتا ہے۔

کیمبرج سکول کا ہدف مذہبیات کے لئے عقلی دلائل فراہم کرنا قرار دیا جاسکتا ہے۔ جودل کدورتھ کے بارے میں لکھتا ہے جو اس مکتب فکر کا ایک اہم شخص ہے۔ وہ کہتا

{۵} Essay on Human Understanding Book II Chapter 28.

{۶} Ibid Book IV Chapter 10, "our knowledge of God's existence"

ہے "فلسفہ اور مذہب کے درمیان قریبی تعلق نیز عقیدے اور توہم پرستی کے درمیان کیمبرج سکول کی اپچ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہ سمجھ پائے ہیں کہ کس طرح ایک فلسفی پہلے اخلاقیات کی عقلی ضرورت پر روشنی ڈالتا ہے اور بعد ازاں مذہبی پاکیزگی کا ذکر کرتا ہے۔ اس طرح یہ ایک ایسا فلسفہ ہے جو مذہبی ضروریات کی تشفی کرتا ہے اور جو عقل کو راہبر مان کر ایک گداز جذبہ پیدا کرتا ہے اس پر کیمبرج سکول کے تمام لوگوں نے اتفاق کیا (۷)۔

انگریزی ذہن نے افادی اخلاقیات کا تصور پیش کرکے اپنے آپ کو سب سے آگے لا کھڑا کیا ہے یہ۔ "Utilitarianism" کا نظریہ انگریزی ذہن کی تخلیق ہے۔ ادب میں اس کو افادیت کی انگریزی اخلاقیات قرار دیا جاتا ہے۔

"درمیانی راستے" کی سوچ پر یقین رکھنے والے لوگوں کے درمیان ایک ممتاز نام آدم سمتھ کا ہے۔ اس کے کام کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس نے دو کتابیں لکھیں جو بظاہر تو مختلف نظر آتی ہیں، لیکن عملاً یکساں ہیں۔

اس کی پہلی کتاب Theory of Moral Sentiments ہے جبکہ دوسری کتاب

An Inquiry into the nature and causes of the Wealth of Nations.

کو اٹھارویں صدی کی انتہائی پرتاثیر کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پہلی کتاب میں اخلاقیات نے اصول ہمدردی کو نقطہ آغاز قرار دیا اور دوسری کتاب نے سماجی اقتصادیات کو درج کرتے ہوئے خود پرستی کے اصول کو آگے بڑھایا۔ یہ چیز ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ یہ کتابیں اختلاف پر مبنی ہیں لیکن یہ بات درست نہیں، کیونکہ گلاسگو یونیورسٹی کے پروفیسر سمتھ کا خیال ہے کہ اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات فلسفے کے ایک مربوط نصاب

---

(۷) Fredrick Jodl : The History of Ethics P.145.

کے اجزاء ہیں۔ علاوہ ازیں سمتھ نے اپنی کتابوں میں اخلاقیات اور قوموں کی دولت کے درمیان رابطوں کی نشاندہی کی۔ اس کے نظریہ جذبات و اخلاق میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں :

"انانیت اور اخلاقی جذبات حقیقت ہیں۔ خدا نے کائنات کے بارے میں جو منصوبہ تیار کیا ہے اس میں ان دونوں چیزوں کا خیال رکھا گیا ہے انسان کا وجود ایک وحدت کا مظہر ہے اور اپنی معاشی زندگی میں وہ اس وحدت سے الگ نہیں ہو سکتا"۔

سمتھ کی رپورٹوں کا مطالعہ کیا جائے تو خاندانی اثرات کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اہل یورپ کا قرآن اور اسلام کے متعلق بھی یہی خیال ہے۔ سمتھ اور ہیوم نے پاپائیت اور مذہبی اجارہ داری سے بیزاری کا اعلان کیا ہے اور یہی رویئے ہمیں اسلام میں بھی غالب نظر آتے ہیں۔

اخلاق کا مثالی اطلاق سپنسر کی تعلیم پر ہو سکتا ہے۔ کسی مسلمان نے لکھا ہے کہ اس کی تعلیمات انگریزی اخلاق کا نمونہ ہیں کیونکہ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اخلاقی اصول فرد اور معاشرے کے درمیان ہم آہنگی کا نام ہیں اور ترقی کے دو رخ ہیں چاہے یہ برحق ہو یا نہ ہو۔ پہلا اصول ""انفرادیت" اور دوسرا اصول "انحصار باہمی" ہے۔

کیتھولک فرانس میں ابھی تک روحانی اور اثباتی سکول کی سنگدلانہ کشمکش جاری ہے۔ انگریزوں کی اخلاقیات میں سماجی فلاح کا اصول اور ضمیر کا اصول نمایاں ہیں۔ نیز فرد اور سماجی گروہ کے بارے میں مل کا اصرار ہے کہ انہیں یکجان ہونا چاہیے۔ نیز اس کا یہ خیال کہ دولت کی ایک اخلاقی حیثیت ہے اس سے قرآن کی بیان کردہ زکوۃ کی مشابہت ابھری ہے۔ اس موقع پر میں اس رجحان کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا جس کا نام جدید آئیڈیلزم ہے۔ برطانیہ میں اس تصور نے انیسویں صدی کے نصف میں مارٹن بریڈ لے گرین اور دوسروں کے خیالات سے پرورش پائی اور یہ انگریزی مثالی اخلاقی نمونے کے موافق ہے۔

اس موقعہ پر میں انگریزی سیاسی زندگی کے بارے میں ایک طویل اقتباس پیش کرنا چاہوں گا جسے کراس مین نے تحریر کیا ہے جو ہم عصر انگریز ہے اور اشتراکیت کی طرف رجحان رکھتا ہے۔ اس اعلان و اعتراف کے بعد کہ انگریزی سیاسی زندگی ایک پیچیدہ عمل کا نام ہے جس کو سمجھنا کافی مشکل ہے وہ لکھتا ہے۔

"افادیت پرست مفکرین کے برعکس دور وکٹوریہ کے تاجروں نے اپنی سیاست کی بنیادیں مذہب پر رکھیں۔ اس دور کے فرد نے نہ صرف اپنی زمین کی حفاظت کے لئے چند افراد کی حکومت کی مذمت کی' بلکہ اس لئے بھی مذمت کی کہ اس میں اخلاقی اصولوں سے صرف نظر کیا گیا تھا۔ وکٹوریہ کے عہد کے اہل دانش کی قوت مادی اقتصادیت سے صرف نظر کرکے مذہبی مناقشات کی طرف راغب ہوئی"۔

مارکس کی کتاب "سرمایہ" نے نہیں' بلکہ ڈارون کی کتاب The Origin of Species (ابتدائے حیات) نے برطانیہ کے درمیانے طبقے کی زندگی میں ہلچل مچائی۔ آکسفورڈ کی تحریک اور رسوم کی بحث نے اس معاشرے کے قابل ترین ذہنوں کو شامل کرلیا۔ گلیڈسٹون کا ایمانداری سے خیال تھا کہ احکامات قبول کرنے سے بہتر یہ ہے کہ سیاست کرلی جائے۔ انیسویں صدی کے انگلستان کی عظیم الشان اخلاقی پائیداری اور خود اعتمادی کی وجہ اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب ہم مذہبی عقیدے کو صحیح جگہ پر رکھ کر دیکھیں۔ غلامی کا خاتمہ' صلیبی مشنری روح کا از سرنو احیاء' بچوں کے مشقت کرنے پر اعتراضات' عوام الناس کے لئے تعلیم کا عام ہونا اور دیگر بہت سی تحریکیں سیاسی عقیدے کی وجہ سے نہیں اٹھیں' بلکہ اس کے پیچھے معاشرے کا مسیحی شعور کارفرما تھا۔ انیسویں صدی کی عظیم اصلاحی تحریکیں برطانیہ میں اسی چشمے سے سیراب ہوئیں اور سیاستدانوں کے پروگراموں کا حصہ بھی اسی صورت میں بنی رہیں کہ وہ عوام الناس کے ذہنوں میں پہلے سے راسخ ہوچکی تھیں۔ مذہبی عقائد کی اس ٹھوس بنیاد کے سبب برطانوی سیاسی

خیالات اور سماجی اصلاحات کا اعلیٰ نمونہ منظر پر آیا {۸}۔

ایک اور مقام پر کراس مین لکھتا ہے :

"برطانوی جمہوریت' مذہبی آزادی کی جدوجہد کے ساتھ متعلق تھی۔ مذہبی جذبہ اپنی ابتدائی مسیحی شکل میں اس لئے ابھارا گیا تھا تاکہ جمہوریت کو آگے بڑھایا جاسکے۔ چنانچہ وسیع المشربی کی تحریک کی کامیابی عہد وکٹوریہ میں مذہبی احیاء کی شکل اختیار کر گئی۔ برطانیہ کے علاوہ یہ نقطہ نظر امریکہ میں بھی ابھرا اور یہ چیز امریکہ کے سوا کہیں اور ممکن بھی نہ تھی۔ چونکہ افراد' ترقی اور جمہوریت جیسے موضوعات اطالوی وسیع المشربوں کے نزدیک اشتراکی کوچہ گردوں کے لئے خاص تھے۔ مخلص کیتھولک افراد کا خیال تھا کہ مسیح پر ایمان اور ترقی پر ایمان کے درمیان جو خلیج پیدا ہوئی اس کو پاٹنے کے لئے کوئی پل تعمیر ہو ہی نہیں سکتا اور وسیع المشرب حضرات یقین رکھتے تھے کہ کلیسائی غلبے کے ساتھ جمہوریت اور آزادی کا تال میل ہو ہی نہیں سکتا"۔ {۹}

انگریزوں کی اشتراکیت بھی ایک خاص قسم کی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ اشتراکیت مادہ پرستانہ اور ملحدانہ فلسفے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے لیکن انگلستان میں لیبر مقررین کے پلیٹ فارم سے آپ کو انجیل مقدس کے اتنے حوالے اور اقتباسات سننے کو ملیں گے جتنے کہ کسی گرجا گھر میں سنے جاسکتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار ایک فرانسیسی نامہ نگار نے کیا ہے۔

{۸} Crossman: The Government and the Governed (New York : Pica Press 1969). pp. 155-158.

{۹} Crossman: The Government and the Governed (New York : Pica Press 1969). pp. 155-158.

بغیر کسی شک و شبہ کے دو انتہاؤں کو اکٹھا کرنے کی ایک منضبط کوشش برٹرینڈ رسل نے کی جس نے کہا :

"ایک اطمینان بخش اور پائیدار سماجی انتظام کے مسئلے کا یہ حل نکالا جاسکتا ہے کہ رومی سلطنت کے اصولوں اور سینٹ آگسٹین کے تصور "خدا کا شہر" کو ملا دیا جائے"۔

اس سوال پر بحث کرتے ہوئے کہ جہان کی تخلیق نو میں خیالات مرکزی کردار ادا کرتے ہیں یا اس کے برعکس بات ہے وہ کہتا ہے :

"میرے نزدیک سچائی ان دو انتہاؤں کے درمیان موجود ہے۔ خیالات اور عملی زندگی کے درمیان ایک باہمی تعامل ہے" {۱۰}۔

یہ خالصتاً اینگلو سیکسن فلسفہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ غیر یورپی بھی ہے۔ اس فلسفے کی وضاحت ولیم جیمز نے اپنی کتاب Pragmatism میں کی ہے۔ ہم اس کی کتاب میں سے چند اقتباسات پیش کرنا چاہیں گے۔

"ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں جو اچھی چیزوں کو لکیر کے دونوں طرف تلاش کرتے ہیں۔ حقائق اچھے ہوتے ہیں ہمیں بہت سارے حقائق دے دیں۔ اصول اچھے ہوتے ہیں ہمیں ڈھیر سارے حقوق دے دیں۔ ایک لحاظ سے تمام کائنات ایک یونٹ نظر آتی ہے' تاہم ایک اور لحاظ سے یہ کثرت بھی ہے۔ لیکن ایک ہی وقت میں وحدت بھی ہے اور کثرت بھی ہے۔ یقیناً ہر چیز کا راستہ طے ہے لیکن ہماری مرضی آزاد ہے۔ آزاد مرضی کا فلسفہ یقیناً بہت سودمند رہے گا۔ افراد کی انفرادی خامیوں کا انکار نہیں کیا جاسکتا' لیکن تمام کے تمام انسان گنہگار نہیں ہو سکتے اور اس طرح عملی قنوطیت کو

{۱۰} Bertrand Russel: History of Western Philosophy.

مابعد الطبیعیاتی آس کے ساتھ نہیں جوڑا جاسکتا {۱۱}۔

جیمز نے یہاں انسانی فطرت کے رجحان کی تنویت کی طرف اشارہ کیا ہے جو ایک طرح سے اسلام کی شکل ہے۔ اس نے اپنے فلسفے کو "سوچنے کے چند پرانے طریقوں کا نیا نام" قرار دیا۔ {۱۲}

جیمز کہتا ہے :

"جب آپ کسی مشکل میں گرفتار ہوتے ہیں تو فلسفہ آپ کے لئے کیا کرتا ہے۔ آپ کو مقتدرانہ فلسفہ ملتا ہے جو مذہبی نہیں ہوتا اور مذہبی فلسفہ اس قدر مقتدر نہیں ہوتا کہ آپ کی ضرورت کو پورا کر سکے"۔ {۱۳}

آگے جاکر وہ لکھتا ہے :

"آپ لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ آپ کو دو نظام ملتے ہیں۔ جن کو آپ الگ الگ پاتے ہیں۔ آپ کو تجربیت سے واسطہ پڑتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ غیر انسانیت اور غیر تجربیت بھی آڑے آتی ہیں۔ یا آپ منطقی فلسفے سے آگاہ ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو مذہبی بھی کہلاتا ہے لیکن یہ اپنا تعلق حقائق، خوشیوں اور غموں سے جوڑنے میں ناکام رہتا ہے"۔ {۱۴}

برٹرینڈ رسل نے دو فلسفیانہ افکار کی اسی طرح وضاحت کی۔ ولیم جیمز کی فلسفیانہ بحث کی دو جہتیں تھیں، سائنسی اور مذہبی۔ سائنس کے معاملے میں علم الطب کے مطالعے نے اس کی سوچ کو مادہ پرستانہ رخ عطا کیا۔ لیکن اس کے مذہبی مطالعے نے اس کی سائنسی سوچ کو ایک حد تک رکھا۔ {۱۵} یاد رہے کہ برطانوی فکر کی طرح امریکی فکر

{۱۱} William James : Pragmatism

(Cambridge : Harvard University Press 1978).

{۱۲} {۱۳} {۱۴} {۱۵} " DO "

بھی انہیں دو تمہیدی افکار کے گرد گھومتی رہی جن کو سات سو سال پہلے راجر بیکن نے پیش کیا تھا۔ اس دورانیے میں یورپ ایک نیم دائرے سے گزر چکا ہے جس کا ایک سرا سینٹ تھامس آکیناس سے شروع ہوتا ہے اور اس کا آخری سرا لینن ہے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ عقائد کو فطری انداز میں پیش کرنے سے اہل یورپ پر کیا اثرات مرتب ہوئے لیکن اس سے ایک طرح کا انحراف شروع ہو گیا۔ اہل یورپ کے نقطہ نظر سے یہ عمل غیر فطری اور غیر مسلسل ہے اور اس کے کئی پہلو ہیں۔ یہ وہی خصوصیات ہیں جو اہل یورپ اسلام کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ لیکن عقائد کو فلسفیانے کا عمل امریکی فلسفہ میں پہلی کوشش ہے اس سے پہلے امریکہ اس کا اہل نہیں تھا۔

انگریزی اور اسلامی ذہنوں کے درمیان یہ متوازیت اس چیز کا مطالبہ کرتی ہے کہ ان کے ساتھ الگ الگ معاملہ کیا جائے۔ ۱۶۸۸ء کا انقلاب بہت زیادہ تبدیلیوں کا باعث بن سکتا تھا۔ برٹرینڈرسل کی رائے میں ۱۶۸۸ء کا انقلاب تمام انقلابوں کی نسبت زیادہ کامیاب اور جدیدیت کا حامل تھا۔ برطانیہ کی سیاسی تاریخ میں بہت سے ایسے واقعات اور تحریکیں ملتی ہیں جو اپنے منطقی انجام کو نہ پہنچ سکیں' بلکہ راستے ہی میں منجمد ہو گئیں۔ برطانیہ میں شہنشاہیت کے خلاف جب بھی بغاوت ہوئی ہے تو وہ شہنشاہیت کو ختم کرنے میں ناکام رہی ہے اور جمہوری اداروں کے ساتھ ساتھ نظام شاہی بھی کسی نہ کسی طرح چلتا ہی رہا ہے۔ برطانیہ میں "Minister" کا لفظ سیاسی اور مذہبی دونوں معنوں میں سرکاری افسر اور مذہبی راہنما دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اسلامی اصطلاحات کا مطالعہ کرتے وقت بھی یہی محسوس ہوتا ہے۔ بہت سی یورپی ریاستوں کے برعکس برطانیہ نے غریبوں کی امداد کے لئے ایک قسم کا ٹیکس متعارف کرایا جس سے اسلام کے اصول زکوۃ کی یاد آتی ہے۔ عملی مسائل کا سامنا کرتے ہوئے ایسے ہی حل بہترین ہوتے ہیں۔

مستقبل میں یہ امید کی جاتی ہے کہ یورپ سائنس کے تمام فیصلے تسلیم کرلے گا بشمول تمام غیر انسانی نتائج کے' لیکن امریکہ اور برطانیہ نصف نتائج کو قبول کریں گے

کیونکہ یورپ میں مذہب ہے اور سائنس سائنس ہے' جبکہ برطانیہ میں سب سے بڑا منصف تجربہ یعنی زندگی ہے۔

❑ "تاریخی مفاہمت" اور "سماجی جمہوریت" :

دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی "تیسرے راستے" کے بارے میں رجحان پایا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کی نوعیت برطانیہ سے مختلف ہے اور برطانیہ میں بھی یہ صرف سوچ' فکر اور نظریے کی شکل میں موجود ہے۔ جب کہ یورپ میں یہ چیزیں عملی ضرورت کے طور پر موجود ہیں۔ نظریے اور عقیدے کے طور پر موجود نہیں ہیں۔ کیتھولک اور پراٹسٹنٹ ممالک میں اس کا ظہور مختلف شکلوں میں ہوا ہے۔ جن ممالک میں کیتھولک اثر زیادہ رہا ہے وہاں نظریاتی تقسیم زیادہ واضح رہی ہے۔ یہاں درمیانے راستے کی تحریک ٹھوس' ڈرامائی اور غیر یقینی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ ممالک تیسرے راستے کے اہل نہیں رہے ہیں۔ اٹلی' فرانس' ہسپانیہ اور پرتگال منقسم معاشروں کی مثال رہے ہیں اور اب بھی منقسم ہیں۔ عوامی رائے مسیحی (دائیں بازرو والے) اور مارکسی (بائیں بازو والے) جماعتوں اور تحریکوں میں تقسیم رہی ہے۔ عوامی رائے کسی ایک نکتے پر متفق نہیں ہے' مرکز سے ہٹی ہوئی ہے یا تباہ ہو چکی ہے۔ کیتھولک ازم اور کمیونزم تاریخ کے دو مشہور نظریات رہے ہیں اور یہ دونوں نظریات طویل عرصے تک ایک دوسرے سے ٹکراتے ٹکراتے تھک کر بیٹھ چکے ہیں اور اس لڑائی میں فاتح کوئی بھی نہیں ہے۔ خانہ جنگی شروع ہونے سے قبل ہسپانیہ کو ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں ہسپانیہ کی (بائیں بازو کی) جماعتوں نے ۹۰ء۵۱ فیصد اور (دائیں بازو کی) جماعتوں نے ۲۴ء۴۳ فیصد ووٹ حاصل کئے' جبکہ اعتدال پسندوں نے کل دونوں کا ۸۶ء۴ فیصد حاصل کیا۔ دونوں کے تناسب کے حساب سے اٹلی کی صورت حال بھی یہی ہے۔ یہی معاملہ

فرانس کا بھی ہے۔

ان دو نظریات کی عدم مطابقت کے کئی آثار نمایاں ہیں۔ مثال کے طور پر ۶۰ء کے عشرے میں مارکسیوں اور کیتھولک نظریات کے حامل لوگوں کے درمیان بہت سی لاحاصل بحثیں ہوئیں۔ مارکسیت اور مذہب کی لڑائی جو ایک سو سال تک جاری رہی یورپ کی مخصوص ذہنی حالت کی غمازی کرتی ہے۔ ان سالوں کی لڑائی میں نہ تو وقفہ ہوا نہ اتفاق ہی ہو سکا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر زندگی کو کسی ایک ہی اصول پر چلایا جائے تو یہ ناکامی کا سبب بنتا ہے۔ مارکسیت کا نظریہ ہے "مذہب عوام کی افیون ہے"۔ مارکسی پیروکاروں سے کہا گیا کہ اس نظریے کو ختم کردیں، جبکہ کیتھولک حضرات نے تسلیم کرلیا کہ مارکسیت پر اثر سماجی نظام بنتا جا رہا ہے۔

انہی مباحثات و مناظرات کے زمانے میں ایک بحث کا پالوس گیزلشافٹ سوسائٹی نے انتظام کیا اور انہی اجلاسوں میں ایک مضمون پڑھا گیا جس کا عنوان تھا "مسیحیت میں انسانیت کی محبت اور مارکسیت کی انسان دوستی"۔ سالٹز برگ کے اجلاس میں معروف مارکسی مصنف راجر گراڈی (اب اسلام قبول کرچکے ہیں) نے کہا "تاریخ میں پہلی مرتبہ عیسائیت نے سرحدوں سے آزاد انسانیت کا تصور پیش کیا"۔

پالمیرو تو گیلاتی جو اطالوی کیمونسٹ پارٹی کا رہنما ہے اس نے مارکسیت پر زور دیا کہ وہ مذہب کے متعلق اپنے نقطہ نظر میں تبدیلی کرے اور مارکسیوں پر زور دیا کہ جس قدر جلد ممکن ہوسکے اس تبدیلی کو ممکن بنادیں۔ پوپ کے خطوط میں تسلیم کیا گیا کہ سماجی ملکیت کی نسبت ذاتی ملکیت کا تناسب زیادہ پرانا ہے۔ عوامی حکومت کو حق حاصل ہے کہ معیشت کے معاملات میں دخل اندازی کرے۔ زرعی اصلاحات اور قومیائے جانے کے عمل سے معاشرے کو فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے۔ نیز صنعتوں کی انتظامیہ میں کارکنوں کی شرکت سے فوائد حاصل کیے جاسکتے ہیں وغیرہ وغیرہ [۱۶]۔

بائیسویں کلیسا کونسل (دوسری ویٹی کن کونسل) میں روایت پسندوں کے اس طریقے

کو ختم کردیا گیا جس میں مارکسیت پر تنقید کی جاتی تھی۔ متعلقہ رپورٹوں کا جائزہ لینے کے بعد اس کونسل نے تسلیم کیا کہ غیر معمولی مسیحی روحانی صورت ناقابل فہم ہے۔ کارڈن شارڈن نے کہا۔ "میرے خیال میں دنیا مسیحیت کو اسی وقت تسلیم کرے گی جب وہ دنیا کی امیدوں پر پورا اترے گی۔ لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ مسیحیت کو الہامی بنائے رکھا جائے۔ کیا اس طریقے سے مسیحیت کو اسلام کے رنگ میں رنگا نہیں جارہا"؟

فرانس میں ہونے والی جدید تبدیلیوں سے کچھ رجحانات کا پتہ چلا ہے جو باہم مربوط ہیں۔ بہت پرانی بات نہیں ہے '۱۹۷۷ء میں فرانسیسی مرکزی کلیسا نے مسیحی عقائد' انسان اور مارکسزم کے نام سے ایک خصوصی رسالہ جاری کیا۔ اس میں فرانسیسی بشپوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ وسیع المشربی کی سماجی سیاست ناکام ہو چکی ہے اور تسلیم کیا کہ "مارکسزم میں ایک ایسا سچ شامل ہے جس کو ہم نظرانداز نہیں کرسکتے"۔ ایک سال قبل فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کے سربراہ جارج مارکسیں نے اعلان کیا

> "ہمارا مقصد یہ ہے کہ کمیونسٹوں اور مسیحیوں کو ایک دوسرے کو تسلیم کرنا سکھا دیں اور وہ اپنی اصل کے سچے راستے پر چل سکیں اور ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے ایک زیادہ بہتر انسانی معاشرہ قائم کرسکیں"۔

اٹلی کے عمل کو سامنے رکھتے ہوئے زیر بحث سوال کو اور بہتر انداز میں سمجھا جاسکتا ہے۔ ناقابل صلح اختلافات اور کشمکش کے بعد اطالوی کمیونسٹ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک منطقی لیکن غیر متوقع قدم اٹھائے اور "ایک تاریخی معاہدہ" کرے۔ اگر ہماری معروضات درست ہیں تب یہ اپیل معمولی مقاصد کے ساتھ چلنے والی تحریک نہ رہے گی

{۱۶} پوپ پال دوم نے ۱۹۷۹ء میں اپنے دورہ امریکہ کے موقع پر کہا "انسان کے حقوق کو خطرہ مادی اشیاء کی تقسیم سے جڑا ہوا ہے۔ مسیحیت سے آگاہ کوئی شخص اس بیان کے مضمرات سے ناآشنا نہیں رہ سکتا"۔

بلکہ یہ ایک سنجیدہ کوشش شمار ہوگی جو ایک بہتر راستے کی تلاش کے لئے کی گئی۔ اس اپیل میں صرف مسیحیوں کو مخاطب کیا گیا کسی اور سے اس میں خطاب نہ کیا گیا۔ جب دلائل اور بیانات مکمل ہوئے، دیگر گروہ بتدریج غائب ہوتے چلے گئے اور منظر پر صرف دو قوتیں باقی رہ گئیں۔ یہ قوتیں مسیحی جمہوریت اور کیمونزم یا دوسرے الفاظ میں مذہب اور مادیت تھیں۔ اٹلی میں ہونے والا یہ تجربہ تمام دنیا کے لئے ایک اچھی مثال ہے {۱۷}۔

اٹلی فرانس اور ہسپانیہ کو ان ممالک کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جنھوں نے "یورپی کیمونزم" کا نمونہ پیش کیا۔ یہ بات ہے تو نئی لیکن یہ بھی واضح ہے کہ اس سے مراد کیمونزم منفی آمریت منفی جمہوریت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رجحان انتہائی بائیں جانب سے مرکز کی طرف کا سفر ہے۔ {۱۸} حقائق کے دباؤ کی بدولت کیمونزم نے اپنی قدیم شکل سے ہٹ کر آزادی اور اجتماعیت کے مثبت خیالات کو قبول کرلیا ہے اس طرح یورپی کیمونزم مفاہمت کی ایک مثال بن گیا ہے۔

"یورپی کیمونزم" اور "تاریخی مفاہمت" میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں ہم کو ترمیم شدہ کیمونزم سے واسطہ پیش آتا ہے اور دوسری صورت میں کیمونزم اور مسیحیت دو برابر کی قوتوں کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ {۱۹}

دیگر ممالک خصوصاً پروٹسٹنٹ ممالک میں "درمیانے راستے" کی طرف رجحان کا

{۱۷} اطالوی کیمونسٹ پارٹی میں ہمیں ایک عجیب بات نظر آتی ہے۔ ان کے منشور میں لکھا ہوا ہے "پارٹی کے ممبران وہ تمام لوگ ہوسکتے ہیں جو پارٹی پروگرام کو قبول کریں چاہے وہ کسی بھی مذہب یا فلسفے کو ماننے والے ہوں"۔

{۱۸} یہی مفہوم چین کے "ثقافتی انقلاب" کے راستے کو چھوڑنے سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔

{۱۹} یورپ کی تمام کیمونسٹ جماعتوں نے اپنے منشوروں میں سے "پرولتاری آمریت" کے الفاظ مٹا دیئے ہیں۔

اندازہ اعتدال پسند جماعتوں کے سیاسی زندگی میں بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے چلتا ہے۔ یہ ممالک خالص مسیحیت اور خالص کیمونسٹ حکومتوں کو رد کرچکے ہیں اور درمیانی راستوں کی طرف رجوع کرنے کا ان میں مستقل رجحان ہے۔ اس طرز عمل کا اندازہ سماجی جمہوریت کی پکار سے لگایا جاسکتا ہے۔ پروٹسٹنٹ ممالک نے سماجی جمہوریت میں وہ حل تلاش کرلیا ہے جو کیتھولک ممالک "تاریخی مفاہمت" میں تلاش کرتے رہے ہیں۔ "سماجی جمہوریت" کا یورپ میں مفہوم یہ ہے کہ یہ وسیع المشربی اور سماجی مداخلت کے درمیان مفاہمت نیز یورپی مسیحی روایت اور مارکسیت کے درمیان مفاہمت کا نام ہے۔ جنگ عظیم دوم کے بعد یہ خیال بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔ {۲۰}جنگ عظیم دوم کے بعد پچیس اور تیس روز کے اندر اندر ہی جن ممالک میں آزادانہ انتخابات ہوئے وہاں سماجی جمہوریت کے ووٹوں میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ سماجی جمہوریت کے حق میں سویڈن میں ۲۲ فیصد' ڈنمارک میں ۳۹ فیصد' ہالینڈ میں ۵۴ فیصد' ناروے میں ۲۷ فیصد' جرمنی میں تقریباً ۱۰۰ فیصد اور مالٹا میں ۴۸ء۳۴ فیصد اضافہ ہوا۔ برطانیہ میں یہ اضافہ صرف ۵ فیصد ہے، لیکن ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ برطانیہ میں یہ سلسلہ بہت پہلے شروع ہوا تھا۔ نیز برطانیہ کسی بھی دوسرے ملک کی نسبت اس حالت عدل تک پہنچ چکا تھا۔ سماجی جمہوریت یورپ میں سماجی اور سیاسی عدل کی شکل میں موجود رہی۔

میکسیکو اور وینزویلا دونوں ممالک جمہوریت کے تصور کے بہت قریب رہے ہیں نیز یہ دونوں ممالک جنوبی امریکہ کے غیر مستحکم علاقے میں مستحکم اور پائیدار ممالک کی مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جاپان میں ہونے والی تبدیلیاں اس چیز کی غمازی کرتی ہیں

{۲۰} ماسکو سے شائع ہونے والا رسالہ "The Communist" اپنی جولائی ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ "تیسرا راستہ ممکن ہی نہیں"۔ اور دنیا کے تمام ممالک سرمایہ دارانہ نظام یا اشتراکی نظام سے منسلک ہوکر رہیں گے۔

کہ جاپان نے انتہا پسندوں کی جگہ درمیانے راستے پر چلنے والوں کو آگے بڑھایا ہے۔ میکسیکو اور جاپان میں ہونے والی براہ راست بحثوں میں "درمیانے راستے" کی اصطلاح بار بار سنی گئی ہے۔ کاراکاس میں ۱۹۷۶ء میں سماجی جمہوریت پسندوں کے اجلاس کو "تاریخی" اسی لئے قرار دیا گیا تھا کیونکہ اس کے فیصلے بہت جاندار تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک نئے نظریے کی تلاش کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔ میکسیکو کے نمائندے گونزالیز ساس نے واضح کردیا تھا کہ اس نئے نظریے کی ہیئت کیا ہوگی۔ موجودہ سیاسی دنیا میں تین واضح اور بڑے راستے ہیں۔ سرمایہ داری' کمیونزم اور سماجی جمہوریت اور میکسیکو کو انہی تین میں سے کسی ایک انتخاب کا کرنا ہے۔

اشتراکی ممالک میں جو اندرونی خلفشار موجود ہے اس کی بنیادی وجہ یہ نہیں ہے کہ اشتراکیت ایک اقتصادی مسئلہ ہے۔ مخالفت کی سب سے بڑی وجہ انسانی حقوق کا مسئلہ ہے۔ ہر جگہ محسوس ہوتا ہے کہ لوگ مسیحیت کے ساتھ ساتھ ایسے سماجی پروگرام یا ایسی اشتراکیت کی تلاش میں ہیں جس میں الحاد یا آمریت نہ ہو۔ یعنی ایسی اشتراکیت جو خدا شناس ہو۔ مثال کے طور پر چین میں ماؤزے تنگ کی وفات کے بعد بیتھوون اور شیکسپیئر کی تصانیف پر سے احتیاط اور تدریج کے ساتھ پابندی اٹھالی گئی۔ اسی طرح روس میں داستووسکی' چھاگل اور کافکا کی کتابوں پر سے پابندی ہٹالی گئی تھی۔ اب آزادی کے لئے مطالبات کی آواز جلد ہی مشرقی یورپ کے ممالک سے سنائی دے گی۔ اگرچہ رفتار کچھ مدہم محسوس ہوتی ہے' تاہم حالات اسی سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں اور یہ رجحان شدت سے ظاہر ہو رہا ہے {۲۱}۔

سرمایہ دارانہ ممالک میں جو انتشار اور خلفشار ہے اس کے ساتھ ساتھ سماجی مداخلت کی ضرورت بھی شدید ہوتی جارہی ہے اور عموماً اس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ لامحدود آزادی پر قدغن لگائی جائے۔ عملی وجوہات کے سبب امریکی صنعتیں اور ادارے شراکت کی طرف بڑھ رہے ہیں جبکہ روس کی معاشی صنعتیں غیر محدود مرکزیت سے ہٹ رہی

ہیں۔{۲۲} پروفیسر وائڈن بام ہمعصر امریکی کارپوریشنوں کو "نصف قومیائی گئی" قرار دیتا ہے' کیونکہ اس کے ذہن کے مطابق ان صنعتوں کا ریاست پر انحصار موجود ہے۔ امریکہ یورپ اور جاپان کے نمایاں سیاسی اور عوامی کارکنوں کا اجلاس کیوٹو میں ۱۹۷۵ء میں ہوا اور اس میں اعلیٰ ترین سرمایہ دار ممالک میں "بڑھتی ہوئی جمہوریت" کے مسئلے پر غور کیا گیا۔ اس اجلاس میں جو رپورٹ تیار کی گئی اس کو "جمہوریت کا مسئلہ" قرار دیا گیا اور اس میں "تبدیلی قبول کرنے والی جمہوریت" کی وکالت کی گئی تھی اور اس میں اشارہ کیا گیا تھا کہ ذرائع ابلاغ اور اخبارات کو جو غیر معمولی چھوٹ اور آزادی دی گئی ہے اس پر کچھ پابندیاں عائد کیے جانے کی ضرورت ہے۔ اس رپورٹ میں معاشی منصوبہ بندی اور مستعد انتظامیہ کے تصورات کی حمایت کی گئی تھی۔ عوامی منصوبہ بندی کے لئے شاید یہ ایک مکمل پروگرام نہ ہو' لیکن اس سے نئی نظریاتی جہتوں کا پتہ چلتا ہے۔

یہ تمام اظہار اور عمل اشاراتی ہے نہ یہ اسلام ہے اور نہ اسلام کی طرف لے کر جاتا ہے کیونکہ یہ اظہار غیر مسلسل اور ناقص ہے۔ اسلام یک طرفہ مذہبی یا سماجی زندگی کو شعوری طور پر رد کرتا ہے اور یہ "ثنویت کے اصول" کو شعوری طور پر قبول کرلیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود موجودہ احتیاطیں' انحراف' تذبذب اور مفاہمت ظاہر کرتی ہے کہ زندگی اور انسانی حقیقت یک طرفہ اور انتہا پسند نظریات سے جنگ جیت چکی ہے اور یہ اسلامی تصورات کی بلاواسطہ کامیابی ہے۔

{۲۱} آج کے حالات علی عزت بیگ کی مستقبل بینی کی شہادت دے رہے ہیں۔ مشرقی یورپ نے اشتراکیت سے اجتناب کرلیا ہے (مترجم)۔

{۲۲} ۱۹۹۳ء میں اشتراکیت زوال پذیر ہوچکی ہے۔ روس پندرہ آزاد ریاستوں میں بٹ چکا ہے۔ (ادارہ)۔

خدا کے آگے جھک جائیے

فطرت کا راستہ طے شدہ ہے جبکہ انسان اپنی منزل کا تعین خود کرتا ہے۔ اس تقدیر کو قبول کرلینا ہی اسلام کا اعلیٰ ترین اور بہترین تصور ہے۔

تقدیر کیا ہے؟ کیا اس کا وجود ہے؟ یہ کیا شکل اختیار کرتی ہے۔ آیئے اپنی زندگیوں کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ہمارے جوانی کے منصوبے اور سنہرے خوابوں نے کیا شکل اختیار کی ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب اپنے وجود کے ساتھ ہم اس دنیا میں آتے ہیں تو اعلیٰ ذہانت یا عمومی ذہانت ہمیں ملتی ہے۔ خوش نما یا بدنما خدوخال اور نقوش ہوتے ہیں۔ ہم یا تو بہت مضبوط قد کاٹھ کے حامل ہوتے ہیں یا چھوٹا سا جسم مل جاتا ہے۔ کبھی کسی بادشاہ کے گھر میں پیدا ہونا لکھا جاتا ہے کبھی کسی فقیر کی جھونپڑی ہمارا مولد بنتی ہے۔ کسی کو تلاطم خیز زمانہ ملتا ہے اور کسی کو پرسکون دور میسر آجاتا ہے۔ کسی کو ظالم بادشاہ اور آمر کا دور ملتا ہے اور کوئی کسی شریف حکمران شہزادے کے دور حکومت میں زندگی بسر کرتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ ہمیں ایسے جغرافیائی اور تاریخی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جن کے بارے میں ہم سے کبھی بھی رائے نہیں لی گئی ہوتی۔ وہ چیز جسے ہم اپنا ارادہ کہتے ہیں کس قدر محدود ہے اور جس چیز کا نام تقدیر ہے وہ کس قدر

لامحدود اور وسیع ہے۔

انسان کو اس دنیا کے حوالے کردیا گیا ہے اور اسے بہت سی ایسی چیزوں کا محتاج بنادیا گیا ہے جن پر اس کا زور نہیں چلتا۔ اس کی زندگی پر بہت سے قریبی اور بہت سے بعیدی عوامل اپنا اثر مرتب کررہے ہوتے ہیں۔ ۱۹۴۴ء میں جب اتحادیوں نے یورپ پر یورش کی تو اس دوران میں ریڈیائی اطلاعات کی ترسیل میں تعطل پیدا ہونے لگا اور جاری آپریشنز کے لئے یہ چیز بہت نقصان دہ ثابت ہوسکتی تھی۔ کئی سالوں کے بعد اس رکاوٹ اور تعطل کی یہ وضاحت کی گئی کہ اینڈرومیڈا جھرمٹ نجوم (Galaxy) میں ایک بہت بڑا دھماکا ہوا تھا' جبکہ اس جھرمٹ کا ہماری زمین سے فاصلہ لاکھوں نوری سال ہے۔ اسی طرح زمین پر آنے والے زلزلوں کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ سورج کی سطح پر کچھ تبدیلیاں واقع ہونے لگتی ہیں۔ دنیا کے بارے میں جس طرح ہمارا علم بڑھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بڑھتا چلا جارہا ہے کہ ہم اپنی قسمت کے مکمل مختار کبھی بھی نہیں ہوسکتے۔ حتیٰ کہ اگر ہم سائنس کی سب سے عظیم اور سب سے بڑی ایجاد اور ترقی کو بھی سامنے لے آئیں تب بھی ہمارے تابع اور ہماری مٹھی میں آنے والے حقائق کی تعداد ان حقائق کی نسبت کم ہوگی۔ جن کا ہمیں علم نہ ہوگا۔ انسان دنیا کے تناسب میں پیدا ہی نہیں کیا گیا۔ انسان اور انسانی عمر مختلف اشیاء کو ناپنے والے یونٹ نہیں ہیں۔ انسان کے دائمی اور ابدی طور پر غیر محفوظ ہونے کی یہی وجہ ہے اور نفسیاتی طور پر اس کا اظہار قنوطیت' یاسیت' ناامیدی' نفرت یا خدا کی رضا کے آگے جھکنے سے ہوجاتا ہے۔

اسلام دنیا کی تربیت کی بنیاد نشوونما' تعلیم اور قوانین پر رکھتا ہے۔ یہ اس کا محدود پہلو ہے۔ خدا کے آگے جھک جانا اور خدا کی رضا اس کا وسیع تر پہلو ہے۔

حاضر حالات کی شرائط کے ساتھ انفرادی انصاف کا حق ادا نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اسلامی قوانین کا اتباع کرسکتے ہیں اور اس کے نتیجے کے طور پر ہمیں "دونوں جہانوں میں مسرت" ملنا چاہیے۔ ہم دیگر طبی' سماجی اور اخلاقی اصول وغیرہ اپنا سکتے ہیں کیونکہ ہماری

منزلوں' خواہشوں اور حادثات کی نوعیت الگ الگ ہوتی ہے اور اس طرح ہمیں ذہن اور جسم کے نقصان برداشت کرنا پڑتے ہیں۔ اس ماں کو کون تسلی دے سکتا ہے جو اپنے واحد بیٹے کو گم کر بیٹھی ہو؟ کیا اس شخص کے لئے کوئی مرہم ہے جو کسی حادثے میں مکمل طور پر معذور ہو چکا ہو؟

ہمیں اپنی انسانی حالت کا شعور ہونا چاہیے لیکن ہم تو اپنی حالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ میں اپنی حالت کو تبدیل کرنے کے لئے کام کر سکتا ہوں' لیکن بہت سے ایسے حالات ہوتے ہیں جن کو تبدیل کرنے کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے اور ان حالات کی شکل بدلتی رہتی ہے اور جب فتح کا نشہ دھندلا جاتا ہے تو انسان خیال کرتا ہے کہ مجھے مرجانا چاہیے' مجھے جنگ کرنا چاہیے' میں حالات کا شکار ہوگیا ہوں' میں جرم کی دلدل میں پھنستا چلا جارہا ہوں۔ ہمارے وجود کی ان حالتوں کو "علامتی حالات" کا نام دیا جاتا ہے {۱}۔

یقیناً انسان اس چیز کو بہتر بنا سکتا ہے' جس میں بہتر بننے کی صلاحیت ہو۔ بصورت دیگر کسی قسم کی بہتری لانا ہمارے امکان میں نہیں ہے۔ چنانچہ انتہائی ترقی یافتہ معاشروں میں بھی ظالمانہ قوانین کا شکار ہو کر مرنے والے بچوں کی تعداد میں کمی ہوتی نظر نہیں آتی۔ انسان اپنے طور پر تو یہ کوشش کر سکتا ہے کہ وہ ریاضی کے اعداد و شمار کی طرح اس دنیا کے مصائب کو جس حد تک گھٹا سکتا ہو گھٹا دے۔ اس کے باوجود عدم انصاف اور دکھ موجود رہیں گے۔ اور ان کی تعداد کتنی ہی محدود کیوں نہ ہو جائے وہ "ناپسندیدہ" ہی رہیں گے {۲}۔ اس مسئلے کے حل کے دو راستے ہیں۔ خدا کی اطاعت یا خدا سے بغاوت۔

{۱} Karl Jaspers : An Introduction to Philosophy vol. 2, Trans. E.B. Ashton (Chicago 1970).

{۲} Alberg Camus : L' Homme Re' volte. (Paris : Gallimard 1951)

خدا کی اطاعت میں انسانی ذہانت کے تمام پہلو شامل ہیں سوائے ایک پہلو کے اور وہ ہے "کھوکھلی رجائیت"۔ اطاعت انسان کی تقدیر اور منزل کی کہانی ہے اور اس کو امید کے ساتھ وابستہ کردیا گیا ہے کیونکہ ہر تقدیر نامناسب اور ڈرامائی بن جاتی ہے اگر ہم کو سب سے آخر میں جگہ ملے {۳}۔

ناقابل تردید مشکلات کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر تقدیر کو پہچان لیا جائے تو اسے تسلیم کرلیا جائے۔ یہ زندگی کی اس کی اصل حالت میں شناخت اور برداشت کرنے کے شعوری فیصلے کا نام ہے۔ خدا کی اطاعت میں آخر ہر انسان کو مصائب ہی کیوں درپیش ہوتے ہیں۔ اس کا جواب ہے تقدیر کی وجہ سے۔یہ دراصل زندگی کی حقیقتوں کے اعتراف کی صورت ہے۔ اس سلسلے میں اسلام یورپی فلسفے اور نہ سمجھ میں آنے والے مصنوعی تصورات سے انقلابی طور پر جداگانہ راہ اختیار کرتا ہے' اسی طرح "بہترین دنیا کی تلاش" کی سادہ کہانی سے اختلاف کرتا ہے۔ اسلام تو خدا کی تلاش کی توانا روشنی کا نام ہے' مایوسی کا نام نہیں۔

جب انسان اپنی نااہلی اور عدم تحفظ کو پہچان لیتا ہے تو خدا کے آگے جھک جانے کا عمل اسے نئی قوت اور نیا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ خدا پر ایمان اور اس کی رحمت پر ایمان انسان کو احساس تحفظ فراہم کرتا ہے اور یہ جذبہ اور احساس کسی اور چیز سے کبھی بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ خدا کی اطاعت سے کاہلی اور تساہل ہرگز مراد نہیں ہے جیساکہ بہت سے لوگ خیال کرتے ہیں۔ حقیقت میں "تمام بہادر مثالی قومیں قسمت پر یقین رکھتی رہی ہیں"۔ {۴} خدا کی اطاعت بندے کی اطاعت سے فرد کو مبرا کردیتی ہے۔ یہ انسان اور خدا کے درمیان ایک نئے تعلق کا نام ہے اور اسی طرح بندے اور بندے کے درمیان نیا تعلق پیدا ہوجاتا ہے۔

{۳} Gasset Paris Gallimard' 1951

{۴} Emerson

یہ آزادی ہے اور اس کا استعمال انسان اپنے اپنے مقدر کے مطابق کرتا ہے۔ ہماری مشغولیت اور ہماری جدوجہد معقول بنیادوں پر استوار ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں یہ پہلو بھی مضمر ہوتا ہے کہ آخرکار نتیجہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہمارا کام صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم کام کریں، نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔

اس لئے اگر ہم دنیا میں اپنے مقام کو صحیح طور پر سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ خدا کی اطاعت اختیار کرلیں اور اس طرح امن و سلامتی کے حصار میں آجائیں۔ ہماری جدوجہد کا رخ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ہر چیز کو گھیر لیں گے اور ہر چیز پر قابو پالیں گے' بلکہ یہ کوشش ہونا چاہیے کہ ہم اپنی پیدائش' اپنے حالات اور اپنے دور کو سمجھیں اور اس وقت اور اس زمانے کو سمجھیں جس میں ہم خدا کی رضا سے زندگی گزار رہے ہیں۔ زندگی کی نارسائیوں کا ایک ہی بہترین اور صحیح حل ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا کی کامل اطاعت قبول کرلی جائے۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جس میں بغاوت' ناامیدی اور خودکشی نہیں ہے۔ یہ ایک مثالی جذبہ ہے' ایک ہیرو کا نہیں' بلکہ ایک عام فرد کا ہے جس نے اپنا فرض سرانجام دے دیا ہے اور اپنی قسمت کو بھی تسلیم کرلیا ہے۔ اسلام کا نام اس کے قوانین' ممنوعات اور احکامات سے اخذ نہیں کیا گیا ہے نہ ہی جسم و روح کی قوتوں سے یہ اخذ کیا گیا ہے' بلکہ اسلام تو ان تمام امور کا احاطہ کرتا ہے اور ان سب سے بلند ہے۔ ادراک اور روح کی طاقت سے اور خدا کی اطاعت کی سچائی سے یہ ایمان تشکیل پاتا ہے۔

خدا کی اطاعت' اسی چیز کا نام اسلام ہے۔

ادارۂ معارف اسلامی

یہ ادارہ اسلامی علوم و معارف کی ترویج و تحقیق کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ اس کی بنیاد دور حاضر کے عظیم مفکر، قائد تحریک اسلامی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمتہ اللہ علیہ نے جولائی ۱۹۶۳ء میں رکھی تھی اور اس کا پہلا مرکز کراچی میں قائم کیا گیا تھا۔ بعد ازاں فروری ۱۹۷۹ء میں مولانا مرحوم نے لاہور کو اس کا دوسرا مستقر بنایا۔ اب کراچی اور لاہور، ادارۂ معارف اسلامی کے دونوں مرکز داخلی طور پر خود مختارانہ اور مقصدی اور آئینی طور پر ہم آہنگی سے کام کر رہے ہیں۔ جن مقاصد کے لئے یہ دونوں مراکز کوشاں ہیں، وہ یہ ہیں:۔

☆ اسلامی تعلیمات کو پوری تحقیق اور علمی جستجو کے بعد جدید ترین اسلوب اظہار کو اختیار کرتے ہوئے پیش کرنا اور تمدن، تاریخ، قانون، معیشت اور دوسرے دائروں میں جو مسائل درپیش ہیں ان کا حل اسلام کی روشنی میں تلاش کرنا۔

☆ علمائے اسلام کے تحقیقی کارناموں کا ترجمہ، ترتیب نو، تشریح و توضیح اور اشاعت، اسی طرح قدیم خزانوں تک آج کے طالب علموں کی رسائی ممکن بنانا۔

☆ عالم اسلام کے موجودہ مسائل اور مستقبل کے امکانات کے بارے میں صحیح اور حقیقت پسندانہ فہم پیدا کرنے کے لئے مسلم ممالک کے بارے میں بالعموم اور پاکستان کے بارے میں بالخصوص تحقیقی کام کرنا۔

☆ اسلامی موضوعات پر دور حاضر کے مسلم علماء کے نمایاں کارناموں کی وسیع اشاعت اور نفوذ کی خاطر دنیا کی اہم زبانوں، بالخصوص عربی، اردو، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور سواحلی میں تراجم اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

☆ عام پڑھے لکھے لوگوں میں اسلامی تہذیب و تمدن تاریخ اور مسلم دنیا کے موجودہ مسائل کا صحیح فہم پیدا کرنے کے لئے مناسب طرز کی عام فہم کتابوں کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

☆ تعلیم کو مثبت اسلامی آہنگ دینے کے لئے اور اسلامی بنیادوں پر تشکیل شدہ ایک نئے نظام تعلیم کے ارتقاء کی راہ ہموار کرنے کے لئے مختلف مراحل کی نصابی اور امدادی کتب کی تیاری اور اشاعت کا انتظام کرنا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اخبارات کی رائے

علی عزت کی یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں طبعیات، عمرانیات، تاریخ، مذاہب، مغربی افکار، مغربی زندگی اور مغربی غلبہ واستعلا کی اصل حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

(روزنامہ جنگ)

علی عزت کا خصوصی نقطہ نظر یہ ہے کہ مشرقی تہذیب (بدھ مت، کنفیوشس ازم، سوشلزم) اور مغربی تہذیب (عیسائیت، یہودیت، سرمایہ داری) کا نقطہ اتصال وہ اصول ہیں کہ جن کو اگر مختصر ترین نام دیا جائے تو وہ اسلام بن جاتا ہے۔

(روزنامہ مشرق)

اس کتاب میں یہ نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مشن کا علم دوبارہ بلند کرنا ہوگا۔

(فیملی میگزین)

علی عزت بیگووچ مغربی ملکوں کے عوام کے ذہنی جغرافیہ سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنے دلائل کو زیادہ سے زیادہ ٹھوس بنانے کی کوشش کی ہے۔

(فرائی ڈے سپیشل)

یہ کتاب قارئین پر سوچ کی نئی راہیں کھولتی اور انہیں علم وفکر کے نئے آفاق سے روشناس کراتی ہے۔ مروجہ افکار و نظریات کے مباحث کی حامل اس کتاب کا ترجمہ کرنا آسان کام نہ تھا، مگر فاضل مترجم محمد ایوب منیر نے بڑے عمدہ انداز میں اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔ ان کا ترجمہ رواں اور محاوراتی ہے۔

(ترجمان القرآن)